اختلافِ اُمّت
اور
صراطِ مستقیم
حصہ دوئم
محمد یوسف لدھیانوی
کراچی
جامعۃ العلوم الاسلامیہ : علامہ بنوری ٹاؤن کرا

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ

اِختلافِ اُمّت اور صِراطِ مستقیم

حصہ دوم

فروعی مسائل میں مسلکِ اعتدال

[فروعی مسائل میں نوعیتِ اختلاف کی وضاحت اور مسلکِ اعتدال کی نشاندہی، نیز فاتحہ خلف الامام، آمین، رفع یدین، ترجیع اذان، افراد اقامت، تکبیراتِ عیدین، سجدۂ سہو، مسائلِ وتر، نمازِ جنازہ اور جمعہ فی القریٰ وغیرہ چند مسائل میں حنفیہ کے موقف کی مدلل تشریح]

مرتّبہ
محمّد یوسف لدھیانوی

ماہنامہ بیّنات ۔ علامہ بنوری ٹاؤن ۔ کراچی ۵

طابع : حاجی محمد زکی ——— ناشر : محمد ادریس مدیر مسئول ناظم : فضل حق
مطبع : ایجوکیشنل پریس کراچی ——— مقام اشاعت جامعۃ العلوم الاسلامیہ : علامہ بنوری ٹاؤن کراچی
——— ٹیلیفون ۴۱۳۵۷۰ ———

فہرست

سوالنامہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ، امّا بعد،

قریباً ایک سال پہلے میرے ایک محترم بزرگ نے جناب سید زاہد علی صاحب مقیم ابوظہبی کا ایک سوالنامہ، جو چند فقہی مسائل سے متعلق تھا، عنایت کرتے ہوئے جواب کا تقاضا فرمایا۔ سوالات پر ایک نظر ڈال کر میں نے جواب سے معذرت کر دی۔ کیونکہ ائمہ مجتہدین کے درمیان مختلف فیہ مسائل پر لکھنے کے لئے اس ناکارہ کی طبیعت چند وجوہ سے آمادہ نہیں ہوتی:

۱۔ یہ تو ظاہر ہے کہ طالب علموں کو اس شکستہ تحریر کی ضرورت نہیں ہوگی۔ ان کے سامنے علم کے دفاتر موجود ہیں۔ جہاں تک عوام کا سوال ہے۔ ان کو دلائل کی نہیں، بلکہ عمل کرنے کیلئے مسائل کی ضرورت ہوتی ہے، انہیں تو صاف اور منقح شکل میں مسئلہ سمجھا دینا چاہیئے۔ دلائل کی قیل وقال ان کے لئے اکثر و بیشتر ناقابل فہم اور موجب تشویش ہوتی ہے۔ اور اس سے ان کی عملی قوت کمزور ہو جاتی ہے۔

۲۔ فقہائے کے اختلافی مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے آدمی کا اعتدال پر قائم رہنا بہت مشکل ہے۔ اندیشہ رہتا ہے کہ خدانخواستہ افراط و تفریط نہ ہو جائے اور کوئی بات خدا اور رسول کی رضا کے خلاف زبان و قلم سے نہ نکل جائے۔ جو دنیا و آخرت کے خسران کا سبب ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

ماضل قوم بعد ھدی کانوا علیہ الّا اوتوا الجدل (ابن ماجہ)

نہیں گمراہ ہوتی کوئی قوم ہدایت کے بعد، مگر ان کو جھگڑے میں ڈال دیا جاتا ہے۔

۳۔ پھر یہ مسائل صدر اول سے مختلف فیہ چلے آتے ہیں۔ اور ان پر دور اول سے آج تک اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ مزید کچھ لکھنا محض اضاعت وقت معلوم ہوتا ہے۔

۴۔ پھر اس سے بھی شرم آتی ہے کہ آدمی ایک ایسے پُرفتن دور میں، جب کہ اسلام کے قطعی و بنیادی مسائل میں تشکیک کا سلسلہ جاری ہے اور قلوب سے ایمان ہی رخصت ہوتا جا رہا ہے،

ان فروعی مسائل کو نزاع و جدال اور بحث و گفتگو کا موضوع بنا کر ان پر خامہ فرسائی کرنے بیٹھ جائے، اور موجودہ دور کے اہم فتنوں سے صرفِ نظر کر لے۔

۵ — پھر یہ فروعی مسائل انہی بارہ تیرہ مسئلوں تک محدود نہیں۔ بلکہ اس نوعیت کے ہزاروں مسائل ہیں۔ اب اگر ان فروعی مسائل پر بحث و تمحیص اور سوال و جواب کا دروازہ کھول دیا جائے تو اس غیر ضروری اور غیر مختتم سلسلہ کے لیئے عمرِ نوح بھی کافی نہ ہوگی۔ دوسرے تمام ضروری مشاغل معطل ہو کر رہ جائیں گے۔

ان تمام معذرتوں کے باوجود میرے محترم بزرگ کا تقاضا جاری رہا۔ اور انہوں نے فرمایا کہ مرسلہ نگار کو بہت اصرار ہے کہ ان کے سوالوں کا جواب ضرور لکھ دیا جائے ——— چنانچہ اسی اصرار و انکار میں مہینے گذر گئے۔ اور سوالات کا مسودہ بھی میرے کاغذات میں گم ہو گیا۔ لیکن ان کا اصرار پھر بھی جاری رہا۔ اور سوالنامہ کی فوٹو اسٹیٹ کاپی مجھے دوبارہ مہیا کی گئی۔ اس لئے حق تعالیٰ شانہٗ سے استخارہ کرنے کے بعد اسی سے مدد طلب کرتے ہوئے، بعجلتِ تمام جو کچھ سمجھ میں آیا قلم برداشتہ لکھ دیا۔ اکثر حصوں کو کتابت سے پہلے دوبارہ دیکھنے کی بھی نوبت نہیں آئی، حق تعالیٰ شانہٗ اس کو قبول فرما کر اپنی رضا کا وسیلہ بنائیں۔ اور اس میں میرے نفس کی جو آمیزش ہو گئی ہو اس کو معاف فرمائیں۔

استغفر اللہ الذی لا الٰہ الا ھو الحی القیوم و اتوب الیہ۔ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔ ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم، وتب علینا انک انت التواب الرحیم۔

محمد یوسف لدھیانوی
علامہ بنوری ٹاؤن، کراچی
۱۶/۶/۱۴۰۲ھ

سوالنامہ

(۱) متفق علیہ کی احادیث اگر دیگر کتب میں موجود کسی حدیث سے متصادم ہوں تو کسے اختیار کرنا چاہیئے۔

(۲) قرآن کریم کی کوئی آیت اگر قوی حدیث نبویؐ سے متصادم ہو تو کسے اختیار کرنا چاہئیے۔
(مثلاً قرآن مجید کی ایک آیت کا مفہوم یہ ہے "جب قرآن پڑھا جائے تو خاموشی سے سنو" اور حدیث مبارک کا مفہوم یہ ہے کہ جب سورۃ فاتحہ امام پڑھے تو تم بھی آہستہ پڑھ لو۔ یہ پڑھنا امام کی آیت پر سکتہ کی حالت میں یا کہ امام کے سورۃ فاتحہ تلاوت کرنے کے بعد یا ساتھ ساتھ یا نہ پڑھے۔ یا حدیث کے مطابق جس کا مفہوم ہے "جو فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں ہوتی"۔ اگر امام کا ہی فاتحہ تلاوت کرنا کافی ہے پھر دیگر ارکان کے لئے مقتدی کا اعادہ کیوں ضروری ہے جیسے ثنا، تسبیحات، تشہد درود وغیرہ۔

(۳) متفق علیہ کی حدیث میں اذان کے کلمات جفت اور اقامت طاق پڑھنے کا ذکر موجود ہے یا یہ کہ اگر اذان ترجیع سے دی جائے تو اقامت جفت کہی جائے تو سوال یہ ہے کہ اذان و اقامت دونوں جفت کہی جاتی ہیں کس دلیل سے؟ بحوالہ کتب احادیث وضاحت فرمائیں۔ ساتھ ہی صحت کے اعتبار سے کون سی اذان و اقامت بہتر ہے؟

(۴) تحقیق طلب یہ سوال ہے کہ مرد عورت کی نماز کی ہیئت (ظاہری شکل) مختلف کیوں ہے۔ مثلاً مرد کا کانوں تک تکبیر کے لئے ہاتھ اٹھانا اور عورت کا کاندھے تک۔ مرد کا زیر ناف دونوں ہاتھ باندھنا اور عورت کا سینے پر، مرد کا سجدہ کی حالت میں دونوں کہنیوں کا زمین سے کچھ اوپر اٹھائے رکھنا اور عورت کا زمین پر بچھا دینا جب کہ

صحیح بخاری کی حدیث کے مطابق زمین پہ کہنیوں کو بچھانے پر کتے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جلسہ استراحت میں مردوں کو دائیں پاؤں کے انگوٹھے کے بل اور بائیں پاؤں کے کروٹ پر پھیلا کر بیٹھنا اور عورت کو دونوں پاؤں پھیلا کر بیٹھنا۔ یہ تفریق طریقۂ نماز میں کس نے واضح کی۔ کیا حیات طیبۂ نبویؐ میں عورت اور مرد کی نماز میں یہ تفریق تھی؟ اگر تھی تو احادیث مبارکہ اور آثار اصحاب سے دلیل دیں۔

(۵) نماز کے اندر امام کے پیچھے الفاتحہ پڑھنے سے اور آمین کا امام و مقتدی کو جہری نماز میں جہر سے کہنے سے کس نے منع کیا۔ جب کہ واضح احادیث و آثار اصحاب سے ہے۔ اگر منسوخ ہو چکا ہے تو قول اور صحت والی احادیث اور آثار اصحاب سے دلیل دیں۔

(۶) رفع الیدین صحاح ستّہ سے کثرت سے اصحاب رسولؐ روایت کرتے ہیں جن کی تعداد تقریباً دس سے زائد ہے۔ بعض پچاس سے بھی زائد کہتے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ احناف اس سنّت کو ترک کر رہے ہیں۔ اور اپنانے سے ہچکچاتے ہی نہیں نماز کو فاسد بھی قرار دیتے ہیں۔ اگر یہ حکم بھی منسوخ ہے تو مدّلل ثبوت کم از کم تین اصحابؓ رسولؐ سے (جو راوی کے اعتبار سے معتبر سمجھے جاتے ہوں) واضح فرمائیں۔

(۷) سجدۂ سہو جو عام رائج ہے۔ داھنی جانب ایک سلام پھیر کر دو سجدے کرنے کا۔ یہ کس دلیل پر بنیاد ہے؟ جب کہ متفق علیہ کی احادیث سے صاف اور واضح ثبوت ملتا ہے کہ آنحضرتؐ نے نماز میں سہو ہونے پر اس وقت سجدۂ سہو کیا جب نماز اپنے آخری مرحلہ سے گزر رہی تھی یعنی قریب سلام پھیرنے کے تھے جب آپ نے دو سجدے کئے۔ اب تحقیق طلب امر یہ ہے کہ ایک سلام پھیرنے (تشہد کے بعد) اور پھر دوبارہ تشہد درود پڑھنے کا کیا ثبوت ہے۔

(۸) وتر کی نماز میں دو رکعات پر تشہد پڑھنے کے لئے بیٹھنا اور آخری یعنی تیسری رکعت میں فاتحہ اور سورۃ کی تلاوت کے بعد اللہ اکبر کہہ کر دونوں ہاتھ کانوں تک اٹھانا اور پھر نیت

باندھ کر قنوت پڑھنا کس دلیل سے ثابت ہے واضح فرمائیں۔ جب حضرت عائشہ صدیقہؓ سے ثابت ہے کہ حضورؐ نے تین، پانچ یا سات رکعات وتر پڑھے تو تشہد کے لئے دو رکعات پر نہ بیٹھتے بلکہ آخری رکعت ہی پر صرف بیٹھتے تھے۔ ان ہی سے ایک رکعت وتر بھی ثابت ہے۔ اسی ضمن میں وضاحت مطلوب ہے کہ قنوت دونوں ہاتھ دعا کیطرح اٹھا کر پڑھیں یا ہاتھ باندھ کر پڑھیں۔ احادیث نبویؐ سے کوئی ثبوت دیکر آگاہ فرمائیں۔

(۹) نماز جنازہ میں سورۃ فاتحہ حدیث نبویؐ سے ثابت ہے یا کہ نہیں۔ اگر نہیں تو دلیل تحریر فرمائیں جب کہ حدیث مبارک کا مفہوم ہے کہ سورۃ فاتحہ کے بغیر کوئی نماز نہیں۔

(۱۰) عیدین کی نماز میں چھ تکبیر زائد ہیں یا بارہ اگر دونوں ثابت ہیں تو راویوں کی کثرت کس طرف استدلال کرتی ہے اور یہ تکبیریں اوّل رکعت میں فاتحہ اور سورۃ پڑھنے سے قبل ہیں یا بعد میں۔ اسی طرح دوسری رکعت میں سورۃ پڑھنے کے بعد ہیں یا قبل ؟

(۱۱) نماز کے لئے اقامت ہو چکی ہو تو قریب کوئی نماز نہیں ہوتی ہے پھر کیوں لوگ فجر کی سنت اس وقت پڑھنے لگتے ہیں جب کہ فرض نماز شروع ہو رہی ہے۔ حدیث نبویؐ کی رو سے نماز نہیں ہوئی ؟ رہا یہ کہ جب کہ مسجد کے کسی گوشے میں پڑھ لیا۔ تو کیا امام کی قرأت کی آواز کانوں سے نہیں ٹکراتی ہے ؟

(۱۲) احناف کے نزدیک نماز کے دوران سورۃ فاتحہ اور دوسری سورۃ کے درمیان اتنا وقفہ ہو جائے کہ تین مرتبہ سبحان اللہ کہا جا سکے تو سجدہ سہو لازم آجاتا ہے۔ اس کی کیا دلیل ہے ؟

(۱۳) مرد کے لئے ستر عورت ناف سے گھٹنے تک بتلایا جاتا ہے اس کے لئے کن احادیث سے استدلال کیا گیا ہے جب کہ بخاری میں حضرت انسؓ نے روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلعم نے (جنگ خیبر میں) اپنی ران کھولی۔ زید بن ثابت نے کہا

اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر پر (قرآن) اتارا اور آپ کی ران میری ران پر تھی۔ وہ اتنی بھاری ہوگئی۔ میں ڈرا کہیں میری ران ٹوٹ جاتی ہے۔ امام بخاریؒ نے استدلال کیا اگر ران عورت ہوتی تو آپؐ زیدؓ کی ران پر اپنی ران نہ رکھتے۔ بخاری شریف میں انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے خیبر پر جہاد کیا۔ ہم لوگوں نے صبح کی نماز اندھیرے منہ خیبر کے قریب پہنچ کر پڑھی پھر آنحضرتؐ سوار ہوئے۔ اور میں ابو طلحہؓ کے پیچھے ایک ہی سواری پر بیٹھا تھا۔ آنحضرتؐ نے خیبر کی گلیوں میں اپنا جانور دوڑایا اور (دوڑنے میں) میرا گھٹنہ آنحضرتؐ کی ران سے چھو جاتا آپؐ نے اپنی ران سے تہبند ہٹا دی (ران کھول دی) یہاں تک کہ آپ کی ران کی سفیدی (اور چمک) دیکھنے لگا۔ والسلام

احقر سید زاہد علی۔ حال مقیم ابوظہبی ۲۰ـ۸۱ء

الجواب

سوالنامے کے ایک ایک نکتہ پر غور کرنے سے پہلے بطور تمہید چند امور عرض کر دینا مناسب ہے۔

۱۔ اجتہادی فروعی مسائل میں اختلاف سنّت و بدعت کا اختلاف نہیں :-

سوالنامے میں جو مسائل ذکر کئے گئے ہیں۔ وہ اعتقادی و نظریاتی نہیں۔ بلکہ فروعی و اجتہادی ہیں، فروعی مسائل میں اختلاف مذموم نہیں۔ بلکہ اس نوعیت کا اختلاف حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے درمیان بھی رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سب کے سب حق و ہدایت پر تھے اور قرآن کریم نے نہ صرف ان کو، بلکہ ان کی پیروی کرنے والوں کو بھی رضا و مغفرت کا ابدی پروانہ عطا فرمایا ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

والسابقون الاوّلون من ... اور جو لوگ قدیم ہیں سب سے پہلے ہجرت

المهاجرين والانصار والذين اتبعوهم باحسان رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ واعد لہم جنٰت تجری تحتہا الانہٰر خالدین فیہا ابدا ذالک الفوز العظیم۔	کرنے والے اور مدد کرنے والے اور جو لوگ ان کے پیرو ہوئے نیکی کے ساتھ، اللہ راضی ہوا اُن سے اور وہ راضی ہوئے اُس سے اور تیار کر رکھے ہیں واسطے اُن کے باغ کہ بہتی ہیں نیچے اُن کے نہریں رہا کریں اُنہی میں ہمیشہ، یہی ہے بڑی کامیابی۔
(توبہ۔ آیت ۱۰۰)	(ترجمہ حضرت شیخ الہند)

پس جو امور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے درمیان متفق علیہ تھے وہ بعد کی امت کے حق میں حجت قطعیہ ہیں۔ اور کسی کو ان کے خلاف کرنا جائز نہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین له الهدیٰ ویتبع غیر سبیل المؤمنین نولّه ما تولّٰی و نصله جهنم وساءت مصیراً	اور جو شخص رسول المقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرے گا بعد اس کے اس کو امر حق ظاہر ہو چکا تھا اور مسلمانوں کا (دینی) راستہ چھوڑ کر دوسرے رستہ ہو لیا تو ہم اس کو (دنیا میں) جو کچھ وہ کرتا ہے کرنے دیں گے اور (آخرت میں) اس کو جہنم میں داخل کریں گے اور بری جگہ ہے جانے کی۔
(النساء: ۱۱۵)	(ترجمہ حضرت تھانویؒ)

اس آیت کریمہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کے ساتھ ساتھ "سبیل المؤمنین" سے انحراف پر وعید فرمائی گئی ہے جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اطاعتِ رسولؐ اور اتباعِ "سبیل المؤمنین" دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی علامت صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے راستے کا اختیار کرنا ہے اور صحابہ کرامؓ کے راستہ سے انحراف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت ہے، پس جو شخص صحابہ کرامؓ کے اجماعی اور متفق علیہ مسائل سے انحراف کرے گا وہ شقاق رسول صلی اللہ علیہ وسلم

کا مرتکب اور "نولہٖ ما تولّٰی و نصلہٖ جہنّم" کی سزا کا مستوجب ہوگا۔

اور جن مسائل میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اختلاف ہو اس میں علماؑ کے دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ ہر فریق عند اللہ مصیب ہے۔ دوم یہ کہ ایک فریق مصیب ہے۔ اور دوسرا خطاء پر۔ تاہم اس پر اہل علم کا اتفاق ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے درمیان ہدایت و ضلالت یا سُنّت و بدعت کا اختلاف نہیں تھا۔ بلکہ ان کا اختلاف حق و ہدایت ہی کے دائرے میں ہے اور ان میں سے ہر فریق اپنے اپنے فہم و اجتہاد کے مطابق حق تعالیٰ شانہٗ کی رضا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں کوشاں تھا جو مسائل ان اکابر کے درمیان مختلف فیہ رہے ان میں بعد کے مجتہدین کو یہ غور کرنے کا تو حق ہے کہ ان میں سے کس کا قول راجح ہے اور کس کا مرجوح، لیکن یہ حق کسی کو نہیں کہ ان میں سے کسی کو بدعت و ضلالت کی طرف منسوب کرے۔ اسی طرح ان کے اقوال سے خروج کا بھی کسی کو حق نہیں کہ ان کے تمام اقوال کو چھوڑ کر کوئی نیا قول ایجاد کر لیا جائے۔

حافظ سیوطیؒ نے الجامع الصغیر (ص ۲۹ ج ۲) میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت سے یہ حدیث نقل کی ہے:

سألت ربّي فيما تختلف فيه	اپنے بعد اپنے اصحاب کے اختلاف کے
اصحابي من بعدي. فاوحيٰ	بارے میں میں نے اپنے رب سے سوال
اليّ يا محمد! انّ اصحابك	کیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے میری طرف
عندي بمنزلة النجوم	وحی فرمائی کہ اے محمد! بے شک
في السماء بعضها	آپؐ کے اصحاب میرے نزدیک
اضوأ من بعض	بمنزلہ آسمان کے ستاروں کے
فمن اخذ بشئ مما هم	ہیں، ان میں سے بعض، بعض سے
عليه من اختلافهم فهو	زیادہ روشن ہیں، پس جس شخص نے
عندي على هدى (السجزي في	ان کے اختلاف کی صورت میں ان
الابانة، وابن عساكر ورقم له	میں کسی کے طریقہ کو اختیار کر لیا۔ وہ

السیوطی بالضعف)　　　　　　میرے نزدیک ہدایت یہ ہے۔

یہ حدیث سند کے لحاظ سے کمزور ہے۔ مگر اس کا مضمون متعدد احادیث کے علاوہ قرآن کریم کی مذکورہ بالا آیت سے بھی مؤید ہے اسی بنا پر تمام اہل حق اس پر متفق ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت میں کوئی فرد ــــ نعوذ باللہ ــــ گمراہ یا بدعتی نہیں تھا۔ بلکہ مختلف فیہ مسائل میں وہ سب اپنی اپنی جگہ حق پر تھے۔ اور اپنے اپنے اجتہاد کے مطابق ماجور تھے۔

۲ - بیشتر اجتہادی وفروعی اختلاف صحابہؓ وتابعینؒ کے زمانے سے چلا آتا ہے

سوالنامے میں جن مسائل کے بارے میں دریافت کیا گیا ہے وہ (اور اس قسم کے اور بہت سے مسائل) صدر اول سے اسی طرح مختلف فیہ چلے آتے ہیں۔ جیسا کہ ہر مسئلہ کے ذیل میں معلوم ہوگا، جو مسئلہ صدر اول سے مختلف فیہ چلا آرہا ہو اس میں اختلاف کا مٹا دینا کسی کے لئے ممکن نہیں مگر چونکہ ایسے مسائل میں سنت و بدعت یا حق و باطل کا اختلاف نہیں اس لئے جو موقف کسی کے نزدیک راجح ہو اس کو اختیار کر سکتا ہے۔ اور قرآن کریم، سنت نبوی (علی صاحبہا الصلوات والتسلیمات) اور صحابہؓ وتابعینؒ کے تعامل کی روشنی میں اپنے موقف کی ترجیح کے دلائل بھی پیش کر سکتا ہے لیکن کسی ایک فریق کا اپنے موقف کو قطعی حق سمجھنا اور فریق مخالف کے موقف کو قطعی باطل اور بدعت و ضلالت کہنا درست نہیں۔ کیونکہ اس سے ان تمام اکابر امت صحابہؓ وتابعینؒ کی تضلیل لازم آتی ہے جنہوں نے یہ موقف اختیار کیا۔ ظاہر ہے کہ اسے عقلاً و شرعاً درست نہیں کہا جا سکتا۔

فروعی مسائل میں کم از کم اتنی کشادہ ذہنی اور فراخ قلبی تو ہونی چاہیئے کہ ہم اپنے موقف کو صواب سمجھتے ہوئے فریق مخالف کے قول کو خطأ اجتہادی سمجھ کر اسے معذور و ماجور تصور کریں، مثلاً اگر ایک شخص کا خیال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی "لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب" امام، مقتدی اور منفرد سب کو عام ہے۔ تو اسے اپنے اس موقف کو درست سمجھتے ہوئے اپنی حد تک سختی سے اس پر عمل کرنا چاہیئے۔ اور جو اکابر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی:

"من صلّی خلف الامام فقراءۃ الامام لہٗ قراءۃ"

جس نے امام کے پیچھے نماز پڑھی تو امام کی قراءت اس کے لئے قراءت ہے۔

کے پیش نظر، اول الذکر حدیث کو مقتدی سے متعلق نہیں سمجھتے۔ بلکہ ارشادِ ربانی:

"واذا قرئ القراٰن فاستمعوا لہٗ وانصتوا لعلکم ترحمون"

اور جب قرآن پڑھا جائے تو اس کی طرف کان لگاؤ اور خاموش رہو۔ تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

اور ارشادِ نبوی ؐ:

"واذا قرأ فانصتوا"

اور جب امام قراءت کرے تو تم خاموش رہو۔

کے مطابق مقتدی کے لئے قراءۃ کو ممنوع کہتے ہیں، آپ ان سے اتفاق کرنے کے لئے تیار نہیں تو نہ کیجئے۔ لیکن ان کو حدیث کے مخالف و تارک تو نہ کہیئے۔ ورنہ اس سے جنگ و جدال کا منحوس دروازہ کھلے گا۔

اگر آپ سمجھتے ہیں کہ حدیث: "لا صلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب" کے مطابق فاتحہ مقتدی کے ذمہ بھی فرض ہے۔ اور اس کے بغیر ——— اس کی نماز نہیں ہوتی تو بلاشبہ آپ کو اسی کے مطابق عمل کرنا چاہیئے۔ لیکن آپ کا یہ اجتہاد دوسروں پر حجت نہیں ہو سکتا۔ اور نہ آپ کو یہ حق حاصل ہے کہ محض اپنے اجتہاد کی بناء پر صحابہؓ و تابعینؒ اور ائمہ ہدیٰؒ کی نمازوں کے باطل ہونے کا فتویٰ صادر فرمائیں۔ کیونکہ صدرِ اول میں کوئی شخص بھی اس کا قائل نہیں تھا کہ فاتحہ خلف الامام کے بغیر نماز باطل ہے۔ اس کی بحث تو انشاء اللہ سوال دوم کے ذیل میں آئے گی لیکن اس تمہیدی بحث میں امام اہل سنت امام احمد بن حنبلؒ کا حوالہ ذکر کر دینا مناسب ہو گا۔

موفق ابن قدامہ الحنبلی "المغنی" میں لکھتے ہیں:

قال احمدؒ ما سمعنا احداً من اھل الاسلام یقول ان

امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ ہم نے اہل اسلام میں سے کسی کا یہ قول نہیں سنا کہ جب

الامام اذا جهر بالقراءة لا تجزئ صلوٰة من خلفه اذا لم يقرأ۔ وقال هذا النبي صلى الله عليه وسلم واصحابه والتابعون۔ وهذا مالك في اهل الحجاز وهذا الثوري في اهل العراق وهذا الاوزاعي في اهل الشام وهذا الليث في اهل مصر ما قالوا لرجل صلّى وقرأ امامه ولم يقرأ هو صلاته باطلة الخ (ص ۵۶۳ ج ۱)

امام قراءت کرے تو مقتدی کی نماز صحیح نہیں ہوگی جب تک کہ وہ خود قراءت نہ کرے امام احمدؒ نے فرمایا یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ وتابعینؒ ہیں۔ اور یہ اہل حجاز میں امام مالکؒ ہیں۔ یہ اہل عراق میں امام ثوریؒ ہیں، یہ اہل شام میں امام اوزاعیؒ ہیں، یہ اہل مصر میں امام لیثؒ ہیں۔ ان میں سے کسی نے یہ فتویٰ نہیں دیا کہ جب امام قراءت کرے اور مقتدی قراءت نہ کرے تو مقتدی کی نماز باطل ہے۔

امام احمدؒ کے اس ارشاد سے واضح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لیکر امام مالکؒ، امام سفیان ثوریؒ، امام اوزاعیؒ اور امام لیث بن سعدؒ تک کوئی شخص بھی یہ فتویٰ نہیں دیتا تھا کہ اگر مقتدی امام کے پیچھے فاتحہ نہ پڑھے تو اس کی نماز باطل ہے۔

بلاشبہ سرّی نمازوں میں یا جہری نمازوں کے سکتات میں بعض سلف قراءت فاتحہ کے جواز بلکہ استحباب کے بھی قائل رہے ہیں۔ لیکن یہ دعویٰ کرنا کہ ان تمام لوگوں کی نماز ہی سرے سے باطل ہے جو امام کے پیچھے فاتحہ نہیں پڑھتے کیسا خطرناک دعویٰ ہے۔ جس کی تکذیب امام احمدؒ کو کرنا پڑی۔ جو حضرات احناف پر چوٹ کرنے کے لیے "لاصلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب" پڑھ پڑھ کر صدرِ اوّل کے اکابر کی نمازوں کو باطل کہتے ہیں، میں تسلیم کرتا ہوں کہ وہ اپنے خیال میں بڑے اخلاص سے عمل بالحدیث فرماتے ہیں، میں اُن کے اخلاص کی قدر کرتا ہوں لیکن میں بصد منت و لجاجت انھیں اس غلو کے ترک کرنے کا مشورہ دوں گا اور یہ عرض کروں گا کہ اگر آپ کے خیال میں ان اکابر کی نمازیں باطل

ہیں تو ان کا زیادہ غم نہ کیجئے۔ کیونکہ ان کی تحقیق کے مطابق ان کی نمازیں صحیح ہیں۔ آپ ان کے بجائے اپنی توجہ ان لوگوں کی طرف مبذول فرمائیے جو سرے سے نماز کے قائل ہی نہیں۔ یا جنہیں سالہا سال سے بھی مسجد کا رخ کرنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ نمازیوں کی نماز کو باطل کہنے کے بجائے بے نمازیوں کو نماز پر لانے کی محنت کیجئے۔ یہ دین کی صحیح خدمت ہوگی۔

۳۔ اجتہادی و فروعی مسائل میں غلو اور تشدد روا نہیں:

اسی کے ساتھ یہ امر پیش نظر رکھنا بھی ضروری ہے کہ یہ دور بنیادی طور پر بدعت و ضلالت، الحاد و کجروی اور دین سے بے قیدی و آزادی کا ہے۔ اس زمانے میں ایسے ضروریاتِ دین اور قطعیاتِ اسلام، جن میں کبھی دو رائیں نہیں ہوئیں، انہیں بھی مشکوک ٹھہرانے کی کوششیں ہورہی ہیں صحابہؓ و تابعینؒ اور سلف صالحینؒ نے قرآن و سنت سے جو کچھ سمجھا اسے بھی زور اجتہاد سے حرف غلط ثابت کرنے کی حماقتیں ہورہی ہیں۔ اور دورِ جدید کی تمام بدعتوں اور ضلالتوں کو عین دین و ایمان باور کرایا جارہا ہے۔ ایسے لادینی ماحول میں دیندار طبقہ کی فروعی و اجتہادی مسائل میں ہنگامہ آرائی اہل دین کی سبکی و رسوائی اور لادین طبقہ کی حوصلہ افزائی کی موجب ہے۔ علمی انداز میں ان مسائل پر گفتگو پہلے بھی ہوتی آئی ہے اور آج بھی اس کا مضائقہ نہیں، لیکن ان فروعی و اجتہادی مسائل میں جو صدراول سے مختلف فیہ چلے آتے ہیں۔ اور جن میں دونوں طرف صحابہؓ و تابعینؒ اور سلف صالحین کا ایک جم غفیر ہے۔ اختلاف کو اس قدر بڑھا دینا کہ نوبت جنگ و جدال اور نفاق و شقاق تک پہنچ جائے کسی طرح بھی زیبا نہیں۔

۴۔ بہت سے مسائل میں محض افضل و غیر افضل کا اختلاف ہے:

سوالنامے میں جن مسائل کے بارے میں استفسار کیا گیا ان میں بیشتر کا تعلق جواز یا عدم جواز سے نہیں۔ بلکہ افضل و غیر افضل سے ہے مثلاً اذان میں ترجیع ہونی چاہیے یا نہیں؟ اقامت دو دو کلمات کے ساتھ کہی جائے یا ایک۔ ایک کلمہ کے ساتھ؟ رکوع کو جاتے اور رکوع سے اٹھتے وقت

رفع یدین کیا جائے یا نہیں ؟ آمین اونچی کہی جائے یا آہستہ ؟ سجدۂ سہو سلام سے پہلے ہو یا بعد میں ؟ عیدین میں تکبیریں بارہ کہی جائیں یا چھ ؟ قنوتِ وتر رکوع سے پہلے ہو یا بعد میں ؟ اس کے لئے تکبیر کہی جائے یا نہیں ؟ اور رفع یدین بھی کیا جائے یا نہیں ؟ قنوت ہاتھ باندھ کر پڑھی جائے یا چھوڑ کر ؟ وغیرہ ـــــ جیسا کہ آگے معلوم ہوگا۔ ان مسائل میں باتفاقِ امت دونوں صورتیں جائز ہیں اختلاف صرف اس میں ہے کہ بہتر اور مستحب کون سی صورت ہے ؟ اور مستحب کی تعریف ہی یہ ہے کہ "لایلام تارکہ" (اس کے تارک پر ملامت نہیں ہوتی) لیکن ہماری بدقسمتی کی حد ہے کہ ان مستحبات میں بھی نزاع و اختلاف اس حد تک پہنچا دیا گیا ہے کہ گویا یہ کفر و اسلام کا مسئلہ ہے، چنانچہ راقم الحروف کو حال ہی میں ایک اشتہار موصول ہوا ہے، جس کا عنوان ہے :

{ رفع الیدین ـــــ { بیس ہزار روپیہ انعام
مناظرے ختم تمام }

اس میں رفع الیدین کے مسئلہ پر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث مظاہرِ حق کے ترجمہ کے ساتھ دے کر لکھا گیا ہے :

"ہمارا سوال اطلاع عام ہے، جو عالم رفع یدین کا کرنا ترک یا منسوخ ثابت کرے اس کو ہائی کورٹ کے شریعت بنچ پر نقد بیس ہزار روپیہ انعام ہے۔ یہ تبلیغ پوری دنیا کے عالموں کو ہے۔ انعام دینے والے کا پتہ ہے ـــــ اسلامی تحقیقی ادارہ کشمیری بازار راولپنڈی۔ منجانب بہادر بیگ وافتخار ولد ذکاء الدین زرنگاری بازار راولپنڈی" ـــــ

اس کے بعد ایک غلط بات (کہ رفع یدین اس وقت کرنے کا حکم دیا گیا تھا جب کہ لوگ نئے نئے مسلمان ہوئے تھے وہ اپنی بغلوں میں بت لایا کرتے تھے) نقل کر کے اس کی تردید کی گئی ہے، اور مولانا عبدالحی لکھنوی کے حوالے سے ایک موضوع روایت "حتّٰی لقی اللہ" نقل کر کے کہا گیا ہے کہ رفع الیدین منسوخ نہیں، بلکہ متواتر ہے۔ اور پھر درمختار کے حوالے سے متواتر کی تعریف کر کے آگے لکھا ہے :

"اب ایک بزرگ حنفی بریلوی کی بات بھی سنیئے! فرماتے ہیں :

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت آخری شریعت ہے۔ جو شخص شریعت اسلامیہ کے کسی حکم کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد منسوخ ہو جانا مانے وہ قطعاً مرتد اور کافر ہے (حوالہ منہاج بلٹ اہل سنت کتاب صفحہ ۱۲۲) نوٹ: حنفی بھائیو مولویو بہادر بیگ کی تحقیق نہ مانو لیکن اپنے بڑوں کی تحقیق تو مان جاؤ۔ توبہ کر کے سب کے سب رفع یدین کرو اور کراؤ۔ یا رفع یدین کو منسوخ ثابت کر کے مجھے توبہ کراؤ نا لے بیس ہزار روپیہ اس شکریے میں مجھ سے انعام بھی اٹھاؤ۔

نوٹ: ہم اہل حدیث پہلے وقت کے حنفیوں کی اور موجودہ وقت کے حنفیوں کی آپس میں رفع یدین کے بارے میں صلح کرانا چاہتے ہیں اور ان کو ان کے فتویٰ سے بچانا چاہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بلاتا ہے طرف اسلام کے (یونس) اسلام پیغمبر کی ہر صحیح حدیث کے فیصلے کا نام ہے"۔

رفع الیدین کا مسئلہ انشاء اللہ سوال ششم کے ذیل میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے، اور وہاں بحوالہ عرض کروں گا کہ رفع یدین اور ترک رفع یدین باجماع امت دونوں جائز ہیں۔ اختلاف صرف افضلیت واستحباب میں ہے۔ بعض حضرات کے نزدیک رفع یدین افضل ومستحب ہے۔ اور بعض کے نزدیک ترک رفع یدین۔

یہاں صرف اس غلو کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ ایک ایسا امر جس کے استحباب وعدم استحباب میں صحابہ وتابعین اور ائمہ ہدیٰ (رضی اللہ عنہم) کا اختلاف ہے۔ ہمارے بہادر بیگ صاحب اسے کفر واسلام کا مدار بنا رہے ہیں۔ اس کے لئے اشتہار بازی کی جا رہی ہے بیس بیس ہزار کی انعامی شرطیں بندھ رہی ہیں۔ جانبین میں سے کسی ایک فریق سے توبہ نصوح کرانے کا چیلنج دیا جا رہا ہے۔

ع بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبیست۔

بلاشبہ ہمارے بہادر بھائی اپنے خیال میں حدیث نبوی کی محبت میں یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔ مگر وہ نہیں جانتے کہ ایک مستحب فعل میں (جس کے مستحب ہونے نہ ہونے میں بھی آئمہ ہدیٰ کا اختلاف ہو) ایسا تشدد "تحریف فی الدین" ہے۔ مسند الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلوی حجۃ اللہ البالغہ

بلہ نقل مطابق اصل۔

باب احکام الدین من التحریف" میں تحریف کے اسباب ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ومنها التشدد، وحقيقته اختيار	اسباب تحریف میں سے ایک تشدد ہے۔
عبادات شاقة لم يأمر	اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ ایسی عبادات
بها الشارع، كدوام الصيام	شاقہ کو اختیار کیا جائے جن کا شارع
والقيام والتبتل وترك التزوج	علیہ السلام نے حکم نہ فرمایا ہو جیسے ہمیشہ
وان يلتزم السنن	روزے رکھنا، قیام کرنا، مجرد رہنا اور
والآداب كالتزام الواجبات	شادی نہ کرنا۔
(ص۱۲۰ ج۱)	اور یہ کہ سنن و مستحبات کا واجبات
	کی طرح التزام کیا جائے۔

جو حضرات رکوع کو جاتے وقت اور رکوع سے اٹھتے وقت رفع یدین کے قائل ہیں ان کے نزدیک بھی یہ فرض و واجب نہیں صرف مستحب ہے۔ حضرت شاہ اسماعیل شہید (نور اللہ مرقدہٗ) ایک زمانے میں رفع یدین کے قائل تھے[1]۔ اور "تنویر العینین" کے نام سے اس مسئلہ پر ایک رسالہ بھی رقم فرمایا تھا۔ اس میں فرماتے ہیں:

---

[1] لیکن شاہ شہیدؒ نے بعد میں اس رائے سے رجوع فرمالیا تھا، چنانچہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد سرفراز صفدر "طائفہ منصورہ" میں لکھتے ہیں:

"حضرت شاہ شہید صاحبؒ نے بلاشک خود رفع یدین بھی کیا۔ اور اسی زمانہ میں انہوں نے تنویر العینین رسالہ بھی اس مسئلہ پر لکھا تھا مگر بعد کو انہوں نے رفع یدین ترک کر دیا تھا چنانچہ مولانا سید عبدالخالق صاحبؒ (جو مولانا السید نذیر حسین صاحب دہلویؒ کے استاذ ہیں ۱۲۴۶ھ میں بمقام بالاکوٹ شہید ہوئے۔ دیکھئے حاشیہ اہل سنت والجماعت ص۲۷ از مولانا محمد علی الصدیقی الکاندھلوی۔ اور خود تاریخ التقلید ص۱۲ میں بھی ان کو سید صاحب کا استاذ بتایا ہے۔ چنانچہ تفسیر و حدیث میں مہارت کی سرخی کے تحت لکھا ہے کہ (مولانا السید نذیر حسین صاحبؒ نے) اور ایک دفعہ مولانا سید عبدالخالق صاحب شاگرد حضرت شاہ عبدالقادر اور شاہ اسحاق صاحب سے یعنی اس مبارک علم میں

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

الحق ان رفع اليدين	حق یہ ہے کہ نماز شروع کرتے وقت.
عند الافتتاح (و٣الركوع)	رکوع کو جاتے اور اس سے اٹھتے وقت
والقيام منه والقيام الى	اور تیسری رکعت کیلئے اُٹھتے وقت رفع یدین
الثالثة سنة غير مؤكدة	کرنا سنت غیر مؤکدہ ہے. بسنن ہدٰی

(باقی حاشیہ گذشتہ صفحہ) کا حقہ مہارت پیدا کرلی) لکھتے ہیں کہ:

"مولوی کریم اللہ دہلوی ساکن محلہ لال کنویں نے کہا ہے کہ یہ لوگ اسمٰعیلی ہیں مولوی اسماعیل کی تقلید کرتے ہیں وہ بھی ایسے ہی تھے مگر سچ یوں ہے کہ ان کا گمان فاسد اور محض ظلم اور کذب ہے. وہ ہرگز ایسے نہ تھے بلکہ انہوں نے نواح پشاور میں بعد مباحثہ علمائے حنفیہ کے رفع یدین چھوڑ دیا تھا اور عالم محقق تھے ایسے لوگوں کو جو پاتے تھے تو گور پرستوں سے زیادہ بد جانتے الخ"

آگے لکھتے ہیں: "اور ایک رسالہ تنویر العینین کا جو بعض آدمیوں نے ان کی شہادت کے بعد ان کا کرکے مشہور کیا اگر وہ ان کا ہو تو بھی بسبب اس کے کہ انہوں نے رفع یدین آخر عمر میں ترک کیا اس بات میں معتبر نہ رہا، موافق مذہب اہل حدیث کے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے العبرة با لخواتيم وانما الاعمال بالخواتيم الخ (تنبیہ الضالین ص۸۶ و ص۸۷ برحاشیہ نظام الاسلام طبع خورشید عالم لاہور")

اس سے بڑی شہادت اور کیا ہوسکتی ہے کہ السید مولانا نذیر حسین صاحبؒ کے استاد بزرگوار نے جو مجاہدین کے زمرہ میں شریک ہوکر بالاکوٹ میں شہید ہوئے صاف لفظوں میں یہ تحریر فرمایا کہ حضرت شاہ شہیدؒ نے آخر عمر میں رفع یدین ترک کردیا تھا" (طائفہ منصورہ ص۲۴/۲۵ ادارہ نشر و اشاعت مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ)

[1] ــــــ، راقم الحروف نے یہ عبارت "طائفہ منصورہ" کے حوالے سے نقل کی تھی۔ اس میں بین القوسین کا لفظ طباعت کی غلطی سے رہ گیا ہے۔ میں نے سیاق عبارت کے پیش نظر اس کا اضافہ کردیا تھا۔ بعد میں اصل رسالہ دیکھنے کی نوبت آئی تو اس میں یہ لفظ موجود ہے۔ فالحمد للہ علی ذالک۔

من سنن الهدیٰ۔ فیثاب
فاعلهٗ بقدر ما فعل ۔ ان
دائما فبحسبه۔ وان مرةً
فبمثله۔ ولا یلام تارکه
وان ترکه مدة عمره ۔

ہے ۔ پس اس کے کرنے والے کو بقدر
اس کے فعل کے ثواب ہوگا ۔ اگر ہمیشہ
کرے تو اس کے مطابق اور ایک مرتبہ
کرے تو اس کے مطابق ۔ اور اس کے تارک
پر کوئی ملامت نہیں خواہ مدت العمر نہ کرے ۔

(تنویر العینین ص۹ بحوالہ طائفہ منصورہ، ص۱۲۶ ، از مولانا محمد سرفراز خان صاحب)

اور ان کے جد امجد شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے بھی "حجۃ اللہ البالغہ" میں رفع یدین کو "احبّ الیَّ" فرمایا ہے مگر اس کے باوجود وہ لکھتے ہیں :

وهو من الهیئات ، فعله
النبی صلی الله علیه وسلم
مرة وترکه مرة ، والکل
سنةٌ واخذ بکل واحد
جماعة من الصحابة والتابعین
ومن بعدهم۔ وهذا احد
المواضع التی اختلف فیها
الفریقان اهل المدینة والکوفة
ولکل واحد اصل اصیل ۔

(ص۱۰/۲۸)

اور رفع یدین منجملہ ان افعال و ہیئات
کے ہے جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
نے کبھی کیا اور کبھی نہیں کیا اور یہ سب
سنت ہیں، اور آپ کے ہر ایک فعل کو صحابہؓ
وتابعینؒ اور ان کے بعد ائمہ ہدیٰ کی ایک
جماعت نے اختیار کیا۔ اور یہ ان مواضع
میں سے ایک ہے۔ جن میں اہل مدینہ
اور اہل کوفہ کی دو جماعتوں کا اختلاف
ہوا۔ اور ہر ایک کے پاس ایک مضبوط
اصل ہے ۔

حضرت شاہ شہیدؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے ارشادات سے معلوم ہوا کہ جن اکابر نے قدیماً وحدیثاً رفع الیدین کو اختیار کیا ہے وہ بھی ترک رفع یدین کو سنت نبوی تسلیم کرتے ہیں، البتہ اس کے مقابلہ میں رفع یدین کی سنت کو احب واولیٰ سمجھتے ہیں ، مگر انہوں نے اس کو کبھی کفر واسلام کا مدار نہیں بنایا۔ اور نہ تارکین رفع یدین کو لائق ملامت سمجھا۔ چہ جائیکہ انہوں نے ہمارے بہادر ریگ

صاحب کی طرح تارکین رفع کو کفر و ارتداد یا گناہ کبیرہ کا مرتکب قرار دے کر ان سے توبہ کرانا ضروری سمجھا ہو۔

الغرض وہ تمام مسائل جن میں سلف صالحین اور فقہائے اُمت کا اختلاف ہے۔ خصوصاً جن مسائل میں اختلاف صرف افضلیت وغیر افضلیت تک محدود ہے ان میں ایسا غلو اور تشدد روا نہیں کہ ایک دوسرے کو توبہ کی دعوتیں دی جانے لگیں۔ ایسا غلو اور تشدد، ابتداع فی الدین ہے جس سے شاہ صاحبؒ کے بقول، دین میں تحریف کا دروازہ کھلتا ہے، ایسے لوگوں کا شمار اہل حق میں نہیں، اہل بدعت میں ہے۔ میں اپنے بہادر بھائی اور ان کے دیگر ہم مشرب بزرگوں کی خدمت میں نہایت دردمندی سے گذارش کروں گا کہ آپ کے جذبۂ عمل بالحدیث کی دل و جان سے قدر کرتا ہوں۔ مگر خدارا! ان فروعی مسائل میں ایسا غلو اور تشدد روا نہ رکھئے جس سے دین کی حدود مٹ جائیں۔ اور فرائض و واجبات اور مستحبات کے درمیان خط امتیاز باقی نہ رہے اور بے دین طبقہ کو اہل دین کا تمسخر اڑانے کا موقع ملے۔ آپ جس سنت کو اولیٰ و افضل سمجھتے ہیں بڑے شوق و اخلاص سے اس پر عمل کیجئے انشاء اللہ آپ کو اپنے مخلصانہ عمل کا اجر ملے گا۔ لیکن دوسرے حضرات کے نزدیک اگر دوسری سنت افضل و راجح ہے۔ تو ان پر بھی طعن نہ کیجئے بلکہ اطمینان رکھئے کہ ان کو بھی بشرط اخلاص اس دوسری سنت پر عمل کرنے سے انشاء اللہ آپ سے کم اجر نہیں ملے گا۔

۵۔ عمل بالحدیث تمام ائمہ اجتہاد کی مشترک میراث ہے:

قرآن کریم نے بہت سے مقامات پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و فرمانبرداری اور آپ کے احکامات و ارشادات کی تعمیل کو اہل ایمان کا فریضہ ٹھہرایا ہے۔ سورۂ احزاب میں ارشاد ہے:

وما کان لمؤمن ولا مؤمنة	اور کام نہیں کسی ایماندار مرد کا اور نہ ایماندار
اذا قضی اللہ ورسولہ امراً ان	عورت کا جب کہ مقرر کر دے اللہ اور اس
یکون لھم الخیرة من امرھم۔	کا رسول کوئی کام کہ ان کو رہے اختیار

ومن یعص اللہ و رسولہٗ فقد ضلّ ضلالاً مبیناً۔	اپنے کام کا اور جس نے نافرمانی کی اللہ کی اور اس کے رسول کی سو وہ راہ بھولا صریح چوک کر۔
(الاحزاب: آیت ۳۶)	(ترجمہ شیخ الہندؒ)

"وما کان لمؤمن ولا مؤمنة" کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کی اطاعت وفرمانبرداری کا التزام شرطِ ایمان ہے۔ اس کے بغیر ایمان کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا کیونکہ جو شخص یہ ایمان رکھتا ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ آپؐ جو کچھ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کی جانب سے فرماتے ہیں، اس ایمان کے بعد آپؐ کے کسی حکم سے سرتابی کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے؟ اور یہ دو باتیں ایک قلب میں کیسے جمع ہو سکتی ہیں کہ ایک شخص کو آپؐ کی رسالت ونبوت پر ایمان بھی ہو اور پھر آپؐ کے احکام وفرامین کے قبول کرنے سے انحراف وانکار بھی ——

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

کل اُمّتی یدخلون الجنّة الامن ابٰی قالوا ومن یأبیٰ؟ قال، من اطاعنی دخل الجنّه۔ ومن عصانی فقد ابیٰ۔	میری اُمت کے سب لوگ جنت میں داخل ہوں گے مگر جس نے انکار کر دیا، صحابہؓ نے عرض کیا۔ اور انکار کون کرتا ہے؟ فرمایا، جس نے خوشی سے میرا حکم مانا وہ جنت میں داخل ہوگا۔ اور جس نے میری حکم عدولی کی اُس نے انکار کر دیا۔
(صحیح بخاری ج ۲ ص ۱۰۸۱)	

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات مقدسہ اور سنن طیبہ بھی باجماع اُمت واجب العمل ہیں اور سنت کے حجت شرعیہ ہونے کو "ضروریات دین" میں شمار کیا گیا ہے۔ شیخ ابن الہمامؒ تحریر الاصول میں تحریر فرماتے ہیں:

(حجیّة السنّة) سواء کانت	سُنّت خواہ فرض کے لئے مفید ہو، یا

مفيدة للفرض اوالواجب	واجب کے لئے، یا دونوں کے علاوہ
اوغيرهما (ضرورة	کسی اور حکم کے لئے، اس کا حجت ہونا
دينية) كل من لهٗ	ضروریات دین میں سے ہے، ہر وہ شخص
عقل وتميز حتى النساء	جو عقل وتمیز رکھتا ہو، حتی کہ عورتیں اور
والصبيان يعرف ان	بچے بھی جانتے ہیں کہ جس کی نبوت
من ثبت نبوته صادق	ثابت ہو وہ ان تمام امور میں سچا ہے
فيما يخبر عن الله تعالى - ويجب	جن کی وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے خبر
اتباعهٗ (تيسير التحرير شرح تحرير، للشيخ	دیتا ہے۔ اور اس کی اتباع واجب ہے
محمد امين امير بادشاه ج۳ ص۲۲)	

اور جن "اصول اربعہ" سے احکام شرعیہ کا ثبوت تمام فقہائے امت کے نزدیک متفق علیہ ہے (یعنی کتاب اللہ، سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اجماع امت اور قیاس مجتہد) ان میں دوسرا مرتبہ سنت نبوی (علی صاحبہا الف الف صلوٰۃ وسلام) کا ہے۔ امام اعظم ابو حنیفہؒ کا ارشاد متعدد طرق والفاظ سے مروی ہے کہ:

ماجاءنا عن رسول الله صلى	جو چیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے
الله عليه وسلم ـــــ بابي	ہم تک پہنچے ـــــ میرے ماں
وامي ـــــ فعلى الراس	باپ آپ پر قربان ہوں ـــــ
والعين، وماجاء عن	وہ سر آنکھوں پر، اور جو بات صحابہ
الصحابة اخترنا، وما	کرامؓ سے منقول ہو (تو اختلاف کی
كان من غير ذالك	صورت میں) ہم اس میں ایک
فهم رجال ونحن	قول کو اختیار کرتے ہیں۔ اور جو چیز تابعینؒ
رجال -	سے منقول ہو تو وہ بھی ہم جیسے آدمی ہیں۔
(مناقب ذهبي ص۲۱)	(کیونکہ حضرت امامؒ بھی تابعی ہیں)

ایک اور روایت میں ہے :

اخذ بکتاب اللہ فما لم اجد فبسنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، والاثار الصحاح التی فشت فی ایدی الثقات عن الثقات۔ فان لم اجد فبقول الصحابہ اخذ بقول ماشئت۔ واما اذا انتھی الامر الی ابراھیم والشعبی والحسن وعطاء فاجتھد کما اجتھدوا۔	میں سب سے پہلے اللہ کی کتاب کو لیتا ہوں۔ پس اس میں اگر مسئلہ نہ ملے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت کو لیتا ہوں۔ اور ان آثارِ صحیحہ پر عمل کرتا ہوں جو ثقہ راویوں کی روایت سے شائع ذائع ہیں۔ اگر سنّتِ نبویؐ میں بھی مسئلہ نہ ملے تو صحابہ کرامؓ کے اقوال میں سے کسی ایک قول کو لیتا ہوں۔ لیکن جب معاملہ ابراہیم، شعبی، حسن اور عطاؒ (تابعین رحمہم اللہ) تک پہنچے تو میں خود اجتہاد کرتا ہوں، جیسا کہ ان حضرات تابعینؒ نے اجتہاد کیا۔

(مناقب امام للذہبی صـ۲۰)

ایک روایت میں ہے :

انا نعمل بکتاب اللہ ثم بسنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثم باحادیث ابی بکر وعمر وعثمان وعلی رضی اللہ عنھم	ہم کتاب اللہ پر عمل کرتے ہیں، پھر سُنّت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر، پھر حضرات ابوبکر و عمر و عثمان و علی رضی اللہ عنہم کی احادیث پر۔

(عقود الجواھر المنیفہ صـ۸)

تاہم جہاں نصوص میں بظاہر تعارض نظر آئے وہاں اپنے اپنے فہم و اجتہاد کے مطابق تمام ائمہ مجتہدین کو نصوص میں جمع و تطبیق یا ترجیح کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں محدّث اور مجتہد کا وظیفہ الگ الگ ہو جاتا ہے۔ ایک محدّث کا منصب یہ ہے کہ وہ ان تمام امور کو روایت کرتا

جائے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں۔ اسے اس سے بحث نہیں کہ ان میں سے کون ناسخ ہے کون منسوخ ہے۔ کون قاعدہ کلیہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور کس کی حیثیت مستثنیات کی ہے کون سا حکم وجوب پر محمول ہے اور کونسا ندب واستحباب یا اجازت پر کونسا حکم تشریعی ہے اور کونسا ارشادی۔ امت کا تواتر وتعامل کس پر ہے اور کس پر نہیں؟ یہ اور اس قسم کے بہت سے امور پر غور کر کے یہ معلوم کرنا کہ شارع کا ٹھیک ٹھیک منشا کیا ہے؟ یہ محدث کا وظیفہ نہیں بلکہ مجتہد کا منصب ہے۔ ــــ آپ چاہیں تو اس کو یوں تعبیر کر لیجئے کہ ایک ہے حدیث کے الفاظ کی حفاظت ونگہداشت اور ایک ہے حدیث کے معانی ومفاہیم میں دقیقہ رسی، شریعت کے کلیات کو جزئیات پر منطبق کرنا اور جزئیات سے کلیات کی طرف منتقل ہونا، پہلی چیز محدث کا منصب ہے۔ اور دوسری فقیہہ مجتہد کا ــــ اسی لئے امام ترمذیؒ فرماتے ہیں:

وکذالک قال الفقہاء وھم اعلم بمعانی الحدیث۔	اور فقہاء نے اسی طرح کہا ہے اور حدیث کے معنیٰ ومفہوم کو وہی بہتر جانتے ہیں۔

(ترمذی باب غسل المیت ص۱۱۸)

امام اعمشؒ سے ایک موقعہ پر چند مسائل دریافت کئے گئے۔ امام ابوحنیفہؒ بھی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے جواب کے لئے حضرت امامؒ کو فرمایا۔ حضرت امامؒ نے مسائل بتادیئے تو انہوں نے پوچھا یہ مسائل کہاں سے نکالے۔ عرض کیا فلاں فلاں احادیث سے جو آپ ہی سے سُنی ہیں یہ کہہ کر وہ تمام احادیث سنادیں۔ امام اعمشؒ نے فرمایا "بس بس، جو احادیث میں نے سو دن میں تمہیں سنائی تھیں وہ تم نے ایک ہی جلسہ میں سناڈالیں، مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم ان احادیث سے بھی مسائل اخذ کروگے۔

یامعشر الفقہاء انتم الاطباء ونحن الصیادلہ۔	اے فقہا کی جماعت! تم طبیب ہو اور ہم دوافروش ہیں۔

(الخیرات الحسان ص۶۱)

بلاشبہ بہت سے اکابر کو حق تعالیٰ شانہٗ نے دونوں نعمتوں سے سرفراز فرمایا تھا۔ وہ بیک

وقت بلند پایہ محدث بھی تھے اور دقیقہ رس فقیہ بھی ——— جیسا کہ حضرات ائمہ مجتہدین رحمہم اللہ روایت و درایت دونوں کے جامع تھے کیونکہ اجتہاد و تفقہ علم حدیث میں کامل مہارت کے بغیر ممکن نہیں۔

الغرض جب ایک مجتہد کسی مسئلہ پر قرآن و سُنّت کے نصوص، صحابہ کرام رض کے آثار اور اُمّت کے تعامل کی روشنی میں غور کرتا ہے تو اسے متعارض نصوص کے درمیان جمع و تطبیق یا ترجیح کے بغیر چارہ نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ اگر اس صورت میں کسی مجتہد نے کسی حدیث کو ترک کیا ہو تو اس سے قوی تر دلیل کے پیش نظر ہی کیا ہوگا۔ اس لئے اس پر ترکِ حدیث کا الزام عائد نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ یہ ترک بھی محض خواہشِ نفس کی بنا پر نہیں بلکہ شارع کے منشا کی تلاش میں ہے۔ شیخ ابن تیمیہؒ اپنے رسالہ "رفع الملام عن الائمۃ الاعلام" میں فرماتے ہیں:

ولیعلم انہ لیس احد من الائمۃ المقبولین عند الامۃ قبولاً عاماً یعتمد مخالفۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (فی) شیٔ من سنتہ دقیق ولا جلیل۔	جان لینا چاہیئے کہ ائمہ اجتہاد، جن کو اُمت کے نزدیک قبولِ عام حاصل ہے ان میں سے کوئی بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّتوں میں سے کسی سُنّت کی قصداً مخالفت نہیں کرتا۔ نہ کسی چھوٹی سنت کی، نہ کسی بڑی سنت کی۔
فانہم متفقون اتفاقاً یقینیاً علی وجوب اتباع الرسول صلی اللہ علیہ وسلم، وعلی ان کل احد من الناس یوخذ من قولہ ویترک الا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم،	کیونکہ تمام ائمہ اس پر یقینی طور پر متفق ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع واجب ہے۔ اور یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا ہر شخص کی حیثیت ایسی ہے کہ اس کے قول کو لیا بھی جا سکتا ہے اور چھوڑا بھی جا سکتا ہے۔
ولکن اذا وجد لواحد منہم	لیکن جب ائمہ اجتہاد میں سے کسی کا ایسا قول نظر آئے کہ حدیث صحیح اس کے خلاف

قول قد جاء حديث صحيح بخلافه	ہو تو اس کے لئے اس کے ترک میں ضرور
فلابدّ له من عذر في تركه" (صلا)	کوئی عذر ہو گا ۔

پھر مجتہدین کے درجات میں بھی تفاوت ہے۔ اور کیوں نہ ہو جب کہ یہ تفاوت خود انبیاء کرام علیہم السلام کی ذوات قدسیہ میں موجود ہے، "تلك الرسل فضلنا بعضهم على بعض"۔ اس لئے اجتہاد کے مدارک مختلف ہو سکتے ہیں۔ لیکن اپنی اپنی سعی و کوشش اور اپنے اپنے تفقہ و اجتہاد کے مطابق تمام ائمہ مجتہدین منشائے شارع کی تلاش میں کوشاں ہیں۔ حافظ ابن عبد البرؒ "الانتقا" میں امام عبد اللہ بن مبارکؒ سے نقل کرتے ہیں:

"كان ابو حنيفةؒ شديد	امام ابو حنیفہؒ علم کو بہت زیادہ اخذ
الأخذ للعلم. ذاباً عن حرم	کرنے والے تھے، بڑی شدت کے
الله ان يستحل يأخذ بما صح	ساتھ حدود الٰہیہ سے مدافعت فرماتے
من الاحاديث التي يحملها	تھے۔ کہ کہیں ان کی بے حرمتی نہ ہونے
الثقات. وبالآخر من	پائے۔ صحیح احادیث کو لیتے تھے،
فعل رسول الله صلى	جو ثقہ راویوں کے ذریعہ مروی ہیں۔
الله عليه وسلم وبما	اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری
ادرك عليه علماء	سے آخری فعل کو لیتے تھے۔ اور اس
الكوفة. ثم شنع	فعل کو جس پر آپ نے علمائے کوفہ
عليه قوم يغفر	کو پایا تھا۔ پھر بھی کچھ لوگوں نے آپ کو
الله لنا ولهم"	برا بھلا کہا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی معاف
(ص۱۲۲)	فرمائے۔ اور ان لوگوں کو بھی۔

شیخ ابن حجر مکیؒ نے "الخیرات الحسان" میں امام ابو یوسفؒ کا قول نقل کیا ہے کہ انہوں نے امام ابن مبارکؒ کے سامنے حضرت امامؒ کے اوصاف بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"انه يرڪب من العلم احدّ
من سنان الرمح۔ كان
والله شديد الاخذ للعلم
ذا ابا عن المحارم متبعاً لاهل
بلده۔ لا يستحل ان يأخذ
الا ما صحّ عن رسول الله
صلى الله عليه وسلم، شديد
المعرفة بناسخ الحديث
ومنسوخه۔ وكان يطلب
احاديث الثقات والاخذ
من فعل رسول الله
صلى الله عليه وسلّم
وما ادرك عليه علماء
اهل الكوفة في
اتباع الحق اخذ به،
وجعله دينه۔ وقد
شنع عليه قوم
فسكتنا عنهم
بما نستغفر الله"
(ص٣٠)

وہ علم کی ایسی باریکی پر سوار تھے جو نیزے
کی نوک سے زیادہ تیز ہے اللہ کی قسم!
وہ بہت زیادہ علم حاصل کرنے
والے تھے، محرمات الٰہیہ کی مدافعت
کرتے تھے، اپنے اہل شہر کے متبع
تھے، وہ اس بات کو حلال نہیں
سمجھتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
کی صحیح احادیث کے سوا کسی چیز کو اخذ
کریں۔ حدیث کے ناسخ ومنسوخ کی
شدید معرفت رکھتے تھے، ثقہ راویوں
کی احادیث اور آنحضرت صلی اللہ علیہ
وسلم کے فعل کو اخذ کرنے کی طلب
میں رہتے تھے۔ اور حق کی اتباع میں
علمائے اہل کوفہ کو جس چیز پر پایا اُسے
اپنایا۔ اور اس کو اپنا دین بنا لیا۔
کچھ لوگوں نے آپ پر ناحق طعن وتشنیع
سے کام لیا ہے ہم اللہ تعالیٰ
سے استغفار کرتے ہوئے ان لوگوں
کے بارے میں خاموشی اختیار
کرتے ہیں۔

الغرض ائمہ مجتہدین رحمہم اللہ کے بارے میں یہ بدگمانی کہ وہ محض رائے کی وجہ سے
احادیث طیبہ کو ترک کر دیتے ہیں، نہ صرف یہ کہ صریح ظلم وزیادتی ہے۔ بلکہ اجتہاد کے منصب

رفیع سے ناآشنائی کی علامت ہے ، امام ربانی مجدد الف ثانی رحمہ اللہ صحیح فرماتے ہیں :

"جماعۃ کہ ایں اکابر دین را اصحاب رائے
میدانند ، اگر ایں اعتقاد دارند کہ
ایشاناں بہ رائے خود حکم میکردند و
متابعت کتاب و سنت نمی نمودند
پس سواد اعظم از اہل اسلام بزعم
فاسد ایشاں ضال و مبتدع باشند ،
بلکہ از جرگہ اہل اسلام بیروں بوند ، ایں
اعتقاد نہ کند مگر جاہلے کہ از جہل خود
بے خبر است ، یا زندیقے کہ مقصودش
ابطال شطر دین است . ناقصے چند ،
احادیثِ چند را یاد گرفتہ اند و احکام
شریعت را منحصر دراں ساختہ اند ،
و ماورائے معلوم خود را نفی می نمایند ،
و آنچہ نزد ایشاں ثابت نشدہ
منتفی میسازند

ع

چوں آں کرمیکہ در سنگے نہاں است
زمین و آسمانِ او ہماں است"

(مکتوبات دفتر دوم حصہ ہفتم
مکتوب ۵۵ ، ص ۱۵ ، مطبوعہ
امرتسر)

جو لوگ ان اکابر دین کو "اصحاب رائے"
کہتے ہیں اگر یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ یہ
حضرات محض اپنی رائے سے حکم کرتے
تھے . اور کتاب و سنت کی پیروی نہیں
کرتے تھے تو ان کے خیال فاسد
کے مطابق مسلمانوں کا سواد اعظم گمراہ
اور بدعتی ہوگا . بلکہ اہل اسلام کی جماعت
ہی سے خارج ہوگا . اور یہ خیال
نہیں کرے گا ، مگر وہ جاہل ، جو اپنے
جہل سے بے خبر ہو . یا وہ زندیق جس
کا مقصود نصف دین کو باطل ٹھہرانا ہو .
چند کوتاہ فہم لوگوں نے چند احادیث
یاد کر رکھی ہیں . اور شریعت کے احکام
کو انہی میں منحصر سمجھ لیا ہے ، وہ اپنے
معلومات کے ماورا کی نفی کر ڈالتے
ہیں . اور جو چیز ان کے نزدیک ثابت
نہ ہو سمجھتے ہیں کہ اس کا وجود ہی سرے
سے نہیں .

"جیسے وہ کیڑا جو پتھر میں چھپا ہوا ہو ،
اس کی زمین و آسمان بس وہی پتھر ہے"
(گویا اس کے سوا نہ آسمان کا وجود ہے نہ زمین کا) .

۶ — ترک عمل بالحدیث کے اسباب:

شیخ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ ایک مجتہد جن اعذار کی بنا پر کسی حدیث کے عمل کو ترک کرتا ہے ان کی اجمالاً تین قسمیں ہیں:

احدها: عدم اعتقاده ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قالہ۔	ایک یہ کہ وہ اس بات کا قائل ہی نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات ارشاد فرمائی ہوگی۔
"والثانی: عدم اعتقاده ارادة تلک المسئلة بذالک القول"	دوم یہ کہ وہ اس کا قائل نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ارشاد سے یہ مسئلہ مراد لیا ہوگا۔
"والثالث: اعتقاده ان ذالک الحکم منسوخ"۔ (رفع الملام ص۱)	سوم یہ کہ اس کا خیال ہے کہ یہ حکم منسوخ ہوچکا ہے۔

شیخ لکھتے ہیں کہ یہ تین قسمیں متعدد اسباب کی طرف متفرع ہیں، اس سلسلہ میں انہوں نے دس اسباب کی نشاندہی فرمائی ہے۔ مناسب ہے کہ ان کا خلاصہ یہاں درج کر دیا جائے۔

پہلا سبب: حدیث کی اطلاع نہ ہونا:

ان دس اسباب میں سے پہلا اور اکثری سبب شیخ ابن تیمیہؒ کے نزدیک انہی کے الفاظ میں یہ ہے:

"ان لا یکون الحدیث قد بلغہ ومن لم یبلغہ الحدیث لم یکلف ان یکون عالماً بموجبہ۔ واذا لم یکن قد بلغہ،	کہ اس کو حدیث نہ پہنچی ہو اور جب اس کو حدیث پہنچی ہی نہیں تو ظاہر ہے کہ وہ اس بات کا مکلف ہی نہیں کہ اس کے حکم کا عالم ہو۔ اور جب اسے حدیث نہ پہنچی ہو اور اس نے اس مسئلہ میں

وقد قال فی تلک القضیة بموجب ظاهر آیة، او حدیث آخر، او بموجب قیاس، او موجب استصحاب، فقد یوافق ذالک الحدیث تارة، ویخالفہ اخریٰ وھذا السبب ھو الغالب علی اکثر ما یوجد من اقوال السلف مخالفاً لبعض الاحادیث" (ص۱۲)	کسی آیت کے ظاہر۔ یا کسی اور حدیث کے موافق، یا قیاس و استصحاب کی رُو سے کوئی رائے قائم کی ہو تو وہ کبھی اس حدیث کے موافق ہوگی۔ اور کبھی مخالف۔ اور سلف کے جو اقوال بعض احادیث کے خلاف پائے جاتے ہیں ان کا غالب اور اکثری سبب یہی ہے۔

قریب قریب یہی بات مسند الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہ نے "حجۃ اللہ البالغہ" اور "الانصاف فی بیان اسباب الاختلاف" میں لکھی ہے۔ بعض حضرات کو اس سے شدید غلط فہمی ہوئی ہے۔ اور انہوں نے ترک حدیث کے باقی اسباب کو نظر انداز کر کے گویا اسی کو ایک مستقل اصول بنا لیا ہے کہ جہاں کسی مجتہد کا قول کسی حدیث کے خلاف نظر آئے یہ حضرات اپنے حسن ظن کی وجہ سے یہ سمجھتے ہیں کہ اس مجتہد کو یہ حدیث نہیں پہنچی ہوگی۔ مگر یہ رائے نہایت مخدوش ہے۔ ان دونوں بزرگوں نے اس کی شہادت میں سلف کے جو واقعات نقل کئے ہیں وہ معدودے چند ہیں۔ اس لیے اس کو ترک حدیث کا "اکثری سبب" قرار دینا محل نظر ہے۔

علاوہ ازیں یہ عذر ان مسائل میں تو صحیح ہے جو کبھی شاذ و نادر پیش آتے ہیں (اور اس ضمن میں جو واقعات پیش کئے گئے ہیں وہ اسی نوعیت کے ہیں) لیکن وہ مسائل جن سے روزمرہ سابقہ پیش آتا ہے، ان میں یہ عذر صحیح نہیں۔ مثلاً امام کے پیچھے فاتحہ پڑھی جائے یا نہیں؟ آمین اُونچی کہی جائے یا آہستہ؟ رکوع کو جاتے اور اس سے اُٹھتے وقت رفع یدین کیا جائے یا نہیں؟ اذان واقامت کے کلمات کتنے ہیں؟ وغیرہ وغیرہ ——— ظاہر ہے کہ یہ ایسے شاذ و نادر مسائل نہیں جن کی ضرورت برس بھر میں کبھی ایک آدھ بار پیش آتی ہو۔ اور یہ فرض کر لیا جائے کہ بعض سلف کو حدیث نہیں پہنچی ہوگی۔ یہ اعمال تو ایسے ہیں کہ روزانہ بار بار علی رؤس الاشہاد ادا کئے جاتے ہیں، اور

دسواں سبب: مختلف فیہ معارض کا پایا جانا:

"حدیث کے معارض ایسی چیز موجود ہو جو اس کے ضعف، یا نسخ یا تاویل پر دلالت کرتی ہو۔ وہ چیز یا اس کی جنس دوسروں کے نزدیک معارض نہیں یا فی الحقیقت معارض راجح نہ ہو......" (ص ۲۹)

ان دس اسباب کو ذکر کرنے کے بعد شیخ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

فھذہ الاسباب العشرۃ	یہ دس اسباب تو بالکل ظاہر ہیں اور
ظاھرۃ۔ وفی کثیر من الاحادیث	بہت سی احادیث میں عالم کے لئے
یجوز ان یکون للعالم حجۃ فی	ترک عمل بالحدیث پر کوئی ایسی حجت بھی ہو
ترک العمل بالحدیث لم نطلع	سکتی ہے جس پر ہم مطلع نہ ہوئے ہوں
نحن علیھا۔ فان مدارک	کیونکہ علم کے مدارک بڑے وسیع
العلم واسعۃ ولم نطلع	ہیں۔ اور اہل علم کے سینوں میں جو کچھ
نحن علی جمیع مافی بواطن العلماء (۵۲)	ہے سب پر ہم مطلع نہیں۔

ان دہگانہ اسباب پر غور کیا جائے تو سوائے پہلے اور پانچویں سبب کے، باقی تمام امور ایسے ہیں جن کا منشا اجتہاد کا اختلاف ہے۔ فریقین میں سے کسی کے بارے یہ کہنا ممکن نہیں کہ وہ قطعی غلطی پر ہے۔ اور پھر اس پر غور فرمایا جائے کہ شیخ ابن تیمیہؒ ایسا "دریائے علم" کس صفائی سے اعتراف کرتا ہے کہ تمام مدارک اجتہاد پر اطلاع پانا ہمارے لئے ممکن نہیں۔ اس سے مقام اجتہاد کی گیرائی وگہرائی اور بلندی وبرتری کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ انّ فی ذالک لذکریٰ لمن کان لہٗ قلب او القی السمع وھو شہید۔

۷۔ کسی روایت پر صحیح یا ضعیف ہونے کا حکم بھی اجتہادی امر ہے:

شیخ ابن تیمیہؒ کے جو اقتباسات اوپر تیسرے اور چوتھے سبب کے ذیل میں نقل کئے گئے ہیں

ان سے واضح ہوتا ہے کہ کسی روایت کی تصحیح وتضعیف میں بھی اختلاف ہو سکتا ہے کہ ایک مجتہد کے نزدیک ایک حدیث صحیح ہو۔ اور دوسرے کے نزدیک صحیح نہ ہو۔ گویا احادیث کی تصحیح وتضعیف ایک اجتہادی امر ہے۔

شرح اس کی یہ ہے کہ بہت سی احادیث تو معنیً متواتر یا مستفیض ہیں ان کے صحیح ہونے میں تو کسی اختلاف واجتہاد کی گنجائش ہی نہیں بہت سی احادیث اگرچہ خبر واحد ہیں مگر انہیں تلقی بالقبول کی حیثیت حاصل ہے اس لئے ان کی صحت بھی نزاع و اختلاف سے بالاتر ہے۔ اور بعض احادیث وہ ہیں جن میں کسی علت خفیہ کا احتمال ہے یا جن کے راویوں میں جرح وتعدیل کی گنجائش ہے۔ ایسی احادیث کی تصحیح میں اختلاف رونما ہوتا ہے بعض حضرات ایک روایت کو صحیح کہتے ہیں اور بعض اسے ضعیف تصور کرتے ہیں چونکہ ان میں سے ہر فریق کا فیصلہ اپنے علم واجتہاد پر مبنی ہے۔ اس لئے وہ دوسرے فریق کے حق میں حجت نہیں۔ شیخ ابن ہمامؒ "فتح القدیر" باب النوافل میں لکھتے ہیں:

وقد اخرج مسلم عن كثير في	امام مسلمؒ نے اپنی کتاب ایسے بہت سے
كتابه ممن لم يسلم من غوائل	راویوں سے روایت لی ہے جو جرح
الجرح - وكذا في البخاري	سے محفوظ نہیں۔ اسی طرح صحیح بخاری
جماعة تكلم فيهم. فدار الامر	میں راویوں کی ایک جماعت ہے جن پر
في الرواة على اجتهاد العلماء	کلام کیا گیا ہے۔ اس سے واضح ہے
فيهم - وكذا في الشروط؛	کہ کسی راوی کے ثقہ یا غیر ثقہ ہونے کا
حتى ان من اعتبر شرطاً والغاه	مدار علماء کے اجتہاد پر ہے۔ اسی طرح صحت
آخر يكون ما رواه الآخر مما ليس	حدیث کے شرائط میں بھی۔ چنانچہ اگر
فيه ذالك الشرط عنده مكافئا	ایک مجتہد ایک شرط کو ضروری سمجھتا ہو
لمعارضة المشتمل على ذالك	اور دوسرا اسے غیر ضروری سمجھتا ہو تو وہ
الشرط - وكذا فيمن ضعّف	روایت جس کو یہ دوسرا مجتہد روایت کرتا
راويا ووثقه الآخر - نعم	ہے اور جس میں وہ شرط نہیں پائی جاتی

بلا شبہ بھول چوک خاصۂ انسانیت اور لازمۂ بشریت ہے۔ کسی خاص موقعہ پر کسی بات کا حافظہ سے اتر جانا کوئی مستبعد بات نہیں۔ لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ صحیح ثبوت کے بغیر یہ دعویٰ کر دینا غلط ہے کہ وہ فلاں بات بھول گئے ہوں گے۔ اور پھر بھول چوک بھی نادر قسم کے اُموریں ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ شیخ ابن تیمیہؒ کے محولہ بالا واقعات سے واضح ہے۔ — روزمرّہ کے معمولات کے بارے میں یہ دعویٰ اس سے بھی زیادہ غلط ہے ـــ بعض حضرات نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ دعویٰ فرمایا کہ وہ رکوع کو جاتے اور اس سے اُٹھتے وقت رفع یدین کرنا بھول گئے ہوں گے۔ یہ ایک ایسی بات ہے کہ کوئی صاحب فہم اس کو زبان پر لانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ جس صحابی کو ابتدائے بعثت سے آخری دور نبوّت تک سفر و حضر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میسّر رہی ہو جو صحابہ کرامؓ میں "صاحب النعل والوسادہ" کے لقب سے معروف ہو۔ اور جس کے بارے میں ارشاد نبویؐ ہو "تمسّکوا بعہد ابن ام عبدؓ" اس کے بارے میں نماز کی ایک ایسی سُنّت کے بارے میں ـــ جو دن میں بیسیوں مرتبہ دہرائی جاتی ہو ـــ یہ دعویٰ کرنا کہ وہ بھول گئے ہوں گے، سوچنا چاہیئے کہ کس قدر عجیب و غریب بات ہے۔

چھٹا سبب: دلالت حدیث سے واقف نہ ہونا:

"مجتہد کو دلالت حدیث کی معرفت نہ ہو۔ کبھی اس لئے کہ حدیث میں جو لفظ آیا وہ اس کے لئے اجنبی تھا۔ ۔ ۔ ۔ کبھی اس لئے کہ اس کی لغت و عرف میں اس لفظ کے جو معنیٰ تھے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لغت کے خلاف تھے۔ اس نے حدیث کو اپنی لغت کے مفہوم پر محمول کیا۔ ۔ ۔ ۔ کبھی اس لئے کہ لفظ مشترک یا مجمل تھا۔ یا حقیقت و مجاز دونوں کو محتمل تھا، پس مجتہد نے اس کو ایسے معنیٰ پر محمول کیا جو اس کے نزدیک اقرب تھا۔ حالانکہ مراد دوسری تھی۔" (ص ۳۶ تا ص ۴۲ ملخصاً)

حدیث کے کسی لفظ کی تفسیر میں اہل علم کا اختلاف تو ایک عام بات ہے۔ اور شیخ ابن تیمیہؒ نے مثالیں بھی اسی کی دی ہیں۔ لیکن یہ بات ناقابل فہم ہے کہ مجتہد کو دلالت حدیث کی معرفت ہی نہ ہو، کیونکہ لغت اور طرق دلالات کی معرفت تو اجتہاد کی شرط اول ہے۔ پس ایسا شخص مجتہد کیونکر ہو گا۔

ساتواں سبب : حدیث کا اس مسئلہ پر دلالت نہ کرنا :

مجتہد کا اعتقاد یہ ہو کہ حدیث میں اس مسئلہ کی دلالت نہیں۔ اس سبب کے درمیان اور اس سے پہلے سبب کے درمیان فرق یہ ہے کہ پہلی صورت میں وہ یہی نہیں جانتا تھا کہ یہ لفظ اس مفہوم پر دلالت کرتا ہے یا نہیں ؛ لیکن اس ساتویں صورت میں وہ دلالت کی وجہ کو تو وہ جانتا ہے ، لیکن اس کے نزدیک اصول کی روشنی میں یہ دلالت صحیح نہیں ، خواہ واقع میں بھی اس کا خیال صحیح ہو یا نہ ہو۔" (ص۴۳)

آٹھواں سبب : دلالت کے معارض دلیل کا ہونا :

" اس کا یہ اعتقاد ہو کہ اس دلالت کے معارض دلیل موجود ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ دلالت مراد نہیں ۔ مثلاً عام کے مقابلہ میں خاص کا ہونا ، مطلق کے مقابلہ میں مقید کا ہونا ، یا امر مطلق کے مقابلے میں ایسی چیز کا ہونا جو وجوب کی نفی کرتی ہو ، یا حقیقت کے مقابلہ میں ایسے قرینے کا موجود ہونا جو مجاز پر دلالت کرے ۔

وھو باب واسع ایضاً۔ فان تعارض دلالات الاقوال وترجیح بعضھا علی بعض ، بحر خضم (ص۴۵)

اور یہ باب بھی بہت ہی وسیع ہے کیونکہ الفاظ کی دلالتوں کا متعارض ہونا اور بعض کو بعض پر ترجیح دینا ایک ناپیدا کنار سمندر ہے ۔

نواں سبب : حدیث کے ضعف یا نسخ یا تاویل پر معارض کا موجود ہونا :

" اس کا یہ اعتقاد کہ حدیث کے معارض ایسی چیز موجود ہے جو اس کے ضعف ، یا نسخ یا تاویل پر (اگر وہ لائق تاویل ہو) دلالت کرتی ہے بشرطیکہ وہ چیز بالاتفاق معارض ہونے کی صلاحیت رکھتی ہو ۔ جیسے کوئی آیت ۔ یا حدیث ۔ یا اجماع " (۴۵)

نزدیک غیر ثابت اور ساقط الاعتبار قرار پائیں۔ جو ان کے مقرر کردہ معیار پر پوری نہیں اترتی تھیں حالانکہ ائمہ متقدمین کے نزدیک وہ صحیح تھیں اور وہ حضرات ان احادیث پر عمل پیرا تھے ، جن راویوں کو بعد کے حضرات نے مجہول ، سیئ الحفظ یا متہم قرار دے کر ان کی احادیث کو ترک کیا ائمہ متقدمین ان راویوں سے خود ملے تھے اور بعد کے حضرات کی بہ نسبت ان کے حالات سے زیادہ واقف تھے۔ متاخرین کے پاس سو سال قبل کے راویوں کی جانچ پرکھ کے لئے ان کے وضع کردہ اصطلاحی پیمانے تھے۔ لیکن متقدمین ، راویوں کو ان اصطلاحی پیمانوں سے ناپنے تولنے کے محتاج نہیں تھے۔ ان کی رائے براہ راست مشاہدہ پر مبنی تھی ، اسی طرح متاخرین نے جن احادیث میں ارسال و انقطاع کی ذراسی پرچھائیں بھی دیکھی اسے مترد کر دیا۔ حالانکہ متقدمین ان مرسل و منقطع احادیث کو ثابت سمجھتے تھے۔ جیسا کہ امام مالک اور امام محمد بن حسن شیبانی رحمہما اللہ تعالیٰ کی تصریحات موجود ہیں کیونکہ ائمہ متقدمین ہر کس و ناکس سے علم نہیں لیتے تھے۔ بلکہ جن کے علم و فہم اور صدق و دیانت پر انہیں اعتماد تھا انہی سے لیتے تھے۔ اس لئے انہیں اپنے مشائخ کی مرسل روایات پر اعتماد تھا مگر متاخرین کا اعتماد "عصائے عنعنہ" کا محتاج تھا ــــ چنانچہ شیخ ابن تیمیہؒ کے بقول جوں جوں وقت گذرتا گیا بہت سی وہ احادیث جن سے متقدمین تمسک کرتے تھے ، متاخرین کی نظر میں مشکوک ہوتی چلی گئیں۔ اگر اس نکتہ کو پیش نظر رکھا جائے تو متقدمین کے بجائے متاخرین زیادہ احادیث کے تارک نظر آئیں گے۔ مگر چونکہ ان کا یہ ترک بھی ایک اجتہادی رائے اور اپنے خیال میں احتیاط فی الدین پر مبنی ہے اس لئے وہ بھی ان احادیث کے ترک میں معذور ہیں۔

تیسرا سبب : حدیث کی صحت وضعف میں اختلاف :

شیخ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں :

"تیسرا سبب یہ ہے کہ ایک مجتہد نے اپنے اجتہاد سے ایک حدیث کو ضعیف سمجھا ہو جب کہ دوسرے طریق سے قطع نظر ، دوسرے حضرات برخلاف اس کے اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہوں ، خواہ حدیث کو ضعیف سمجھنے والے کا قول درست ہو ، یا اس کے

مخالف کا یا دونوں کا قول درست ہو، ان حضرات کے نظریہ کے مطابق جو کہتے ہیں کہ "ہر مجتہد صواب پہ ہے" (۲۷)

شیخ ؒ نے اس کے بعد حدیث کی تصحیح و تضعیف میں اختلاف کے متعدد اسباب ذکر کئے ہیں۔

چوتھا سبب: بعض احادیث کا مقررہ شرائط پر پورا نہ اترنا:

"ایک مجتہد، عادل و حافظ راوی کی خبر واحد میں ایسے شرائط کا لحاظ کرنا ضروری سمجھتا ہو، جن کا لحاظ دوسروں کے نزدیک ضروری نہ ہو، مثلاً حدیث کو کتاب و سنت پر پیش کرنا۔ یا مثلاً حدیث جب دیگر اصولِ شرعیہ کے خلاف ہو تو راوی فقیہ ہونا چاہیئے۔ یا مثلاً حدیث جب ایسے مسئلہ سے متعلق ہو جس کی ضرورت روزمرہ پیش آتی ہے تو اس کا مشہور ہونا" (ص۳۱)

پانچواں سبب: حدیث کا بھول جانا:

"مجتہد کو حدیث تو پہنچی تھی، اور اس کے نزدیک ثابت بھی تھی۔ مگر اسے یاد نہیں رہی" اس کی دو تین مثالیں ذکر کر کے آگے لکھتے ہیں: "وھذا کثیر فی السلف والخلف ـــــ یہ صورت بھی سلف و خلف میں بہت پیش آتی ہے" (ص۳۵)

شیخ ؒ نے یہاں صرف تین واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جنبی کے لئے تیمم کا مسئلہ، جس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حدیث نبوی یاد نہیں رہی تھی۔ اور حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے انہیں یاد بھی دلایا۔ مگر پھر بھی انہیں وہ واقعہ یاد نہیں آیا۔ دوسرا واقعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مشہور خطبہ کا جس میں انہوں نے زیادہ مہر رکھنے سے منع فرمایا، اور اس پہ ایک عورت نے آپ کو ٹوکا، اور آیت: "وآتیتم احداھن قنطاراً" انہیں یاد دلائی ـــــ ـــــ یہ واقعہ تو صحیح روایت سے ثابت ہے۔ مگر اس کو زیر بحث مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں۔ اور اس خاتون کا اس آیت کا حوالہ دینا بھی بے محل تھا، مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ تادباً مع القرآن خاموش رہے۔ تیسرا واقعہ جنگ جمل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو ایک حدیث یاد دلانے کا ہے۔ جس کو سن کر حضرت زبیر رضی اللہ عنہ قتال سے پلٹ گئے تھے۔

تعداد رکعات کی طرح یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے متواتر چلے آتے ہیں۔ اور عقلاً ناممکن ہے کہ اکابر صحابہؓ و تابعینؒ کو اس بارے میں سنّت نبوی کا علم نہ ہو۔

اسی طرح جن مسائل میں صحابہؓ و تابعینؒ کے زمانے میں بحث و مناظرہ کی نوبت آئی ان میں بھی یہ احتمال بعید ہے کہ ایک فریق کو حدیث نہیں پہنچی ہوگی۔ اس قسم کے مواقع پر صحیح عذر وہی ہے جس طرف اوپر اشارہ کر چکا ہوں کہ یہ مدارک اجتہاد کا اختلاف ہے۔ اس کی مثال وہ واقعہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بنو قریظہ کی بستی میں سب پہنچنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا:

لا یصلین احد کم العصر الا فی بنی قریظہ ۔	تم میں سے کوئی شخص عصر کی نماز نہ پڑھے مگر بنو قریظہ پہنچ کر۔

اتفاق سے وہاں پہنچنے میں صحابہ رضی اللہ عنہم کو تاخیر ہو گئی۔ اور نماز عصر کا وقت نکلنے لگا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے مشورہ کیا کہ کیا ہونا چاہیے؟ مشورہ میں دو فریق بن گئے۔ ایک کی رائے یہ تھی کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف صاف فرمایا ہے کہ بنو قریظہ پہنچنے سے پہلے عصر کی نماز نہ پڑھی جائے تو اب راستہ میں نماز پڑھنے کا کیا جواز ہے؟ اس لئے خواہ نماز قضا ہو جائے مگر ارشاد نبویؐ کی تعمیل ضروری ہے۔ جب کہ دوسرے فریق کی رائے یہ تھی کہ اس حکم سے منشأ مبارک یہ تھا کہ ہمیں عصر کا وقت ختم ہونے سے پہلے پہلے بنو قریظہ پہنچ جانا چاہیئے اور عصر کی نماز وہاں پہنچ کر پڑھنی چاہیئے۔ اب جب کہ ہم غروب سے پہلے وہاں نہیں پہنچ سکے تو نماز عصر قضا کرنے کے کوئی معنی نہیں۔ اگر ہم سے وہاں پہنچنے میں تاخیر ہو گئی ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ اب ہمیں نماز عصر قضا کر کے اپنی کوتاہی میں مزید اضافہ کر لینا چاہیئے۔ الغرض پہلے فریق نے ارشاد نبویؐ کی تعمیل میں نماز عصر قضا کرنا گوارا کی مگر ارشاد نبویؐ کے ظاہر سے ہٹنا گوارا نہیں کیا اور دوسرے فریق نے منشأ نبویؐ کی تعمیل ضروری سمجھی، راستے میں اتر کر نماز عصر پڑھی، اور پھر بنو قریظہ پہنچے۔ جب بارگاہِ نبویؐ میں یہ واقعہ پیش ہوا، تو آپ نے کسی فریق کو عتاب نہیں فرمایا بلکہ دونوں کی تصویب فرمائی۔ کیونکہ دونوں منشأ نبویؐ کی تعمیل میں کوشاں تھے۔

اس واقعہ میں ایک فریق نے اگرچہ ظاہر حدیث کے خلاف کیا مگر وہ دیگر نصوص شرعیہ اور قواعد کلیہ کے پیش نظر ایسا کرنے پر مجبور تھا اس لئے ان کا عذر یہ نہیں تھا کہ انہیں حدیث نہیں پہنچی تھی کیونکہ حدیث تو انہوں نے خود اپنے کانوں سے سنی تھی۔ البتہ ان کے مدارک اجتہاد کی دقت و گہرائی انہیں ظاہر حدیث پر عمل کرنے سے مانع تھی ـــــ اسی سے ائمہ مجتہدین کے مدارک اجتہاد کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ناواقف ان پر طعن کریں گے کہ انہوں نے حدیث کی کیوں مخالفت کی، مگر جن لوگوں کو حق تعالیٰ شانہٗ نے فہم و بصیرت عطا فرمائی ہے وہ جانتے ہیں کہ انہوں نے حدیث کے ظاہری الفاظ پر اگرچہ عمل نہیں کیا۔ مگر منشأ نبوی کی تعمیل انہوں نے اصحاب ظواہر سے بڑھ کر فرمائی ہے۔

دوسرا سبب: کسی علت کی وجہ سے حدیث کا ثابت نہ ہونا:

شیخ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

"دوسرا سبب یہ ہے کہ حدیث تو اس کو پہنچی، لیکن یہ حدیث اس کے نزدیک ثابت نہیں تھی۔ کیونکہ اسناد کے راویوں میں سے کوئی راوی اس کے نزدیک مجہول یا متہم۔ یا سیئ الحفظ تھا۔" (ص ۲۵)

اس کی مزید تفصیل ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

وهذا ايضا كثيرٌ جداً وهو من التابعين الى الائمة المشهورين (ر) من بعدهم اكثر من العصر الاول او كثير من القسم الاول۔ (ص۲۶)	اور یہ سبب بھی بہت ہی زیادہ ہے۔ اور یہ تابعین سے لے کر ائمہ مشہورین تک اور ان کے بعد کے حضرات تک بہ نسبت زمانۂ اول کے زیادہ ہے، یا قسم اول کی نسبت زیادہ ہے ـــ

تیسری اور چوتھی صدی کے محدثینؒ نے احادیث کے نقد و تنقیح اور راویوں کی جرح و تعدیل کے لئے جو اصول مقرر فرمائے ہیں ان کی روشنی میں بہت سی وہ احادیث و روایات محدثین متاخرین کے

تسكن نفس غير المجتهد من
لم يخبر امر الراوي بنفسه الى
ما اجتمع عليه الاكثر اما
المجتهد في اعتبار الشرط
وعدمه والذي
خبر الراوي فلا يرجع
الا الى رأي نفسه
.... فان وصف
الحسن والصحيح والضعيف
انما هو باعتبار السند
ظناً - اما في الواقع
فيجوز غلط الصحيح،
وصحة الضعيف - الخ

(فتح القدير ص۳۱۸ ج ۱)

وہ اس مجتہد کے نزدیک اس روایت
کی منکر کی ہوگی جس میں وہ شرط پائی جاتی
ہے ـــــ یہی صورت اس وقت ہوگی
جب کہ ایک شخص ایک راوی کو ضعیف
سمجھے اور دوسرا اس کو ثقہ کہے، ہاں! جو
شخص خود مجتہد نہیں، اور جو راوی سے
ذاتی واقفیت نہیں رکھتا اس کا دل
اس قول سے مطمئن ہوگا جس کے اکثر
لوگ قائل ہوں۔ لیکن جو شخص کسی شرط
کے معتبر ہونے یا نہ ہونے میں خود مجتہد ہے
اور جو راوی کے حال سے خود واقف
ہے وہ کسی دوسرے کی رائے کی طرف
رجوع نہیں کرے گا......... کیونکہ
کسی حدیث کو حسن، صحیح اور ضعیف
کہنا سند کے پیش نظر غلبۂ ظن کی وجہ
سے ہوتا ہے۔ لیکن واقع کے اعتبار
سے ممکن ہے کہ جسے صحیح کہا گیا ہے وہ غلط
ہو۔ اور جسے ضعیف کہا گیا ہے وہ صحیح ہو۔

شیخ ابن ہمام رح کی اس عبارت سے معلوم ہوا کہ صحیح بخاری یا صحیح مسلم کے بعض راویوں پر اگر بعض محدثین نے جرح کی ہے تو یہ امام بخاری رح و مسلم رح پر حجت نہیں ـــــ کیونکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ دیگر حضرات کے نزدیک یہ راوی متکلم فیہ ہیں تو ہوا کریں مگر امام بخاری رح و مسلم رح کے نزدیک وہ لائق اعتماد ہیں، اس لئے شیخین کے نزدیک ان کی روایت صحیح ہے۔ اسی حیثیت سے انہوں نے یہ

روایات لی ہیں۔

یہاں سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ اگر کوئی مجتہد کسی مسئلہ میں کسی روایت سے تمسک کرتا ہے تو اس روایت سے اس کا تمسک کرنا ہی اس روایت کی تصحیح یا تحسین ہے۔ دوسرے لوگوں کے نزدیک اگر وہ روایت صحیح یا مقبول نہیں تو دوسروں کا قول اس پہ حجت نہیں، جیسا کہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی احادیث پہ کلام کرنے والوں کا قول امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ پہ حجت نہیں۔ ان دونوں بزرگوں نے جن احادیث کو اپنی کتابوں میں لیا ہے وہ ان کے نزدیک صحیح ہیں۔ دوسروں کے نزدیک اگرچہ متکلم فیہ ہوں ــــــــ ٹھیک اسی اصول پہ امام ابوحنیفہؒ، امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ نے جن احادیث کو لیا ہے اور ان سے تمسک فرمایا ہے وہ ان کے نزدیک صحیح اور لائق احتجاج ہیں۔ اگر دیگر محدثینؒ کو ان پہ کلام ہے تو ان کے کلام کی حیثیت اختلافی نوٹ کی سی ہوگی جو مجتہد کے فیصلے پر اثر انداز نہیں ہوسکتا۔

اور یہاں ایک ضروری نکتہ یہ بھی پیش نظر رہنا چاہیئے کہ صحاح ستّہ کے مؤلفین، امام ابوحنیفہؒ کے مقلد نہیں، بلکہ یا تو خود مجتہد ہیں یا دیگر ائمہ اجتہاد کے مقلد ہیں، اس لئے یہ قدرتی امر ہے کہ ان کی کتابوں میں اپنے فقہی مسلک کا رنگ غالب ہوگا۔ چنانچہ امام بخاریؒ تو جس مسلک کو اختیار کر لیتے ہیں اسی کی دلیل ذکر کرتے ہیں، اور مخالف مسلک کی حدیث خواہ ان کی شرط پر بھی ہو اسے ذکر نہیں کرتے۔ بلکہ بسا اوقات اس حدیث کو خود اپنی کتاب میں روایت کرتے ہیں مگر متعلقہ باب میں اس کی طرف اشارہ بھی نہیں کرتے۔ اور دیگر ائمہؒ اگرچہ اکثر و بیشتر دونوں طرف کی احادیث ذکر کرتے ہیں، تاہم ان کی کتابوں میں غالب پہلو وہی نظر آتا ہے جو ان کے فقہی مسلک کے مطابق ہو۔ اس لئے صحاح ستّہ کی احادیث کو حرف آخر سمجھ کر ان کے پیش نظر ائمہ احنافؒ کے خلاف یکطرفہ فیصلہ کر دینا صحیح نہیں ہوگا۔

۸ ــــــــ تعاملِ سلف کی اہمیت

تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کے زمانے میں حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اور اکابر تابعینؒ کا تعامل کسی

مسئلہ میں حجت قاطعہ شمار ہوتا تھا، اور احادیث کی صحت وسقم کے لئے معیار کی حیثیت رکھتا تھا جو احادیث اکابر صحابہؓ و تابعینؒ کے تعامل کے خلاف ہوتیں انہیں شاذ، منسوخ یا مؤوّل سمجھا جاتا تھا یہی وجہ ہے کہ امام مالکؒ مؤطا میں جگہ جگہ تعامل اہل مدینہ کا حوالہ دیتے ہیں۔ اور جو احادیث اہل مدینہ کے تعامل کے خلاف ہوں انہیں غیر معمول بہا قرار دیتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ دوسری صدی میں احادیث کے جتنے مجموعے مرتب کئے گئے ان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے ساتھ حضرات صحابہؓ و تابعینؒ کا تعامل بھی ذکر کیا جاتا تھا ـــــ لیکن خیر القرون کے بعد چونکہ معیاری تعامل آنکھوں کے سامنے نہیں رہا تھا اس لئے احادیث کی صحت وسقم اور ان کے معمول بہا ہونے یا نہ ہونے کا مدار صرف سند کی صحت وضعف اور راویوں کی جرح وتعدیل پر رہ گیا اور روایات کے مقابلہ میں تعامل سلف کی اہمیت نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ یہاں تک کہ بعض لوگوں کو خیال ہونے لگا کہ ایک ایسی روایت جس کے راوی ثقہ ہوں ـــ۔ اس کے مقابلہ میں حضرات خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کا تعامل بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتا کسی۔ روایت کے راویوں کی ثقاہت وعدالت اور فہم ودیانت کو حضرات خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے تعامل پر ترجیح دے ڈالنا نہ صرف یہ کہ صحتمندانہ طرزِ فکر نہیں ہو سکتا، بلکہ اگر اسے رفض کا خفی شعبہ کہا جائے تو شاید بے جا نہ ہوگا۔ کیونکہ رفض کی حقیقت اس کے سوا کیا ہے کہ بعد کے راویوں کی روایات کے بھروسے حضرات صحابہ کرام اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کو نقض نبوی کی مخالفت سے مطعون کیا جائے۔

اول تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے حالات سے واضح ہے کہ انہوں نے (اپنی اپنی استعداد کے مطابق) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال واعمال اور احوال کو اپنے اندر ایسا جذب کر لیا تھا کہ ان کی سیرت جمالِ نبوی کا آئینہ بن گئی تھی۔ اور پھر وہ سُنت کے ایسے عاشق تھے کہ ان کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک سنت دنیا و مافیہا سے زیادہ قیمتی تھی، ادھر قرآن کریم میں ان کے راستہ کو "سبیل المؤمنین" کہہ کر ان کی اقتدا کا حکم فرمایا گیا ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ خصوصاً حضرات خلفائے راشدینؓ کی اقتدا کے بارے میں جو وصیتیں اور تاکیدیں فرمائی ہیں وہ سب کو معلوم ہیں، ان وجوہ کے پیش نظر سنت ثابتہ وہی ہے جس پر اکابر صحابہ کرامؓ و تابعینؒ کا تعامل رہا۔ اور

بھی اجتہادِ مطلق کے منصب سے محروم ہیں۔ حافظ ابن تیمیہؒ اور حافظ ابن القیمؒ معقولات و منقولات کے امام اور علم کے سمندر ہیں، اس کے باوجود امام احمد بن حنبلؒ کے مقلد ہیں۔ اور جن مسائل میں ان بزرگوں نے اپنے اجتہاد سے کوئی رائے قائم فرمائی ہے اسے بھی امت میں شرف قبول حاصل نہیں ہو سکا بلکہ انہیں "شاذ اقوال" کی فہرست میں جگہ ملی ہے؛ ہندوستان کی زرخیز سرزمین میں امام الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور ان کے جلیل القدر صاحبزادوں سے بڑھ کر علوم اسلامیہ کا امام اور اسرار الٰہیہ کا رمز شناس کون ہوا ہوگا، لیکن اجتہاد مطلق کا درجہ انکو بھی حاصل نہ ہو سکا خود حضرت شاہ صاحبؒ "فیوض الحرمین" میں لکھتے ہیں کہ تین باتیں میرے عندیہ اور میلان طبع کے قطعاً خلاف تھیں مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے میلان طبع کے علی الرغم مجھے ان کی تاکید و وصیت فرمائی:

وثانیہما الوصاۃ بالتقلید بہذہ المذاہب الاربعۃ لا اخرج منہا۔ والتوفیق ما استطعت. وجبلتی تأبی التقلید وتأنف منہ رأساً۔ ولکن شیٔ طلب منی التعبد بہ

ان تین امور میں سے دوسری بات ان مذاہب اربعہ کی تقلید کی وصیت تھی کہ میں ان سے خروج نہ کروں۔ اور جہاں تک ممکن ہو تطبیق کی کوشش کروں، میری سرشت تقلید سے قطعاً انکار اور عار کرتی تھی۔ لیکن یہ ایک ایسی چیز تھی جس کا مجھے اپنے

خلاف نفسی (فیوض الحرمین ترجمہ ص۶۴/۶۵ مطبع احمدی دہلی) مزاج کے علی الرغم پابند کیا گیا۔

اور یہ بھی شاہ صاحبؒ نے فیوض الحرمین ہی میں تحریر فرمایا ہے:

عرّفنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان فی المذہب الحنفی طریقۃ انیقۃ ہی اوفق الطرق بالسنۃ التی جمعت ونقحت فی زمان البخاری واصحابہ۔ (ص۴۸)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے پہچان کرائی کہ مذہب حنفی میں ایک بہت ہی عمدہ طریقہ ہے جو اس سنت سے قریب تر ہے جو امام بخاریؒ اور ان کے رفقاء کے زمانہ میں جمع اور منقح کی گئی۔

الغرض امام الہند شاہ ولی اللہؒ ایسی نابغہ شخصیت کو بھی اجتہاد مطلق کا مقام میسر نہیں آیا بلکہ انپر انکے مزاج کے قطعی خلاف مذاہب

کی تقلید کی پابندی عائد کی جاتی ہے ۔ اور جن چند مسائل میں حضرت شاہ صاحبؒ نے تفرد اختیار فرمایا انہیں شہرت میں تو کیا قبولِ عام نصیب ہوتا خود ان کے جلیل القدر صاحبزادوں اور ان کے خاندان میں بھی ان کو رواج اور فروغ میسر نہیں آیا ۔

اور یہ تو خیر گذشتہ صدیوں کے اکابر تھے خود ہمارے زمانہ میں حضرت امام العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیری نور اللہ مرقدہٗ کی زیارت سے مشرف ہونے والے حضرات تو اب بھی موجود ہیں حضرت شاہ صاحبؒ کو حق تعالیٰ نے جو علمی تبحر عطا فرمایا تھا اس کی نظیر ان کے ہمعصر علماء میں تو کیا، قرونِ سابقہ میں بھی خال خال ہی نظر آتی ہے ہمارے شیخ حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ فرمانے تھے کہ حضرت شاہ صاحبؒ سے کسی فن کا کوئی مسئلہ دریافت کیا جاتا تو ایسا محسوس ہوتا تھا گویا ساری عمر بس اسی ایک مسئلہ کی تحقیق میں گذری ہے ۔ پورا کتب خانہ گویا ان کے ذہن میں ہے ۔ اس بے نظیر وسعت مطالعہ، استحضار اور دقت نظر کے باوجود وہ خود ہی فرماتے ہیں :

میرے نزدیک فقہ سے مشکل کوئی فن نہیں ۔ چنانچہ میں تمام فنون میں اپنی مستقل رائے اور تجربہ رکھتا ہوں، جو چاہتا ہوں فیصلہ کرتا ہوں ۔ اہل فن کے اقوال میں سے جس کو چاہتا ہوں منتخب کر لیتا ہوں ۔ اور خود بھی رائے قائم کر لیتا ہوں ۔ لیکن فقہ میں مقلد محض ہوں ۔ اس میں نقل و روایت کے سوا میری کوئی رائے نہیں ۔" (فیض الباری ج ۱ ص ۱۹)

اور "نفحۃ العنبر" میں حضرتؒ کا ارشاد اس طرح نقل کیا ہے :

"میں فقہ کے سوا دیگر عقلی و نقلی فنون میں کسی امام کا مقلد نہیں ہوں ۔ ہاں! فقہ میں امام ابوحنیفہؒ کا مقلد ہوں، پس ہر علم و فن میں میری ایک مستقل رائے ہے سوائے فقہ کے ___ اور ایسا

---

[1] نفحۃ العنبر ص ۲۱ (طبع جدید) اور مقدمہ انوار الباری حصہ دوم ص ۲۱۲ (مطبوعہ مکتبہ حنفیہ گوجرانوالہ) سے اس سلسلہ کی ایک مثال نقل کرتا ہوں ۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے شیخ ابن ہمامؒ کی فتح القدیر (۸ جلدوں) کا مطالعہ تقریباً بیس دن میں فرمایا تھا کتاب الحج تک اسکی تلخیص بھی فرمائی تھی ۔ اور اس میں صاحب ہدایہ پر شیخؒ کے انتقادات کا جواب بھی لکھا تھا اس کے بعد دوبارہ کبھی فتح القدیر کے مطالعہ کی ضرورت نہیں ہوئی ۔ ایک بار تحدیث نعمت کے طور پر فرمایا :

"چھبیس سال ہوئے پھر مراجعت کی ضرورت نہیں پڑی ۔ اور جو مضامین اسکا بیان کرونگا اگر مراجعت کرو گے تفاوت کم پاؤ گے ۔"

اوقات جب میں ائمہ مجتہدین کے اقوال کی تخریج میں غور کرتا ہوں تو میری فکری پرواز مدارکِ اجتہاد کے ادراک سے قاصر رہتی ہے اور میں ائمہ اجتہاد کے مدارک کی دقت و گہرائی پر ششدر رہ جاتا ہوں۔" (ص ۹۹ طبع جدید)

پس جب یہ تمام اکابر اپنے تبحر علمی کے باوصف مجتہدین کی تقلید سے بے نیاز نہیں۔ تو دوسرا کون ہو سکتا ہے۔ اور سچی بات یہ ہے کہ اس زمانہ میں اکابر کے اعتماد و تقلید پر ہی عمل بالسنۃ کا مدار ہے۔ اور تقلید کے سوا کوئی چارہ کار نہیں اب خواہ کوئی امام اعظم ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ کی تقلید کرلے۔ یا بعد کے ایسے لوگوں کی جو علم و دانش، فہم و بصیرت۔ زہد و تقوی، طہارت قلب اور صفائے باطن میں ان اکابر کی گرد کو بھی نہیں پہنچتے ___ واللہ الموفق۔

۱۰ ___ ائمہ فقہا کا احترام

از خدا جوئیم توفیق ادب
بے ادب محروم گشت از فضل رب

حضرات صحابہؓ و اکابر تابعینؒ کے بعد حضرات ائمہ مجتہدین ___ امام اعظم ابوحنیفہ، امام دارالہجرت مالک بن انس، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ کے فضائل و مناقب اور امت پر ان کے احسانات سب سے بڑھ کر ہیں۔ عنایت ازلی نے ان کو دینِ قیم کی تبویب و تدوین کے لئے منتخب فرمایا۔ اور انہیں بعد کے تمام اولیائے امت کا سرخیل و سرگروہ بنا دیا۔

حق تعالیٰ شانہٗ کے کسی مقبول بندے سے عداوت و دشمنی اور اس کی شان میں گستاخی و بے ادبی بہت ہی سنگین جرم ہے، حدیث صحیح کے مطابق ایسے شخص کے خلاف حق تعالیٰ شانہٗ کی طرف سے اعلانِ جنگ ہے جو کسی مقبول بارگاہِ الٰہی کی بے ادبی کا مرتکب ہو۔ حق تعالیٰ شانہٗ بہت ہی غیور ہیں۔ اور جو شخص ان مقبولانِ الٰہی کی پوستین دری کرے، غیرت الٰہی اسے ہلاک کردیتی ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ اپنے بعض مقبول بندوں کی محبت و عداوت کو سنّت و بدعت اور ہدایت و ضلالت کی علامت بنا دیتے ہیں، انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد نوعِ انسانی میں کامل ترین فرد علی الترتیب حضرت ابوبکر صدیق

وعمر فاروق رضی اللہ عنہما ہیں۔ لیکن حق تعالیٰ شانہٗ کی حکمت ہے کہ ایک گروہ ان کی اور ان کے رفقا کی عداوت اور توہین وتنقیص کو اپنا دین وایمان سمجھتا ہے۔ اور ائمہ اربعہ میں سب سے اقدم واکمل امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ ہیں جنہیں اکابر امت نے "امام الائمہ" اور "امام اعظم" کا لقب دیا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ محرومان توفیق کا ایک طبقہ ان کی تخفیف شان اور اہانت وگستاخی کو سرمایۂ سعادت سمجھتا ہے۔ نہ پہلے گروہ کی عداوت سے شیخین رضؓ سے ان دونوں بزرگوں کا کچھ بگڑا اور نہ اس دوسرے گروہ کی عداوت وگستاخیوں سے امام ابوحنیفہؒ کے فضل وکمال ہی میں کوئی کمی آئی، بلکہ یقین ہے کہ ان اکابر کے درجات اس سے بلند ہوئے ہوں گے۔ البتہ اس کا صدمہ ہے کہ ان اکابر کی عداوت کتنے ہی لوگوں کو کھا گئی ـــــ

حضرت امام اعظمؒ کی جلالت قدر کا اندازہ ان امتیازی خصوصیات سے ہوتا ہے جو ائمہ اربعہ میں ان کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہوئیں، مثلاً

۱ ـــــ وہ باتفاق اہل نقل تابعی ہیں، اور انہوں نے بعض صحابہؓ کی زیارت سے مشرف ہوکر انوار صحابیت کو اپنی آنکھوں میں جذب کیا ہے۔ اور یہ سعادت ان کے سوا دیگر ائمہ کو نصیب نہیں ہوئی جس کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: "طوبیٰ لمن رآنی ولمن رأی لمن رآنی"۔

۲ ـــــ حضرت امامؒ پہلے شخص ہیں جنہوں نے علم شریعت کو کتب وابواب کی شکل میں مدون فرمایا ہے، اور ان کی اقتدا میں امام مالکؒ نے مؤطا لکھی۔

۳ ـــــ ان کے فیضان صحبت سے ایسے ائمہ کبار تیار ہوئے جن کی نظیر دوسرے اکابر کے تلامذہ میں نہیں ملتی۔ چنانچہ آپ کے سیرت نگاروں نے آپکے تلامذہ کی ایک طویل فہرست نقل کی ہے۔ جن میں اکثر ائمہ کبار ہیں۔ مثلاً مغیرہ بن مقسم الضبیؒ اور امام مالکؒ ایسے اکابر بھی آپ سے روایت کرتے ہیں۔ اور زکریا بن ابی زائدہ۔ مسعر بن کدام۔ سفیان ثوری۔ مالک بن مغول۔ یونس ابن ابی اسحاق۔ حفص بن غیاث۔ جریر بن عبدالحمید۔ عبداللہ بن المبارک۔ وکیع بن الجراح۔ یزید بن ہارون۔ مکی ابن ابراہیم۔ ابوعاصم النبیل۔ عبدالرزاق بن ہمام، ابویوسف القاضی۔ داود بن نصیر الطائی اور فضیل بن عیاض رحمہم اللہ ایسے اکابر کو حضرت امامؒ سے تلمذ کا شرف حاصل ہے ـــــ

غور فرمایا جائے کہ بعد کی اُمت کا کون شخص ہے جو حضرت امامؒ کے ان فیصلوں یا فتووں کا خوشہ چین نہیں۔

۴ ـــ اور حضرت امامؒ کا ایک اہم ترین امتیاز یہ ہے کہ ان کے فقہی مسائل محض ان کی ذاتی و انفرادی رائے نہیں، بلکہ فقہاء و محدثین۔ اور عباد اللہ الصالحین کی ایک بڑی جماعت نے غور و فکر اور بحث و تمحیص کے بعد ان کی منظوری دی ہے۔

شیخ ابن حجر المکیؒ "الخیرات الحسان" فصل دوم میں لکھتے ہیں:

"ایک شخص نے امام وکیع بن جراحؒ کی موجودگی میں یہ کہہ دیا کہ ابو حنیفہ نے غلطی کی ہے۔ امام وکیعؒ نے اسے ڈانٹ پلائی اور فرمایا جو شخص ایسی بات کہے وہ چوپاؤں کی مانند ہے۔ بلکہ ان سے بڑھ کر گم کردہ راہ ـــ وہ کیسے غلطی کر سکتے تھے، حالانکہ ان کے پاس امام ابو یوسفؒ اور امام محمد ایسے ائمہ فقہ موجود تھے، فلاں فلاں ائمہ حدیث موجود تھے۔ فلاں فلاں ائمہ لغت و عربیت موجود تھے۔ اور فضیل بن عیاضؒ اور داؤد الطائیؒ ایسے ائمہ زہد و ورع موجود تھے۔

ومن كان اصحابه هؤلاء	اور جس کے رفقاء یہ لوگ ہوں، وہ غلطی
لم يكن ليخطئ ـ	نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اگر وہ غلطی کرتا
لانه ان اخطأ ردوه للحق	تو یہ حضرات اسے ضرور حق کی طرف
(صـ ۲۷)	لوٹا دیتے۔

حضرت امامؒ کے علوم کتاب و سنت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں جس کی واضح دلیل یہ ہے کہ جرح و تعدیل کے امام یحییٰ بن سعید القطان، ـــ ان کے شاگرد یحییٰ بن معینؒ، الامام الثقۃ الثبت لیث بن سعدؒ، امام شافعیؒ کے استاذ امام وکیع بن جراح اور امام بخاریؒ کے استاذ کبیر امام مکی بن ابراہیم (رحمہم اللہ) ایسے جہابذۂ محدثین حضرت امامؒ کے قول پر فتویٰ دیتے تھے۔ اور امام عبداللہ بن المبارکؒ کو، جنہیں دربار علم سے امیر المؤمنین فی الحدیث کا خطاب ملا ہے، حضرت امامؒ سے تلمذ پر فخر تھا۔

مناسب ہے کہ حضرت امامؒ کے معاصرین اور بعد کے چند اکابر کے کچھ جملے حضرت امامؒ

کے حق میں نقل کر دیئے جائیں۔

۱ ـــ امام محمد بن سیرینؒ (م ۱۱۰ھ): حضرت امامؒ کے اس خواب کا ذکر قریباً سبھی نے کیا ہے کہ گویا آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کھول رہے ہیں۔ امام محمد بن سیرینؒ سے اس کا ذکر کیا گیا تو فرمایا "یہ شخص علوم نبوت کو پھیلائے گا" (مناقب ذھبی ص ۲۴)

۲ ـــ امام مغیرہ بن مقسم الضبیؒ (م ۱۳۶ھ): جریر بن عبد الحمیدؒ کہتے ہیں کہ موصوف نے مجھے تاکید فرمائی: امام ابو حنیفہؒ کی خدمت میں حاضری دیا کرو۔ فقیہ بن جاؤ گے۔ اور اگر ابراہیم نخعیؒ حیات ہوتے تو وہ بھی ان کی ہمنشینی اختیار کرتے" (مناقب ذھبی ص ۱۸)

۳ ـــ امام اعمش (سلیمان بن مہرانؒ م ۱۴۸ھ): حضرت امامؒ سے مسائل دریافت فرماتے تھے۔ اور آپ کی تحسین فرماتے تھے، ایک بار ان سے ایک مسئلہ دریافت کیا گیا تو فرمایا: "اس کا صحیح جواب تو ابو حنیفہؒ ہی دے سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ان کے علم میں برکت دی گئی ہے"۔ جریرؒ کہتے ہیں کہ امام اعمشؒ سے دقیق مسائل پوچھے جاتے تو حضرت امامؒ کے پاس بھیج دیتے۔ (مناقب ذھبی ص ۱۹)

۴ ـــ امام ابن جریج (عبد الملک بن عبد العزیزؒ (م ۱۵۰ھ) حضرت امامؒ کی وفات کی خبر سنکر فرمایا: "آہ! کیسا علم جاتا رہا (تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۱۴۸) اور ایک روایت میں ہے: "اللہ تعالیٰ ان پر رحمت فرمائے۔ ان کے ساتھ بہت سا علم جاتا رہا!" (مناقب ذہبی ص ۱۸)

۵ ـــ امام علی بن صالحؒ (م ۱۵۱ھ): حضرت امامؒ کی وفات پر فرمایا "عراق کا مفتی اور فقیہ چل بسا" (مناقب ذھبی ص ۱۸)

۶ ـــ امام مسعر بن کدامؒ (م ۱۵۳ھ) "مجھے کوفہ کے دو شخصوں کے سوا کسی پر رشک نہیں آتا۔ ابو حنیفہؒ پر ان کی فقہ میں۔ اور حسن بن صالحؒ پر ان کے زہد میں" (تاریخ بغداد ص ۳۴۸ ج ۱۳)

نیز فرماتے تھے: "اللہ تعالیٰ ابو حنیفہؒ پر رحمت فرمائے وہ بڑے فقیہ عالم تھے" (مناقب ذہبی ص ۱۸)

نیز فرماتے تھے: "ہم نے ابو حنیفہؒ کے ساتھ علم حدیث حاصل کرنا شروع کیا تو وہ ہم پر غالب آ گئے۔ ہم زہد میں مشغول ہوئے تو وہ ہم سے آگے نکل گئے، ہم نے ان کے ساتھ علم فقہ حاصل کرنا شروع کیا تو اس میں انہوں نے جو کارنامہ سرانجام دیا وہ تم دیکھ ہی رہے ہو" (مناقب ذھبی ص ۲۷)

۷ ـــــ امام اوزاعیؒ (عبدالرحمٰن بن عمرو م ۱۵۷ھ): "وہ پیچیدہ اور مشکل مسائل کو سب لوگوں سے زیادہ جانتے ہیں"۔ (مناقب کردری ص۹ج۱، تبییض الصحیفہ ص۲۸)

۸ ـــــ امام عبدالعزیز بن ابی رواد (م ۱۵۹ھ): "جو شخص امام ابو حنیفہؒ سے محبت رکھے وہ سُنی ہے۔ اور جو ان سے بغض رکھے وہ بدعتی ہے"۔ اور ایک روایت میں ہے: "ہمارے پاس لوگوں کے جانچنے کے لئے ابو حنیفہؒ معیار ہیں۔ جو ان سے محبت اور دوستی رکھے وہ اہل سنت میں سے ہے۔ اور جو ان سے بغض رکھے، ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ بدعتی ہے"۔ (الخیرات الحسان ص۳۲)

۹ ـــــ امام شعبہ بن الحجاجؒ (م ۱۶۰ھ): "اللہ کی قسم! امام ابو حنیفہؒ بہت عمدہ فہم اور جید حافظہ کے مالک تھے۔ لوگوں نے آپ پر ایسی باتوں میں طعن و تشنیع کی جن کو وہ ان لوگوں سے زیادہ جانتے تھے۔ اللہ کی قسم! یہ لوگ اپنی اس بدگوئی کی سزا خدا تعالیٰ کے یہاں پائیں گے"۔ امام شعبہؒ حضرت امامؒ کے حق میں بکثرت دعائے رحمت کیا کرتے تھے۔ (مناقب ذہبی ص۱۸، الخیرات ص۳۲)

۱۰ ـــــ امام داؤد بن نصیر الطائیؒ (م ۱۶۰ھ): "آپ ایک روشن ستارہ تھے جس سے راہرو رات کی تاریکیوں میں راستہ پاتا ہے۔ آپ کے پاس وہ علم تھا جس کو اہل ایمان کے قلوب قبول کرتے ہیں"۔ (الخیرات ص۳۲)

۱۱ ـــــ امام سفیان بن سعید الثوریؒ (م: ۱۶۱ھ): ایک شخص حضرت امامؒ کے پاس سے آیا تھا۔ امام ثوریؒ نے اس سے فرمایا: "تم روئے زمین کے سب سے بڑے فقیہ کے پاس سے آئے ہو"۔ نیز فرمایا: "جو شخص حضرت امامؒ کی مخالفت کرتا ہے اسے اس کی ضرورت ہے کہ علو مرتبت اور وفور علم میں آپ سے بڑھ کر ہو۔ لیکن بعید ہے کہ کوئی ایسا بن کر دکھائے"۔ (الخیرات ص۲۹)

۱۲ ـــــ امام دارالہجرت مالکؒ بن انس (م: ۱۷۹ھ): حضرت امامؒ کے بارے میں فرمایا: "سبحان اللہ میں نے ان جیسا آدمی نہیں دیکھا"۔ نیز فرمایا: "اگر وہ اس ستون کے بارے میں دعویٰ کریں کہ سونے کا ہے تو اسے دلیل سے ثابت کر دیں گے"۔ (الخیرات ص۲۸)

۱۳ ـــــ امام عبداللہ بن المبارکؒ (م: ۱۸۱ھ) حضرت امامؒ کے مایۂ ناز شاگرد ہیں۔ اور آپ کی مدح و توصیف میں ان کے بہت اقوال ہیں ـــ فرماتے تھے: "لوگ جب حضرت امامؒ کا ذکر بُرائی

سے کرتے ہیں تو مجھے بہت ہی صدمہ ہوتا ہے۔ اور مجھے اندیشہ ہوتا ہے کہ ان پر اللہ کا غضب ٹوٹ پڑے گا۔" (مناقب ذہبی ص۲۲) نیز فرماتے تھے: "اگر اللہ تعالیٰ، امام ابو حنیفہؒ اور سفیانؒ کے ذریعہ میری دستگیری نہ کرتا تو میں بدعتی ہوتا۔" (مناقب ذہبی ص۱۸)

۱۴ ۔۔۔ امام حفص بن غیاثؒ (م ۱۹۵ھ): "حضرت امام ابو حنیفہؒ کا کلام بال سے زیادہ باریک ہے، اور اس میں عیب چینی صرف جاہل ہی کر سکتا ہے۔" (مناقب ذہبی ص۲۰)

۱۵ ۔۔۔ امام وکیع بن الجراحؒ (م ۱۹۶ھ): "میں نے حضرت امامؒ سے زیادہ فقیہ اور ان سے اچھی نماز پڑھنے والا کسی کو نہیں دیکھا۔" (الخیرات الحسان ص۱۳) یحییٰ بن معینؒ فرماتے ہیں: "میں نے کسی کو نہیں دیکھا جسے وکیع بن جراح پر ترجیح دوں۔ اور وہ امام ابو حنیفہؒ کے قول پر فتویٰ دیتے تھے۔ اور ان کی احادیث کے حافظ تھے۔ انہوں نے حضرت امامؒ سے بہت زیادہ احادیث سنی تھیں۔" (جامع بیان العلم، ابن عبد البر ص۱۴۹ ج۲)

۱۶ ۔۔۔ امام سفیان بن عیینہ (م: ۱۹۸ھ) "میری آنکھوں نے ابو حنیفہؒ جیسا شخص نہیں دیکھا۔" (مناقب ذہبی ص۱۹) "دو چیزوں کے بارے میں میرا خیال تھا کہ وہ کوفہ کے پل سے پار بھی نہیں جائیں گی۔ مگر وہ تو زمین کے آخری کناروں تک پہنچ گئیں۔ ایک حمزہ کی قراءت اور دوسری ابو حنیفہؒ کی فقہ۔" ۔۔۔ (تاریخ بغداد ص۳۴۷ ج۱۳، مناقب ذہبی ص۲۰)

۱۷ ۔۔۔ امام عبد الرحمٰن بن مہدیؒ (م ۱۹۸ھ): "میں ناقل حدیث ہوں ۔۔۔ سفیان ثوریؒ علماء کے امیر المؤمنین ہیں۔ سفیان بن عیینہ امیر العلماء ہیں۔ شعبہ حدیث کی کسوٹی ہیں۔ عبد اللہ بن مبارکؒ حدیث کے صراف ہیں۔ یحییٰ بن سعید القطان قاضی العلماء ہیں۔ اور ابو حنیفہؒ علماء کے قاضی القضاۃ ہیں۔ جو شخص تم سے اس کے علاوہ کچھ اور کہے اسے بنو سلیم کے کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دو۔"

(مناقب موفق ص۲۵ ج۲)

۱۸ ۔۔۔ امام یحییٰ بن سعید القطانؒ (م ۱۹۸ھ): "ہم اللہ کے سامنے جھوٹ نہیں بولتے (یعنی خدا گواہ ہے کہ) ہم نے امام ابو حنیفہؒ سے اچھی رائے کسی کی نہیں سنی۔ اور ہم نے ان کے اکثر اقوال کو لیا ہے۔" (تاریخ بغداد ص۳۴۵ ج۱۳، مناقب ذہبی ص۱۹)

۱۹ —— علی بن عاصم الواسطیؒ (م ۲۰۱ھ) : "اگر امام ابوحنیفہؒ کی عقل کا نصف اہل زمین کی عقل
سے موازنہ کیا جائے تب بھی حضرت امامؒ کا پلہ بھاری رہے گا" (مناقب ذھبی ص۲۳)
نیز فرماتے تھے: "اگر امام ابوحنیفہؒ کا علم ان کے اہل زمانہ کے علم سے تولا جائے تو امام کے علم کا
پلہ بھاری ہوگا" (مناقب ذھبی ص۲۰)

۲۰ —— امام شافعی (محمد بن ادریسؒ) (م ۲۰۴ھ) : "لوگ فقہ میں امام ابوحنیفہ کے عیال ہیں"
(مناقب ذھبی ص۱۹) "جو شخص فقہ میں تبحر حاصل کرنا چاہتا ہے وہ امام ابوحنیفہؒ کا محتاج ہے" "امام ابوحنیفہؒ
فقہ کے لئے موفق تھے" "جو شخص فقہ میں معرفت حاصل کرنا چاہتا ہو وہ امام ابوحنیفہؒ
کے اصحاب کو لازم پکڑے" (تاریخ بغداد ج۱۳ ص۳۴۶) "لوگ علم کلام میں امام ابوحنیفہؒ کے خوشہ چین
ہیں" (تاریخ بغداد ج۱۳ ص۱۶۱) "امام شافعیؒ نے ایک بار حضرت امامؒ کی قبر کے پاس صبح کی نماز پڑھی تو
اس میں قنوت نہیں پڑھی۔ وجہ دریافت کی گئی تو فرمایا: "اس صاحب قبر کا ادب مانع ہوا" (الخیرات ص۹۴)

۲۱ —— امام نضر بن شمیلؒ (م ۲۰۴ھ) : "لوگ علم فقہ سے خواب میں تھے۔ امام ابوحنیفہؒ نے
فقہ کی شرح و تفصیل کرکے انہیں بیدار کر دیا" (الخیرات ص۳۱)

۲۲ —— امام یزید بن ہارونؒ (م ۲۰۶ھ) : "میں نے جن لوگوں کو دیکھا ہے ان میں ابوحنیفہؒ سے بڑا
فقیہ کسی کو نہیں دیکھا" (مناقب ذھبی ص۱۸) "میں نے ابوحنیفہؒ سے بڑھ کر کوئی عاقل۔ افضل اور صاحب
ورع نہیں دیکھا" (مناقب ذھبی ص۲۹) "میں نے ان سے زیادہ حلیم نہیں دیکھا، ان کے پاس
فضیلت تھی۔ دین تھا۔ پرہیزگاری تھی۔ زبان کی حفاظت تھی۔ اور مفید کاموں کی طرف توجہ تھی" (الخیرات ص۳۵)

۲۳ —— امام عبداللہ بن داؤد الخریبی : م ۲۱۳ھ) : "اہل اسلام پر واجب ہے کہ اپنی نمازوں
میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کے لئے دعا کیا کریں" (تاریخ بغداد ج۱۳ ص۳۴۴، مناقب ذھبی ص۱۹)

۲۴ —— امام مکی بن ابراہیمؒ (م ۲۱۵ھ) : "حضرت امامؒ اپنے زمانے کے سب سے بڑے
عالم تھے" (تاریخ بغداد ج۱۳ ص۳۴۵، مناقب ذھبی ص۱۹)

۲۵ —— محدث عبیداللہ بن عائشہؒ : (۲۲۸ھ) ایک دفعہ انہوں نے حضرت امامؒ کی سند سے
ایک حدیث بیان فرمائی تو حاضرین میں سے کسی نے کہا نہیں ہمیں ان کی حدیث نہیں چاہیے۔ انہوں

نے فرمایا: "میاں! تم نے ان کو دیکھا نہیں۔ دیکھ لیا ہوتا تو تمہیں ان کی چاہت ہوتی۔ تمہاری اور ان کی حالت اس شعر کے مطابق ہے۔

اقلوا علیہم لا ابا لکم من اللوم او سدوا المکان الذی سدوا

(تمہارا ناس ہو جائے اس پر ملامت کم کرو، یا وہ کام کر کے دکھاؤ جو اس نے کہا کیا
(تاریخ بغداد ص ۳۴۷ ج ۱۳)

۲۶ ــــ امام جرح و تعدیل یحییٰ بن معین (م ۲۳۳ھ): حافظ ذہبی اپنے رسالہ "الرواۃ الثقات المتکلم فیہم بما لا یوجب ردھم" ص ۶ میں لکھتے ہیں کہ "ابن معین حنفیہ میں سے غالی قسم کے حنفی ہیں۔ اگرچہ محدث ہیں"۔ (ماتمس الیہ الحاجۃ لمن یطالع سنن ابن ماجہ ص ۱۶) فرمایا کرتے تھے: میرے نزدیک قراءت بس ہے تو حمزہ کی۔ اور فقہ امام ابوحنیفہ کی"۔ (تاریخ بغداد ص ۳۴۷ ج ۱۳)

۲۷ ــــ امام اہل سنت احمد بن محمد بن حنبل الشیبانی: (م ۲۴۱ھ) ابو بکر مروزی کہتے ہیں کہ میں نے امام احمد بن حنبل کو یہ فرماتے ہوئے خود سنا ہے کہ "ہمارے نزدیک امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی طرف خلق قرآن کے قول کی نسبت صحیح نہیں"۔ میں نے عرض کیا "الحمدللہ! اے ابو عبداللہ! وہ علم کے بلند مرتبہ پر فائز تھے"۔ امام احمد نے فرمایا "سبحان اللہ! وہ علم۔ ورع۔ زہد اور ایثار آخرت میں ایسے مقام پر فائز تھے جس پر کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ انہیں اس بات پر کوڑے لگائے گئے کہ ابوجعفر منصور کے دور حکومت میں قضا کے منصب کو قبول کر لیں، مگر انہوں نے کسی طرح قبول نہیں فرمایا"۔

(مناقب ذہبی ص ۲۷، الخیرات ص ۳۱)

۲۸ ــــ امام ابوداؤد (سلیمان بن الاشعث السجستانی (م ۲۷۵ھ): "اللہ تعالیٰ امام مالک پر رحمت فرمائے وہ امام تھے۔ اللہ تعالیٰ امام ابوحنیفہ پر رحمت فرمائے وہ امام تھے"۔ (مناقب ذہبی ص ۲۱)

۲۹ ــــ مؤرخ ابن الندیم (محمد بن اسحاق ــــ م ۳۸۵ھ): "بر و بحر، مشرق و مغرب اور دور و نزدیک میں جو علم ہے وہ آپ ہی کا مدون کردہ ہے۔ رضی اللہ عنہ"۔ (فہرست ابن ندیم ص ۲۹۹ھ)

۳۰ ــــ حافظ مغرب ابو عمر ابن عبدالبر المالکی (م ۴۶۳ھ):

"جن حضرات نے حضرت امام سے روایت لی ہے اور آپ کی توثیق کی ہے۔ اور آپ کی مدح و توصیف

فرمائی ہے وہ زیادہ ہیں بہ نسبت ان لوگوں کے جنہوں نے آپ پر نکتہ چینی کی ہے، اور جن محدثین نے آپ پر نکتہ چینی کی ہے، ان کا بیشتر اعتراض یہ ہے کہ آپ رائے اور قیاس سے بہت کام لیتے ہیں، اور آپ ارجاً کے قائل ہیں (یعنی اعمال کی نفی سے ایمان کی نفی نہیں ہوتی) ـــ داناؤں کا قول ہے کہ گذشتہ بزرگوں میں کسی شخصیت کے عبقری ہونے کی علامت یہ ہے کہ اس کے بارے میں دو متضاد انتہا پسندانہ رائیں ہوں۔ جیسے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بارے میں دو گروہ ہلاک ہوئے۔ ایک حد سے بڑھ کر دوستی کرنے والا۔ اور دوسرا حد سے بڑھ کر دشمنی کرنے والا اور حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا تھا کہ "تیرے بارے میں دو گروہ ہلاک ہوں گے۔ ایک محب مفرط۔ دوسرا مُبغض مفتری"۔ اور وہ عبقری شخصیتیں جو دین و فضل میں آخری حد تک پہنچ گئی ہوں ان میں لوگوں کی اسی طرح متضاد اور انتہا پسندانہ رائیں ہوا کرتی ہیں"۔

(جامع بیان العلم ص۱۴۹)

ـــــ امام حجۃ الاسلام ابوحامد محمد الغزالی الشافعیؒ (م ۵۰۵ھ): "اللہ کی قسم، اجوطالب، غالب، مدرک، مہلک۔ ضار اور نافع ہے اور جس کے سوا کوئی معبود نہیں، میرا عقیدہ یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اُمت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے معانی فقہ کے حقائق میں سب سے زیادہ غوطہ زن ہیں"۔

(امام غزالیؒ کا خط مندرجہ "فضائل الانام من رسائل حجۃ الاسلام"، مطبوعہ ایران ۱۳۲۳ھ ص۱۰۴۔ منقول از تعلیقات مقدمہ کتاب التعلیم ص۱۶۲ از مولانا محمد عبدالرشید نعمانی مدفیضہ ـــ)

حضرت امامؒ کے حق میں اکابر اُمت کے سیکڑوں بلکہ ہزاروں توصیفی کلمات میں سے یہ چند جملے نقل کئے ہیں۔ ان سے ہر منصف کو اندازہ ہو سکتا ہے کہ حضرت امامؒ زہد و ورع، خوف و خشیت، علم و فضل، دیانت و تقویٰ، عقل و دانش اور دیگر اوصاف خیر میں اپنے دور میں بھی (جو خیر القرون کا دور تھا) فائق الاقران تھے، بعد کی اُمت فقہ میں انہی کی خوشہ چین ہے۔ یہی راز ہے کہ حق تعالیٰ شانہ نے نصف سے زائد اُمت کو ان کی اقتدا پر جمع کر دیا ـــ اس کے باوجود جو لوگ ایسے مقبول بارگاہِ الٰہی سے سوءِظن رکھتے ہیں، ان کی حالت پر حسرت و افسوس کے سوا کیا عرض کیا جا سکتا ہے۔ امام ربانی مجدد الف ثانیؒ

کے الفاظ ہیں :

"وائے ہزار وائے از تعصبہائے باردِ ایشاں ، و از نظرہائے فاسد ایشاں ۔ بانی فقہ ابوحنیفہؒ است ، و سہ حصہ از فقہ او را مسلم داشتہ اند ۔ و در ربع باقی ہمہ شرکت دارند با وے ، در فقہ صاحب خانہ اوست ، و دیگراں ہمہ عیال وے اند ۔ ۔ ۔ باوجود التزام این مذہب مرا با امام شافعیؒ گویا محبت ذاتی است ، و بزرگ می دانم ، لہذا در بعضے اعمال نافلہ تقلید مذہب او می نمایم ۔ اما چہ کنم کہ دیگراں را با وجود وفور علم و کمال تقوی در جنب امام ابی حنیفہؒ در رنگ طفلاں می یابم ۔ والامر الی اللہ سبحانہ "

(مکتوبات امام ربانی ، دفتر دوم مکتوب ۵۵)

ترجمہ :- " افسوس ، ہزار افسوس ان کے تعصب بارد اور ان کی نظر فاسد پر فقہ کے بانی ابوحنیفہؒ ہیں ۔ اور علماء نے فقہ کے تین حصے آپ کے لئے مسلم رکھے ہیں ۔ اور باقی چوتھائی میں دوسرے حضرات آپ کے ساتھ شریک ہیں ۔ فقہ میں صاحب خانہ وہ ہیں ۔ اور دوسرے ان کے عیال ہیں ——— مذہب حنفی کے التزام کے باوجود امام شافعیؒ کے ساتھ مجھے گویا ذاتی محبت ہے اور ان کی عظمت و بزرگی کا قائل ہوں ۔ اس لئے بعض نفلی اعمال میں ان کے مذہب کی تقلید کرتا ہوں ۔ لیکن کیا کروں ، دوسرے حضرات کو وفور علم اور کمالِ تقوی کے باوجود امام ابوحنیفہؒ کے مقابلے میں بچوں کے رنگ میں پاتا ہوں "

اس بحث کے آخر میں مناسب ہے کہ حضرت مولانا میر محمد ابراہیم سیالکوٹیؒ (م ۱۳۷۵ھ) کی کتاب "تاریخ اہل حدیث" سے دو اقتباس نقل کر دئیے جائیں :

ایک زمانے میں موصوف کو حضرت امامؒ کے خلاف لکھنے کا کچھ خیال ہوا ۔ لیکن حق تعالیٰ شانہٗ نے ان کے دین و تقویٰ اور صفائے باطن کی برکت سے انہیں اس بلا سے محفوظ رکھا ۔ مولانا مرحوم خود لکھتے ہیں :

" اس مقام پر اس کی صورت یوں ہوئی کہ جب میں نے اس مسئلہ کے لئے کتب متعلقہ الماری سے نکالیں اور حضرت امام صاحبؒ کے متعلق تحقیقات شروع کی تو مختلف کتب کی

ورق گردانی سے میرے دل پر کچھ غبار آگیا جس کا اثر بیرونی طور پر یہ ہوا کہ دن دوپہر کے وقت جب سورج پوری طرح روشن تھا۔ یکایک میرے سامنے گھپ اندھیرا چھا گیا گویا " ظلمت بعضها فوق بعض " کا نظارہ ہو گیا۔ معاً خدا تعالیٰ نے میرے دل میں ڈالا کہ یہ حضرت امام صاحبؒ سے بدظنی کا نتیجہ ہے، اس سے استغفار کرو۔ میں نے کلماتِ استغفار دھرانے شروع کئے، وہ اندھیرے فوراً کافور ہو گئے۔ اور ان کے بجائے ایسا نور چمکا کہ اس نے دوپہر کی روشنی کو مات کر دیا۔ اس وقت سے میری امام صاحبؒ سے حسنِ عقیدت اور بڑھ گئی، اور میں اُن شخصوں سے، جن کو حضرت امام صاحبؒ سے حسنِ عقیدت نہیں ہے، کہا کرتا ہوں کہ میری اور تمہاری مثال اُس آیت کی مثال ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ منکرینِ معارجِ قدسیہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتا ہے :

" أفتمارونه على ما يرى " میں نے جو کچھ عالم بیداری و ہوشیاری میں دیکھا یا اس میں مجھ سے جھگڑا کرنا بے سود ہے " (تاریخ اہل حدیث صـ۴۲)

دوسری جگہ مشہور اہل حدیث عالم حضرت مولانا حافظ محمد عبدالمنان وزیر آبادیؒ کے حالات میں لکھتے ہیں :

" آپ ائمہ دین کا بہت ادب کرتے تھے۔ چنانچہ آپ فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص ائمہ دین اور خصوصاً امام ابوحنیفہؒ کی بے ادبی کرتا ہے اس کا خاتمہ اچھا نہیں ہوتا "

(تاریخ اہل حدیث صـ۴۳)

منقول از " مقام ابی حنیفہؒ " از مولانا محمد سرفراز خان صفدر مدظلہ صـ۱۲۸، ۱۲۹۔

حق تعالیٰ شانہٗ اس آفت سے ہر مسلمان کو محفوظ رکھے۔ اور سب کا خاتمہ بالخیر فرمائے : ۔

بس تجربہ کردیم دریں دیر مکافات
با دُرد کشاں ہر کہ درافتاد بر اُفتاد

ان تمہیدی نکات کے بعد اب سوالات کے جوابات عرض کرتا ہوں۔

سوال اول: کیا صحیحین کی روایت مقدم ہے؟

سوال:- متفق علیہ کی احادیث اگر دیگر کتب میں موجود کسی حدیث سے متصادم ہوں تو کسے ترجیح دینا چاہیے۔

جواب:- بعض شافعیہ نے یہ اصول ذکر کیا ہے کہ صحیحین کی روایت زیادہ صحیح ہے۔ پھر بخاری کی پھر مسلم کی، پھر جو دونوں کی شرط پر مشتمل ہو۔ پھر جو ان میں سے ایک کی شرط پر مشتمل ہو۔ پھر جس میں صحت کی عام شرائط پائی جائیں۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ اصول محل نظر ہے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ غیر صحیحین کی روایت صحیحین کی روایت سے اصح ہو۔ یا اس کے مساوی ہو۔ شیخ ابن ہمامؒ فتح القدیر (ج ۱ ص ۳۱۷ باب النوافل) میں لکھتے ہیں۔

وکون معارضه فی البخاری لا
یستلزم تقدیمه بعد اشتراکهما
فی الصحة. بل یطلب الترجیح
من خارج. وقول من قال:
اصح الاحادیث ما فی الصحیحین
ثم ما انفرد به البخاری ثم
ما انفرد به مسلم. ثم ما اشتمل
علی شرطهما من غیرهما ثم
ما اشتمل علی شرط احدهما
تحکم لا یجوز التقلید فیه.
اذ الاصحیة لیس الا لاشتمال رواتها
علی الشروط التی اعتبراها
فاذا فرض وجود تلک
الشروط فی رواة حدیث
فی غیر الکتابین
افلا یکون الحکم

اور اس حدیث کی معارض حدیث کے بخاری میں ہونے سے لازم نہیں آتا کہ بخاری کی روایت مقدم ہو۔ جب کہ دونوں صحت میں مشترک ہیں۔ بلکہ ترجیح خارج سے تلاش کی جائے گی۔ اور جس شخص نے یہ کہا کہ صحیحین کی روایت زیادہ صحیح ہے پھر بخاری کی، پھر مسلم کی، پھر جو دونوں کی شرائط پر مشتمل ہو۔ پھر جو ان میں سے ایک کی شرائط پر مشتمل ہو۔" اس کا قول محض سینہ زوری ہے۔ جس کی تقلید جائز نہیں۔ کیونکہ زیادہ صحیح ہونے کا سبب اس کے سوا کیا ہے کہ وہ حدیث اُن شرائط پر مشتمل ہے۔ جو بخاری و مسلم نے اپنے راویوں میں ملحوظ رکھی ہیں۔ پس جب ان ہی شرائط کا وجود کسی ایسی حدیث میں فرض کیا جائے جو ان دونوں کتابوں کے علاوہ کسی اور کتاب میں

بالصحة ما في الكتابين عين
الحكم ثم حكمهما
او حكم احدهما
بان الراوي المعين
مجتمع تلك الشروط
ليس مما يقطع فيه
بمطابقة الواقع
فيجوز كون الواقع خلافه۔

ہو اس صورت میں ان دونوں کتابوں کی
روایت کو اصح کہنا محض سینہ زوری نہیں
تو اور کیا ہے۔
پھر بخاری و مسلم کا یا ان میں سے کسی ایک
کا کسی خاص راوی کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا
کہ اس میں یہ سب شرائط پائی جاتی ہیں
ایسی چیز نہیں جو قطعی طور پر واقع کے مطابق
بھی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ واقعہ اس کے خلاف ہو۔

یہاں یہ امر بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ ائمہ مجتہدین (امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ) کا زمانہ مؤلفین صحاح ستہ سے مقدم ہے۔ اس لیے صحیحین کی روایت کے راجح ہونے یا ہونے کا سوال بعد کے لوگوں کے بارے میں تو پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن ائمہ مجتہدین کے حق میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ائمہ مجتہدین کے سامنے مرفوع، موقوف، مرسل احادیث اور صحابہ و تابعین کے فتاویٰ اور خیر القرون کے تعامل کا پورا ذخیرہ موجود تھا۔ انھوں نے ان تمام امور کی روشنی میں فقہی مسائل کو مدون کیا اور مختلف فیہ مسائل میں اپنے اپنے مدارک اجتہاد اور فہم و بصیرت کے مطابق بہتر سے بہتر پہلو کو اختیار کیا۔

محدثین کا منصب احادیث و روایات کو اسانید سے نقل کر دینا ہے۔ لیکن ان میں کون ناسخ ہے کون منسوخ — کون راجح ہے کون مرجوح، کس میں شرعی اصول و قاعدہ ذکر کیا گیا ہے اور کس میں استثنائی صورت مذکور ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ یہ وہ امور ہیں جن کی تنقیح فقہائے امت اور ائمہ اجتہاد کا منصب ہے۔ جس طرح ہم احادیث کی تصحیح و تحسین اور راویوں کی جرح و تعدیل میں محدثین کے محتاج ہیں۔ اسی طرح کتاب و سنت کے فہم و استنباط، متعارض نصوص کے درمیان توفیق و تطبیق اور ترجیح میں حضرات فقہائے امت کے محتاج ہیں۔

الغرض کسی حدیث کے اصح ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ معمول بہ بھی ہو۔ یا عمل کے اعتبار سے راجح بھی ہو۔ خود صحیح بخاری میں اس کی متعدد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ کہ حدیث صحیح بخاری میں موجود

ہے. لیکن امام بخاریؒ کا فتویٰ اس کے مطابق نہیں . اور کوئی عقلمند اس چیز کو دیکھ کر امام بخاریؒ کی جانب سے سوئے ظن میں مبتلا نہیں ہو سکتا. ٹھیک اسی طرح اگر ائمہ اجتہاد کسی صحیح حدیث کو نہیں لیتے تو یقیناً اس کی بھی کوئی وجہ ہوگی یہاں بھی سوئے ظن نہیں ہونا چاہیئے .

اور یہ امر بھی واضح ہے کہ امام بخاریؒ کا کسی حدیث کو اپنی کتاب میں درج کر دینا ہی امام بخاریؒ کی طرف سے اس کی تصحیح ہے . اسی طرح ائمہ مجتہدین جب کسی حدیث سے استدلال فرماتے ہیں تو یہ ان کی طرف سے حدیث کی تصحیح ہے . گو بعد کے لوگوں کو وہ حدیث کسی سند ضعیف سے پہنچی ہو .

سوال دوم : فاتحہ خلف الامام

س ۲ : قرآن کریم کی کوئی آیت اگر کسی حدیث نبوی سے متصادم ہو تو کسے اختیار کرنا چاہیئے .

(مثلاً قرآن مجید کی ایک آیت کا مفہوم یہ ہے کہ " جب قرآن پڑھا جائے تو خاموشی سے سنو "

اور حدیث مبارک کا مفہوم یہ ہے کہ جب سورۃ فاتحہ امام پڑھے تو تم بھی آہستہ پڑھ لو .

———— یہ پڑھنا امام کی آیت پر سکتہ کی حالت میں یا کہ امام کے سورۃ فاتحہ تلاوت کرنے کے بعد یا ساتھ ساتھ ہو یا نہ پڑھے . یا حدیث کے مطابق جس کا مفہوم ہے جو فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں ہوتی نیز اگر امام کا ہی فاتحہ تلاوت کرنا کافی ہے پھر دیگر ارکان کے لیے مقتدی کا اعادہ کیوں ضروری ہے . جیسے ثنا، تسبیحات ، تشہد درود وغیرہ ...)

ج ۲ : آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات طیبہ قرآن کریم کی شرح و تفسیر ہیں . اس لیے واقعہ اور نفس الامر کے اعتبار سے قرآن کریم اور حدیث صحیح کے درمیان تعارض بلکہ وہم ممکن ہی نہیں اگر بظاہر تعارض نظر آئے . (اور ان میں سے کسی ایک کا حکم منسوخ بھی نہ ہو) تو یہ دونوں میں سے کسی ایک کے مفہوم اور منشا کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہوگا . اور دونوں کے درمیان توفیق و تطبیق کی ضرورت ہوگی اور یہ بہت دقیق علم ہے . جس کے لیے غیر معمولی فہم و بصیرت اور قوتِ اجتہاد کی ضرورت ہے .

زیر بحث مسئلہ میں قرآن کریم اور احادیث طیبہ میں کوئی تعارض نہیں . کیونکہ قرآن کریم کی آیت ہے :

وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ   اور جب قرآن پڑھا جائے تو اس پر کان

وَأَنْصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (الاعراف ۲۰۴) اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔
نماز اور خطبہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ جیسا کہ امام ابن کثیرؒ نے اس آیت کے ذیل میں صحابہ کرامؓ میں سے حضرت ابن مسعود، ابوہریرہ، ابن عباس اور عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہم کے اور تابعین میں سعید بن جبیر، عطا بن ابی رباح، عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم، ابراہیم نخعی، شعبی، حسن بصری، ابن شہاب زہری، مجاہد، قتادہ، اور عبید بن عمیر رحمہم اللہ کے ارشادات نقل کیے ہیں۔ (دیکھئے تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۲۸۰/ ۲۸۰)

حافظ ابن تیمیہؒ اپنے فتاویٰ میں فرماتے ہیں۔

وقد استفاض عن السلف انها نزلت فی القراءة فی الصلوٰة وقال بعضهم فی الخطبة وذكر احمد بن حنبل الاجماع علی انها نزلت فی ذالک
(طبع قدیم ص ۱۴۳ طبع جدید ص ۲۶۹/ ۲۲)

اور سلف سے استفاضہ و شہرت کے ساتھ منقول ہے کہ یہ آیت قرأت فی الصلوٰۃ کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور بعض کا قول ہے کہ خطبہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور امام احمدؒ نے ذکر کیا ہے کہ اس پر اجماع ہے کہ یہ نماز اور خطبہ کے بارے میں نازل ہوئی۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

احدهما ما ذكره الامام احمد من اجماع الناس علی انها نزلت فی الصلوٰة وفی الخطبة وكذالك قوله "واذا قرأ فانصتوا"
(ص ۲۱۲/ ۲۲ — ص ۳۱۲/ ۲۳ ج)

ایک وہ جو امام احمدؒ نے ذکر کیا ہے کہ لوگوں کا اجماع ہے کہ یہ آیت نماز اور خطبہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اسی طرح ارشاد نبوی: "واذا قرأ فانصتوا" بھی ــــ

اور موفق ابن قدامہ "المغنی" میں لکھتے ہیں۔

قال احمد فی رواية ابی داؤد: اجمع الناس علی ان هذه الآية

ابوداؤد کی روایت ہے کہ امام احمدؒ نے فرمایا، لوگوں کا اس پر اجماع ہے کہ یہ آیت نماز کے بارے

...لت فی الصلوٰۃ ۔ (صفحہ ۳۶۳ ج ۱) میں نماز نہ ہوئی۔

بذریعہ آیت کریمہ نماز باجماعت میں امام اور مقتدی دونوں کا الگ الگ وظیفہ مقرر کرتی ہے کہ امام کا وظیفہ قرأت ہے۔ اور مقتدی کا وظیفہ امام کی قرأت کی طرف متوجہ ہونا اور خاموش رہنا ——— اس نیت کی روشنی میں مقتدی کا وظیفہ خود قرأت کرنا نہیں بلکہ جس کے ذمہ یہ فرض عائد کیا گیا ہے کہ وہ خاموش رہ کر امام کی قرأت کی طرف متوجہ رہے۔ اسی سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ مقتدی کے ذمہ قرأت فرض نہیں ورنہ اسے خاموشی کا حکم نہ دیا جاتا۔ بلکہ قرأت کا فرض ادا کرنے کا حکم دیا جاتا۔ شیخ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

وذکر الاجماع علی انہ لا تجب القراءۃ علی المأموم حالۃ الجہر ——— (فتاویٰ)

اور امام احمد نے اس پر بھی اجماع نقل کیا ہے کہ امام جب جہری قرأۃ کرے تو مقتدی کے ذمہ قرأت واجب نہیں۔

موفق بن قدامہؒ نے اس کی تفصیل امام احمدؒ کے حوالے سے یوں نقل کی ہے:

قال احمد ما سمعنا احدا من اهل الاسلام يقول ان الامام اذا جهر بالقراءة لا تجزئ صلوٰة من خلفه اذا لم يقرأ. وقال هذا النبي صلى الله عليه وسلم واصحابه والتابعون وهذا مالك في اهل الحجاز وهذا الثوري في اهل العراق وهذا الاوزاعي في اهل الشام وهذا الليث في اهل مصر ما قالوا لرجل صلى وقرأ امامه ولم يقرأ هو صلوٰتك باطلة (المغنی صفحہ ۵۶۳ ج ۱)

امام احمد فرماتے ہیں کہ ہم نے اہل اسلام میں سے کسی کا یہ قول نہیں سنا کہ جب امام جہری قرأت کرے تو مقتدی کی نماز صحیح نہیں ہو گی جب کہ وہ خود قرأت نہ کرے۔ امام احمدؒ نے فرمایا: یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ وتابعینؒ ہیں۔ یہ اہل حجاز میں امام مالکؒ ہیں۔ یہ اہل عراق میں امام ثوریؒ ہیں۔ یہ اہل شام میں امام اوزاعیؒ ہیں۔ یہ اہل مصر میں امام لیثؒ ہیں ان میں سے کسی نے یہ فتویٰ نہیں دیا کہ جب امام قرأت کرے اور مقتدی قرأت نہ کرے تو مقتدی کی نماز باطل ہو جاتی ہے

الغرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ وتابعین اور ائمہ ہدیٰ نے اس آیت سے یہی سمجھا ہے کہ جب مقتدی کو خود قرأت کرنے کے بجائے امام کی قرأت کی طرف متوجہ ہونے اور خاموش رہنے کا حکم دیا گیا ہے تو اس سے آپ سے آپ یہ لازم آتا ہے کہ مقتدی کے ذمہ قرأت فرض نہیں بلکہ اس کا فریضہ امام کی قرأت کی طرف متوجہ ہونا اور خاموش رہنا ہے ۔ اور اسی سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ امام کی قرأت صرف اس کی اپنی ذات کے لیے نہیں بلکہ پوری قوم کی طرف سے ہے ، ورنہ مقتدیوں کو امام کی قرأت کے استماع والنصات کا حکم نہ دیا جاتا ۔ بلاشبہ قرأت نماز میں فرض ہے ، مگر مقتدی اس فرض کو خود اپنی زبان سے ادا نہیں کرے گا ۔ بلکہ اس کا یہ فرض امام کی زبان سے ادا ہوگا ۔ اور امام کی قرأت مقتدی ہی کی قرأت سمجھی جائے گی ۔

الغرض یہ تین مضامین ہیں جو اس آیت کریمہ میں ارشاد ہوئے ہیں :

اوّل :۔ مقتدی کا کام قرأت کرنا نہیں ۔ بلکہ امام کی قرأت کو سننا اور خاموش رہنا ہے

دوم :۔ قرأت مقتدی کے ذمہ فرض نہیں ۔ بلکہ یہ فرض اس کی جانب سے امام ادا کرے گا ۔

سوم :۔ امام کی قرأت تنہا اس کی اپنی ذات کے لیے نہیں بلکہ پوری قوم کی طرف سے ہے اس لیے امام کی قرأت مقتدی ہی کی قرأت ہے ۔

ان تین نکات کو خوب اچھی طرح ذہن میں رکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلّم کے ارشادات عالیہ پر غور فرمائیے تو وہاں بھی امام اور مقتدی کے تعلق میں انہی تین چیزوں کی تفصیل وتاکید نظر آئے گی ۔ چنانچہ :

۱ـــ صحیح مسلم میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے ۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خطبہ
وسلم خطبنا فبین لنا سنتنا	دیا ۔ پس ہمارے لیے ہمارا طریقہ کار
وعلمنا صلوتنا ۔ فقال :	واضح فرمایا ۔ اور ہمیں ہماری نماز سکھائی ۔
اذا صلیتم فاقیموا	چنانچہ آپ نے فرمایا جب تم نماز شروع
صفوفکم ۔ ثم لیؤمکم	کرو تو صفیں خوب اچھی طرح سیدھی
احدکم ۔ فاذا کبّر	کر لیا کرو ۔ پھر تم میں کا ایک شخص امام بنے

فکبروا. (و فی حدیث جریر عن سلیمان عن قتادۃ من الزیادۃ -) "واذا قرأ فانصتوا" واذا قال غیر المغضوب علیہم ولا الضالین فقولوا آمین یجبکم اللہ۔ فاذا رکع فارکعوا الحدیث

پس جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو (اور بروایت جریر عن سلیمان عن قتادہ اس حدیث میں یہ اضافہ ہے کہ) "اور جب وہ قرأت شروع کرے تو تم خاموش ہو جاؤ" اور جب وہ غیر المغضوب علیہم ولا الضالین کہے تو تم آمین کہو۔ اللہ تعالیٰ تمہاری دعا کو قبول کر لیں گے۔ پھر جب وہ رکوع کرے تو تم رکوع کرو۔ الخ

(صحیح مسلم ص۱۷۴ ج۱ باب التشہد نسائی ص۱۴۶ ج۱
ابوداؤد ص۱۴۰ ج۱ ابن ماجہ ص۶۱ مسند احمد ص۴۱۵ ج۴)

۲۔ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے ارشاد فرمایا:-

انما جعل الامام لیؤتم بہ۔ فاذا کبر فکبروا۔ واذا قرأ فانصتوا۔ واذا قال غیر المغضوب علیہم ولا الضالین فقولوا آمین۔ الخ

امام اسی لیے تو مقرر کیا جاتا ہے کہ اسکی اقتدا کی جائے۔ پس جب وہ تکبیر کہے تو تم تکبیر کہو۔ اور جب وہ قرأت کرے تو تم خاموش ہو جاؤ۔ اور جب وہ "غیر المغضوب علیہم ولا الضالین" کہے تو تم آمین کہو۔ الخ

(نسائی ص۱۴۶ ج۱، ابوداؤد ص۸۹ ج۱ ابن ماجہ ص۶۱)

یہ دونوں حدیثیں قرآن کریم کے ارشاد:
"اور جب قرآن پڑھا جائے تو اسپر کان دھرو۔ اور خاموش رہو" کی تشریح کرتی ہیں۔

اور ان میں چند امور لائق توجہ ہیں۔

اوّل:- یہ کہ ان احادیث میں اوّل سے آخر تک امام اور مقتدی کے فرائض و وظائف کا ذکر کیا گیا ہے اگر جس طرح یہ فرمایا کہ جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو۔ جب وہ رکوع کرے تم بھی رکوع کرو۔ الخ اسی طرح یہ نہیں فرمایا گیا کہ جب وہ سورۃ فاتحہ پڑھے تو تم بھی پڑھو۔

بلکہ اس کے برعکس یہ فرمایا گیا ہے کہ جب وہ قرأۃ شروع کرے تو تم خاموش رہو۔ پس اگر مقتدی کے ذمہ قرأت ہوتی تو ممکن نہیں تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کو ذکر نہ کرتے۔ اور یوں نہ فرماتے "واذا قرأ فاقرؤ و" کہ جب امام قرارت شروع کرے تو تم بھی قرأت کرو۔ پس امام کے وظیفہ قرأت کو ذکر کرنا۔ اور مقتدی کے حق میں اس کو ذکر نہ کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ قرأت امام کا وظیفہ ہے مقتدی کا نہیں۔

دوم :- پھر اسی پر اکتفا نہیں فرمایا جاتا۔ بلکہ صاف صاف یہ بھی فرمایا گیا ہے۔ کہ جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو۔ پس ایک طرف امام کے حق میں قرأت کا ذکر کرنا اور دوسری طرف امام کی قرأت کے وقت مقتدی کو خاموشی کا حکم دینا اس امر کی تصریح ہے کہ امام کی قرأت میں امام اور مقتدی دونوں شریک ہیں۔ اور یہ شرکت امام کی قرأت اور مقتدی کی خاموشی کے دو طرفہ عمل کی وجہ سے ہے۔ پس اگر مقتدی خاموشی اختیار نہ کرے بلکہ اپنی قرأت میں مشغول ہو جائے تو ایک تو وہ اپنے اس وظیفہ سے روگردانی کرنے والا ہوگا۔ جو قرآن کریم اور حدیث نبویؐ نے اس کیلئے متعین فرمایا ہے۔ یعنی استماع و انصات ۔۔۔ دوسرے ایسی حالت میں امام کی قرأت میں اس کی شرکت متصور نہیں ہو سکتی۔ جب کہ شارع کا مقصد اور مطمح نظر مقتدی کو امام کی قرآت میں شریک کرنا ہے۔

سوم :- یہ کہ مقتدی کو حکم دیا گیا ہے کہ جب امام غیر المغضوب علیہم ولا الضالین" کہے تو مقتدی آمین کہے۔ جس سے ایک تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ امام کی قرأت شروع ہونے کے بعد مقتدی کو پہلی بار سورۃ فاتحہ کے ختم پر بولنے کی اجازت دی گئی ہے۔ اس سے قبل اس کے لیے سوائے خاموشی کے کوئی وظیفہ مقرر نہیں کیا گیا۔ دوسرے یہ کہ مقتدی، امام کی فاتحہ پر آمین کہنے کے لیے اسی لیے مامور کیا گیا کہ سورۃ فاتحہ میں جو درخواست امام پیش کر رہا ہے وہ صرف اپنی طرف سے پیش نہیں کر رہا بلکہ پوری قوم کے نمائندہ کی حیثیت سے پیش کر رہا ہے اس لیے ختم فاتحہ پر تمام مقتدی آمین کہہ کر اس کی درخواست کی تائید کرتے ہیں۔ اگر یہ حکم ہوتا کہ امام اپنی فاتحہ پڑھے اور مقتدی اپنی اپنی پڑھیں تو اس طرح اجتماعی آمین کہنے کا حکم نہ دیا جاتا بلکہ ہر ایک کو اپنی اپنی فاتحہ پر آمین کہنے کا حکم ہوتا۔ پس جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امام اور مقتدی سب کو امام کی فاتحہ پر آمین کہنے کا حکم فرمایا تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ نماز باجماعت میں سورۃ فاتحہ پڑھ کر جو درخواست کی جاتی ہے وہ ہر ایک کی انفرادی درخواست نہیں بلکہ ایک وفد کی شکل...

میں اجتماعی درخواست ہے۔ امام اس وفد کا امیر ہے۔ اور وہی پوری قوم کی جانب سے متکلم ہے۔ اس لیے اس اجتماعی درخواست پر آمین بھی اجتماعی مقرر فرمائی گئی۔ ورنہ اگر ایک شخص کو معتمد علیہ نمائندہ بنا کر اجتماعی درخواست پیش کرنا منظور نہ ہوتا تو نماز باجماعت کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ ہر شخص اپنی انفرادی نماز میں انفرادی درخواست کر لیا کرتا۔ وہ جماعت جماعت نہیں کہلاتی اور نہ وہ وفد وفد کہلاتا ہے جس کا ایک امیر اور ایک متکلم نہ ہو۔ بلکہ ہر شخص انفرادی طور پر اپنی اپنی درخواست پیش کیا کرے۔

چہارم:- آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مقتدی کے فرائض کی تشریح کرتے ہوئے تمہیداً یہ ارشاد فرمایا ہے:

انما جعل الامام لیؤتم بہ :- امام اسی لیے مقرر کیا جاتا ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے۔

اس میں تعلیم دی گئی ہے کہ مقتدی کا کام امام کی اقتدا و متابعت کرنا ہے نہ کہ اس کی مخالفت اور متابعت اور مخالفت ہر رکن میں اپنی اپنی نوعیت کے لحاظ سے ہوگی۔ جب وہ تکبیر کہے تو تکبیر کہنا متابعت ہے۔ اس سے پہلے تکبیر کہہ لینا یا اس کی تکبیر پر تکبیر نہ کہنا مخالفت ہے۔ اسی طرح جب وہ رکوع کرے تب رکوع کرنا متابعت ہے اس سے پہلے رکوع کر لینا یا اس کے رکوع میں جانے کے باوجود مقتدی کا رکوع نہ کرنا اس کی مخالفت ہے۔ اور رکوع سے اٹھ کر جب وہ "سمع اللہ لمن حمدہ" کہے تو جواب میں "ربنا لک الحمد" کہنا متابعت ہے۔ اور وہی فقرہ جو امام نے کہا ہے اس کا دہرا دینا متابعت کے خلاف ہے۔ اسی طرح جب امام قرأت شروع کرے تو مقتدی کا اپنے ذکر اذکار بند کر کے امام کی قرأت کی طرف متوجہ ہو جانا متابعت ہے۔ اور امام کے مقابلہ میں اپنی قرأت شروع کر دینا مخالفت ہے۔ جس کو احادیث میں منازعت سے تعبیر فرمایا ہے۔

خلاصہ یہ کہ شریعت نے مقتدی کو امام کی اقتدا اور متابعت کا حکم دیا ہے۔ اور اسی متابعت اور اجتماعیت کی غرض سے نماز باجماعت مشروع کی گئی ہے۔ اور قرأت کے موقعہ پر امام کی متابعت یہی ہے کہ مقتدی امام کی قرأت کی طرف متوجہ رہے۔ اور خاموش رہے امام کے مقابلے میں خود اپنی قرأت شروع کر دینا متابعت نہیں۔ بلکہ مخالفت اور منازعت ہے۔ اس لیے حکم دیا گیا:

واذا قرأ فانصتوا ۔	اور امام جب قرأت شروع کرے تو خاموش ہو جاؤ ۔

دوم :۔ اور جب یہ معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مقتدی کو امام کی متابعت کا حکم فرمایا ہے اور اس متابعت کے ضمن میں اس کی قرأت کو سننے اور خاموش رہنے کا حکم دیا ہے تو اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ امام ہی کی قرأت مقتدی کے لیے بھی کافی ہے ۔ اس نکتہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صراحتہً بھی ارشاد فرمایا ہے ۔

عن جابر رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من کان لہ امام فان قراءۃ الامام لہ قراءۃ ۔	حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کا امام ہو پس امام کی قرأت اسی کی قرأت ہے ۔

(ابن ماجہ ص۶۱، مسند احمد ص۳۳۹/۳ ، موطا امام محمد ص۹۷ ، کتاب الآثار ص۲۰/۱)

یہ حدیث متعدد طرق سے مروی ہے ۔ بعض نے اس کو حضرت عبداللہ بن شدادؓ سے مرسلاً روایت کیا ہے ۔ اور بعض نے مسند متصل کے ساتھ ——— شیخ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں ۔

وثبت انہٗ فی ھذہ الحال قراءۃ الامام لہٗ قراءۃ ۔ کما قال ذالک جماھیر السلف والخلف من الصحابۃ والتابعین لھم باحسان ۔ وفی ذالک الحدیث المعروف عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہٗ قال: "من	اور یہ ثابت ہوا کہ اس حالت میں امام کی قرأۃ مقتدی کی قرأت ہے جیساکہ جماہیر سلف وخلف صحابہؓ وتابعینؒ اس کے قائل ہیں ۔ اور اس باب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معروف حدیث وارد ہے کہ آپؐ نے فرمایا: "جس کے لیے امام ہو تو امام کی قرأت اسی کی قرأت ہے ۔"

فكان له امام فقراءة الامام له قراءة۔ وهذا الحديث روى مرسلاً ومسنداً۔ لكن اكثر الائمة الثقاة رووه مرسلاً۔ عن عبد الله بن شداد عن النبي صلى الله عليه وسلم۔ واسنده بعضهم ورواه ابن ماجه مسنداً۔

وهذا المرسل قد عضده ظاهر القرآن والسنة وقال به جماهير اهل العلم من الصحابة والتابعين ومرسله من اكابر التابعين۔ ومثل هذا المرسل يحتج به باتفاق الائمة الاربعة وغيرهم وقد نص الشافعي على جواز الاحتجاج بمثل هذا المرسل (فتاوی ابن تیمیہ ص ۲۷۱/۲۷۲)

اور یہ حدیث مرسل اور مسند دونوں طرح روایت کی گئی ہے۔ لیکن اکثر ائمہ ثقات نے اس کو عبداللہ بن شداد سے اور انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مرسلاً روایت کیا ہے۔ اور بعض نے اس کو سند متصل سے روایت کیا ہے۔ ابن ماجہ نے اس کو مسند ذکر کیاہے۔

اور ظاہر قرآن و سنت اس مرسل کے مؤید ہیں۔ اور جماہیر اہل علم صحابہؓ و تابعین اسی کے قائل ہیں اور اس کو مرسل نقل کرنے والے اکابرین تابعین میں سے ہیں۔ اس قسم کی مرسل روایت سے ائمہ اربعہ اور دیگر اہل علم کے نزدیک بالاتفاق استدلال صحیح ہے۔ اور امام شافعیؒ نے اس قسم کی مرسل حدیث سے استدلال صحیح ہونے کی تصریح فرمائی ہے۔

حافظ ابن تیمیہؒ نے اس حدیث کی تصحیح کے سلسلہ میں جو کچھ فرمایاہے اس کی وضاحت چند نکات میں کرتا ہوں۔

اول :- اس کے ارسال و اتصال میں اختلاف ہے۔ اور جب طرق صحیحہ سے اسکا مسند و متصل ہونا ثابت ہے تو اتصال کو ترجیح ہوگی۔ چنانچہ مسند احمد، مسند احمد بن منیع۔ مسند عبد بن حمید، مؤطا امام محمد۔ اور شرح معانی الآثار طحاوی میں اس کے مسند و متصل طرق بروایت ثقات موجود ہیں۔

دوم:۔ اگر اکثر حفاظ کی روایت کے مطابق اس کو مرسل بھی فرض کیا جائے تب بھی ظاہر قرآن و سنت اس کا مؤید ہے۔ اس کی تفصیل اوپر کی سطور میں گزر چکی ہے۔

سوم:۔ جماہیر صحابہؓ و تابعینؒ کا فتویٰ اسی حدیث کے مطابق ہے چنانچہ:

۱۔ صحیح مسلم ص۲۱۵ میں عطا بن یسار سے مروی ہے کہ انہوں نے زید بن ثابتؓ سے قرأت مع الامام کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا۔

لا قراءة مع الامام فی شیئ	امام کے ساتھ کسی نماز میں قرأت نہیں۔

۲۔ سنن نسائی ص۱۴۶ ج۱ میں حضرت ابو الدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے:

سئل رسول الله صلى الله عليه وسلم افی کل صلوۃ قراءۃ؟ قال نعم. قال رجل من الانصار وجبت هذه. فالتفت الیّ وکنت اقرب القوم منه فقال. ما اری الامام اذا ام القوم الا قد کفاهم۔	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ کیا ہر نماز میں قرأت ہوتی ہے؟ فرمایا، ہاں۔ انصار میں سے ایک آدمی نے کہا۔ یہ تو واجب ہو گئی۔ پس آپؐ نے میری طرف التفات فرمایا اور میں آپؐ کے قریب تر بیٹھا تھا۔ پس فرمایا کہ امام جب کسی قوم کی امامت کرے تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ سب کی طرف سے کافی ہے۔

امام نسائیؒ نے اس حدیث کو نقل کرکے فرمایا ہے کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نہیں بلکہ ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ لیکن مجمع الزوائد ص۱۱۰ ج۲ میں بروایتِ طبرانی یہ حدیث مرفوعاً مروی ہے۔ اور امام ہیثمی فرماتے ہیں کہ اس کی اسناد حسن ہے

۳:۔ ترمذی ص۴۲ ج۱ میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

من صلى ركعة لم يقرأ فيها بام القرآن فلم يصل الا ان يكون وراء الامام۔	جس نے نماز پڑھی اور اس میں سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی اس نے گویا نماز ہی نہیں پڑھی۔ الا یہ کہ امام کے پیچھے ہو۔

امام ترمذیؒ نے اس کو حسن صحیح کہا ہے۔ اور امام طحاویؒ نے شرح معانی الآثار میں اس کو مرفوعاً نقل کیا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھئے امانی الاخبار (ص۲۴۶ ج۱)۔

۴ :۔ امام ابن کثیرؒ نے ابن جریر کی سند سے نقل کیا ہے۔

صلی ابن مسعود رضی اللہ عنہ فسمع ناسا یقرؤن مع الامام۔ فقال اما ان لکم ان تفقھوا، اما ان لکم ان تعقلوا واذا قرئ القرآن فاستمعوا لہ وانصتوا کما امرکم اللہ ۔ (تفسیر ابن کثیر ص۲۸۱ ج۲)	ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ نے نماز پڑھی تو کچھ لوگوں کو سنا کہ وہ امام کے ساتھ قرأت کرتے ہیں۔ فرمایا۔ کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ تم فہم حاصل کرو؟ کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ تم سمجھو۔ اور جب قرآن پڑھا جائے تو اسکی طرف کان دھرو اور خاموش رہو جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو اس کا حکم دیا ہے۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے قرأت خلف الامام کی ممانعت مختلف طرق اور مختلف الفاظ میں وارد ہے۔

۵ :۔ موطا امام مالک میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

کان اذا سئل ھل یقرأ احد خلف الامام قال اذا صلی احدکم خلف الامام فحسبہ قراءۃ الامام واذا صلی وحدہ فلیقرأ قال وکان عبد اللہ بن عمر لا یقرأ خلف الامام۔ (ص۲۹)	حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے جب دریافت کیا جاتا کہ کیا امام کی اقتداء میں قرأت کی جائے تو فرماتے کہ جب تم میں سے کوئی شخص امام کے پیچھے نماز پڑھے تو اس کو امام کی قرأت کافی ہے۔ اور جب تنہا پڑھے تو قرأت کرے۔ نافعؒ کہتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما امام کے پیچھے قرأت نہیں کیا کرتے تھے۔

ان کے علاوہ متعدد صحابہؓ و تابعینؒ کے فتاویٰ موطا امام محمدؒ۔ کتاب الآثار۔ شرح معانی الآثار طحاوی۔ مصنف عبد الرزاق اور مصنف ابن ابی شیبہ وغیرہ میں موجود ہیں۔

سوم :۔ تیسرا نکتہ شیخ ابن تیمیہؒ نے یہ ذکر کیا ہے کہ اس مرسل روایت کا سلسلہ سند صحابی کے بجائے طبقہ علیا کے تابعی پر ختم ہوتا ہے۔ جو اکثر و بیشتر صحابہ کرامؓ سے روایت کرتے ہیں، چنانچہ یہاں مرسل روایت حضرت عبداللہ بن شدادؒ سے مروی ہے۔ جن کی ولادت آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے زمانہ میں ہوئی۔ اس لیے ان کا شمار صغیر السن صحابہؓ میں ہوتا ہے، اور علمی طبقہ کے لحاظ سے ان کو کبار تابعین میں شمار کیا جاتا ہے، اس لیے ان کی مرسل حدیث کی حیثیت ایک اعتبار سے مراسیل صحابہؓ کی ہے جو بالاتفاق حجت ہیں۔ اور چونکہ انکی بیشتر احادیث حضرات صحابہ کرامؓ سے ہیں اس لیے یہ حدیث بھی انہوں نے کسی صحابی سے سنی ہو گی۔ خصوصاً جب کہ بعض طرق صحیحہ میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا واسطہ بھی مذکور ہے۔

الغرض ان متعدد دلائل و شواہد کی روشنی میں حدیث: "من کان له امام فقراۃ الامام له قراءۃ" بلاشک و شبہ صحیح اور حجت ہے۔ قرآن کریم، احادیث نبویہؐ اور فتاوی صحابہؓ سے مؤید ہے امام احمدؒ ایسے ائمہ اعلام نے اس سے استدلال کیا ہے۔ اس لیے حنفیہ اور جمہور ائمہ، امام ہی کی قرأت کو مقتدی کے لیے کافی سمجھتے ہیں۔ اور بحکم قرآن و حدیث، امام کی قرأت کے وقت مقتدی کے خاموش رہنے کو واجب جانتے ہیں۔

فاتحہ خلف الامام کے دلائل :۔

اور سوال میں جو ذکر کیا گیا ہے: "اور حدیث مبارک کا مفہوم یہ ہے کہ جب سورہ فاتحہ امام پڑھے تو تم بھی آہستہ پڑھو"

ذخیرہ احادیث میں کوئی حدیث ایسی نہیں جس میں مقتدی پر فاتحہ کی قرأۃ واجب ٹھہرائی گئی ہو۔ اور یوں بھی یہ بات عقلاً مستبعد ہے کہ ایک طرف قرآن کریم اور احادیث شریفہ میں مقتدی کو خاموش رہنے اور امام کی قرأت سننے کا حکم دیا گیا ہو اور دوسری طرف عین امام کی قرأت کے وقت اسے سورۂ فاتحہ پڑھنے کا حکم بھی دیا جائے۔ ایک طرف امام کی قرأت کو بعینہٖ مقتدی کی قرأت فرمایا گیا ہو اور پھر مقتدی کے ذمہ بھی قرأت کو واجب ٹھہرایا گیا ہو ——— البتہ اس مضمون کی احادیث ضرور مروی ہیں کہ بعض حضرات نے از خود آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلّم کے پیچھے قرآت شروع کر دی جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نکیر فرمائی۔ اور پھر بعض روایات کے مطابق سورۂ فاتحہ پڑھنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

ذیل میں ہم ان احادیث پر غور کر کے شارع کے مقصد و مدّعا کو سمجھنے کی کوشش کریں گے ۔

حدیث : لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب :-

جو حضرات فاتحہ خلف الامام کا حکم کرتے ہیں صحت کے اعتبار سے ان کی سب سے قوی دلیل حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب۔ متفق علیہ — وفی روایۃ لمسلم — لمن لم یقرأ بام القرآن فصاعداً۔	نماز نہیں اس شخص کی جس نے نہیں پڑھی فاتحۃ الکتاب — یہ بخاری و مسلم کی روایت ہے۔ اور صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے "جس نے نہیں پڑھی امّ القرآن مع زائد۔"

(مشکوٰۃ صـ۷۸)

یہ حدیث بلاشبہ صحیح اور متفق علیہ ہے: ائمہ ستہ نے اس کی تخریج کی ہے مگر جو حضرات فاتحہ خلف الامام کے قائل نہیں ان کے نزدیک یہ حدیث مقتدی کے حق میں نہیں بلکہ امام اور منفرد کے حق میں ہے جیسا کہ امام ترمذیؒ نے امام احمدؒ سے نقل کیا ہے۔

واما احمد بن حنبلؒ فقال معنیٰ قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم "لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب" اذا کان وحدہٗ۔ واحتج بحدیث جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ حیث قال: من صلّی رکعۃً لم یقرأ فیہا بام القرآن فلم یصلّ۔ الّا ان یکون وراء الامام۔ قال احمد، فھذا رجل من اصحاب	امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد "نہیں نماز اس شخص کی جس نے نہیں پڑھی فاتحۃ الکتاب" اس صورت پر محمول ہے جب اکیلا پڑھے۔ اور انہوں نے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ "جس نے کوئی رکعت پڑھی جس میں امّ القرآن نہیں پڑھی اس کی نماز نہیں ہوئی۔ الا یہ کہ وہ امام کے پیچھے ہو۔" امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ یہ ایک صحابیؓ

النبی صلّی اللہ علیہ وسلّم تاوّل قول النبیّ صلّی اللہ علیہ وسلّم لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب ان ھذا اذا کان وحدہٗ ۔

ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم کے ارشاد " لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحہ الکتاب" کا مطلب یہی سمجھے ہیں کہ یہ تنہا نماز پڑھنے والے کے حق میں ہے ۔

(سنن ترمذی ص۴۲ ج۱)

شرح اس کی یہ ہے کہ یہاں دو مقام الگ الگ ہیں ۔ ایک یہ کہ نماز میں کس قدر قرأت واجب اور ضروری ہے جس کے بغیر نماز نہیں ہوتی ۔ دوم یہ کہ جب کوئی شخص امام کی اقتدا میں نماز پڑھے تو اسے فریضۂ قرأت خود ادا کرنا ہوگا ۔ یا امام اس کی طرف سے نمائندگی کرے گا ۔ پہلے مسئلہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے اپنے ارشاد گرامی " لاصلوٰہ لمن لم یقرأ بفاتحہ الکتاب فصاعداً " میں ارشاد فرمایا ہے ۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ سورہٗ فاتحہ کا وجوب تو متعین ہے ۔ اور چونکہ سورۂ فاتحہ میں ہدایت کی درخواست کی گئی ہے ۔ اور الٓمٓ سے والناس تک پورا قرآن کریم اسی درخواست کا جواب ہے اس لیے نماز میں سورہ فاتحہ کے بعد اس کے جواب کا کچھ حصہ بھی واجب ہے ۔ چنانچہ متعدد احادیث میں اس کے ساتھ " فصاعداً " اور " وما زاد " بھی مروی ہے ۔ یعنی سورۃ فاتحہ کے بعد قرآن کریم کا کچھ مزید حصہ بھی تلاوت کرنا ضروری ہے ۔

بہر حال اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں قرأت کی مقدار واجب کو متعین فرمایا ہے ۔ اور وہ ہے سورۃ فاتحہ اور اس کے ساتھ قرآن کریم کا کچھ مزید حصّہ ۔

اور دوسرے مسئلہ کو آپ نے اپنے ارشاد :

من کان لہٗ امام فانّ قرأۃ الامام لہٗ قرأۃ

جس کے لیے امام ہو تو امام کی قرأت اس کی قرأت ہے ۔

میں بیان فرمایا ہے ، جس کا مطلب یہ ہے کہ مقتدی کو چونکہ استماع و انصات کا حکم ہے اس لیے وہ بذات خود قرأت نہیں کرے گا ۔ بلکہ امام اس کی جانب سے قرأت کا تحمل کرے گا ۔ اور امام کی قرأت مقتدی کی قرأت شمار ہوگی یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے امام کو " القاری " کے

لقب سے ملقب فرما کر مقتدی کو اسکی قرأت پر آمین کہنے کا حکم دیا۔ مشکوٰۃ شریف صفحہ ۷۹ میں صحیح بخاری کے حوالے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد گرامی نقل کیا ہے۔

اذا امّن القاری فامّنوا فانّ الملائکۃ تؤمّن۔ فمن وافق تامینہ تامین الملائکۃ غفر لہ ما تقدم من ذنبہ۔ (بخاری ج ۲، ص ۱۰۴)	جب "قرأت کرنے والا" آمین کہے تو تم بھی آمین کہو۔ کیونکہ فرشتے بھی آمین کہتے ہیں۔ پس جس کی آمین فرشتوں کی آمین کے موافق ہوئی۔ اس کے گذشتہ گناہ معاف ہو جائیں گے۔

ظاہر ہے کہ فرشتے خود سورہ فاتحہ کی تلاوت نہیں کرتے بلکہ صرف امام کی آمین پر آمین کہتے ہیں۔ اور انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے آمین میں فرشتوں کی موافقت کا حکم فرمایا ہے۔ اور اسی پر مغفرت ذنوب کا وعدہ فرمایا ہے۔ اور اس وعدہ کو صرف آمین کہنے پر معلق فرمایا ہے۔ نہ کہ خود اپنی قرأت کرنے پر۔ بلکہ امام کو "القاری" کہہ کر اس طرف اشارہ فرما دیا گیا ہے کہ قرأت کرنا امام کا منصب ہے۔ نہ کہ مقتدی کا۔ مقتدی کا منصب امام کی قرأت کو سننا اور خاموش رہنا ہے: واللہ اعلم

الغرض جب دو الگ الگ مسئلوں کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے الگ الگ حکم صادر فرمائے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ایک مسئلہ سے متعلق آپ کا جو ارشاد ہے اسے اٹھا کر دوسری جگہ چسپاں کیا جائے۔ اور اس دوسری جگہ کے لیے جو حکم فرمایا ہے اسے مہمل چھوڑ دیا جائے۔ خلاصہ یہ کہ مقتدی بھی سورۂ فاتحہ کی قرأت کرتا ہے۔ مگر بطور خود نہیں بلکہ بحکم "من کان لہ امام فقرأۃ الامام لہ قرأۃ" امام کے توسط سے قرأت کرتا ہے۔ اور شارع نے امام کی قرأت کو حکماً مقتدی کی قرأت قرار دیا ہے۔ اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ چونکہ مقتدی خود قرأت نہیں کرتا اس لئے اسکی نماز نہیں ہوتی۔

محمد بن اسحاق کی روایت:

ان حضرات کی ایک دلیل حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے جو محمد بن اسحاق کی روایت سے مروی ہے۔

عن عبادة بن الصامت رضي الله عنه قال كنا خلف النبي صلى الله عليه وسلم في صلوة الفجر فقرأ فثقلت عليه القراءة. فلما فرغ قال لعلكم تقرؤن خلف امامكم. قلنا نعم يا رسول الله! قال لا تفعلوا الا بفاتحة الكتاب. فانه لا صلوة لمن لم يقرأ بها. رواه ابو داؤد والترمذي والنسائي معناه — وفي رواية لابي داؤد- قال وانا اقول مالي ينازعني القرآن- فلا تقرؤا بشئ من القرآن اذا جهرت الا بام القرآن.

(مشکوٰۃ ص ۸۱ ج ۱)

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اقتدا میں فجر کی نماز پڑھ رہے تھے، آپ نے قرأت کی تو آپؐ پر قرأت دشوار ہوگئی۔ نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا شاید تم اپنے امام کے پیچھے قرأت کرتے ہو۔ ہم نے کہا، جی ہاں! یا رسول اللہ! فرمایا، ایسا نہ کیا کرو۔ سوائے فاتحۃ الکتاب کے کیونکہ نماز نہیں اس شخص کی جو اس کو نہ پڑھے۔

اس کو ابوداؤد۔ ترمذی اور نسائی نے روایت کیا ہے۔ اور ابوداؤد کی ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا میں بھی کہہ رہا تھا کہ کیا بات ہے کہ قرآن مجھ سے کشاکشی کرتا ہے۔ (یعنی پڑھنے میں الجھن ہو رہی ہے) پس جب میں بلند آواز سے قرأت کروں تو کچھ نہ پڑھا کرو سوائے ام القرآن کے۔

اگرچہ امام بیہقی، امام دارقطنی اور دیگر بعض شافعیہ نے اپنے مسلک کے مطابق اس حدیث کی تصحیح کی ہے۔ چنانچہ امام خطابیؒ معالم السنن (ص ۲۰۵ ج ۱) میں فرماتے ہیں۔

هذا الحديث نص بان قراءة فاتحة الكتاب واجبة على

یہ حدیث نص ہے اس بات پر کہ فاتحۃ الکتاب کا پڑھنا واجب ہے اس

من صلّیٰ خلف الامام سواءٌ جهر الامام بالقـــراءة اوخافت بهـا ـ واسنادهٗ جيدٌ لا طعن فيـه ـ

شخص پر جو امام کے پیچھے نماز پڑھے۔ خواہ امام جہری قرأت کرے۔ یا سرّی۔ اور اس کی سند جید ہے۔ اس میں کوئی طعن نہیں۔

لیکن یہ حدیث سند اور متن دونوں کے اعتبار سے مضطرب ہے۔ اور امام احمدؒ اور دیگر اکابر محدثین نے اس کی تضعیف کی ہے۔ شیخ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

وهــذا الحديث معلّل عنــد ائمة الحديث بامور كثيرة ضعفه احمد وغيره من الائمة ـ وقـد بسط الكلام علىٰ ضعفه فى غيــره ــذا الموضع ـ وبين ان الحديث الصحيح قول النبىّ صلّى الله عليه وسلّم: لا صلوٰة الّا بامّ القــران ـ فهــذا الذى اخــرجاه فى الصحيحين ـ ورواه الزهرى عن محمود بن الربيع عن عبادة رضى الله عنـــه ـ واما هــذا الحديث فغلط فيه بعض الشــاميين واصــلهٗ ان عبادةؓ كان يؤمّ بيت المقدس ـ فقــال هذا ـ فاشتبه

یہ حدیث بہت سی وجوہ سے ائمہ حدیث کے نزدیک معلول ہے۔ امام احمدؒ اور دیگر ائمہ حدیث نے اس کی تضعیف کی ہے۔ اس حدیث کے ضعف پر دوسری جگہ تفصیل سے لکھا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ صحیح حدیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشادِ گرامی ہے کہ "امّ القرآن کے بغیر نماز نہیں"۔ پس حضرت عبادہؓ کی یہ حدیث ہے جو صحیحین میں مروی ہے۔ اور اسے زہری نے بواسطہ محمود بن ربیع حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ لیکن یہ حدیث (جس میں اختلاط کا قصہ ہے) اس میں بعض شامیوں نے غلطی کی ہے۔ اور اصل اس کی یہ ہے کہ حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ بیت المقدس کے امام تھے۔ اور یہ بات (فاتحہ خلف الامام کی)

علیھم المرفوع بالموقوف علی عبادۃؓ	انہوں نے کہی تھی۔ لیکن راویوں کو اشتباہ ہوا اور انہوں نے حضرت عبادہ کے قول کو حدیث مرفوع کی حیثیت سے نقل
(فتاوی ابن تیمیہ ص۲۸۶ ج۲۳ طبع جدید)	کر دیا۔

شیخ ابن تیمیہؒ نے جو لکھا ہے اسکی طرف امام ترمذیؒ نے بھی اشارہ فرمایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

وقرأ عبادۃ بن الصامت بعد النبیّ صلّی اللہ علیہ وسلّم خلف الامام، وتأوّل قول النبیّ صلّی اللہ علیہ وسلّم لاصلوٰۃ الا بقرأۃ فاتحۃ الکتاب۔	اور حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد امام کے پیچھے قرأت کی۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان "لاصلوٰۃ الا بقرأۃ فاتحۃ الکتاب" سے استدلال کیا۔

(ترمذی شریف ص۴۲ ج۱)

امام ترمذیؒ کے اس ارشاد سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ "لا صلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب" کے عموم سے استدلال کرتے ہوئے حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ قرأۃ فاتحہ خلف الامام کے جواز کے قائل تھے۔ یہ نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امام کی اقتدا میں فاتحہ پڑھنے کا حکم دیا تھا۔ بلکہ جیسا کہ شیخ ابن تیمیہؒ نے کہا ہے۔ راوی کو وہم ہوا ہے۔ اور اس نے اس کو مرفوع حدیث کی حیثیت سے نقل کر دیا۔

بہر حال حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کی یہ مرفوع حدیث جو سنن کے حوالے سے اوپر نقل ہو چکی ہے ضعیف و مضطرب ہے۔ لیکن اگر اس کے ضعف و اضطراب سے قطع نظر کر کے اس کو صحیح فرض کر لیا جائے تب بھی یہاں چند امور قابل غور ہیں۔

اوّل: آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمانا کہ "شاید تم اپنے امام کے پیچھے قرأۃ کیا کرتے ہو"۔۔۔ اس امر کی دلیل ہے کہ اس واقعہ سے قبل آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب سے قرأت خلف الامام مشروع نہیں کی گئی تھی۔ اور جو حضرات امام کے پیچھے قرأت کرتے تھے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم و اجازت کے بغیر کرتے تھے۔

دوم:۔ بجائے اس کے کہ آپؐ یہ فرماتے کہ "شاید تم میرے پیچھے قرأت کیا کرتے ہو" آپ کا یہ فرمانا کہ "شاید تم اپنے امام کے پیچھے قرأت کیا کرتے ہو" اس امر کی دلیل ہے کہ امام کے پیچھے قرأت کرنا منصب امامت کے خلاف ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم اس پر نکیر فرما رہے ہیں۔ اس لیے امام کے پیچھے قرأت کرنا شرعاً نادرست اور لائق نکیر ہے۔

سوم:۔ آپؐ کے سوال کے جواب میں ایک شخص یا چند اشخاص کا یہ کہنا کہ ہم ایسا کرتے ہیں۔ اس امر کی دلیل ہے کہ قرآت خلف الامام صحابہ کرامؓ کا عام معمول نہیں تھا۔ غالباً بعض حضرات۔ جن کو مسئلہ معلوم نہیں تھا۔ ایسا کرتے تھے۔ ابوداؤد صہ۱۱۹ میں حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کا جو قصہ لکھا ہے کہ ایک دفعہ ان کو صبح کی نماز میں تاخیر ہوگئی۔ ابونعیم مؤذن نے نماز شروع کر دی۔ اور حضرت عبادہؓ ان کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھنے لگے۔ نماز سے فارغ ہوتے تو نافع بن محمود نے حضرت عبادہؓ سے عرض کیا کہ امام قرأت کر رہا تھا اور آپ سورۃ فاتحہ پڑھ رہے تھے۔ دارقطنی صہ۱۲۰ کی روایت میں ہے۔ قلت لعبادۃ قد صنعت شیئاً، فلا ادری أ سنۃٌ ھی۔ ام سھو کانت منک نافع کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبادہؓ سے عرض کیا کہ آپ نے آج ایک ایسا کام کیا ہے جس کے بارے میں مجھے معلوم نہیں کہ آیا وہ سنت ہے۔ یا آپ نے بھول کر کیا ہے ——————

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد بھی قرأت خلف الامام صحابہؓ وتابعینؒ کا معمول نہیں تھا۔ چنانچہ حضرت عبادہؓ کے امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنے پر نافع بن محمود کو یہ گمان ہوا کہ آپ بھول کر پڑھ رہے ہیں۔ اور حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ نے "لاصلوۃ الابفاتحۃ الکتاب" سے استدلال کرتے ہوئے اپنے فاتحہ پڑھنے کی وجہ بیان کی۔ مگر نافع کو یہ نہیں فرمایا کہ چونکہ تم نے امام کے پیچھے فاتحہ نہیں پڑھی اس لیے تمہاری نماز نہیں ہوئی۔ اور حضرت عبادہؓ حالانکہ امام تھے۔ انھوں نے اپنے مقتدیوں کو بھی فاتحہ خلف الامام کا حکم نہیں فرمایا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ خود حضرت عبادہؓ بھی اسکے قائل نہیں کہ اگر امام کے پیچھے فاتحہ نہ پڑھی جائے تو مقتدی کی نماز نہیں ہوتی۔ زیادہ سے زیادہ وہ اس کو جائز یا مستحسن سمجھتے تھے۔ بہرحال حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے معلوم ہو جاتا ہے کہ فاتحہ خلف الامام صحابہ کرامؓ کا عام معمول نہیں تھا نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں

ہ اور نہ آپ کے بعد ______________

ہارم :- مقتدی کا امام کے پیچھے قرأت کرنا چونکہ امام کی قرأت میں گڑبڑ کا موجب ہوتا ہے۔ جیسا کہ اس قعہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کچھ لوگوں کے پڑھنے کی وجہ سے قرأت میں دشواری پیش آئی۔ ں لیے آپ نے امام کے پیچھے قرأت کرنے سے منع فرمادیا۔ اور سورۃ فاتحہ کو اس ممانعت سے مستثنیٰ رمادیا۔ اس کو مستثنیٰ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ سورۃ فاتحہ نماز میں بار بار پڑھی جاتی ہے، اس لیے اس میں م کو التباس پیش آنے کا احتمال کم ہوتا ہے۔ اس مضمون کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے "فانہ لا صلوٰۃ لا بفاتحہ الکتاب" میں ارشاد فرمایا جس سے مقتدی پر سورۃ فاتحہ کی قرأت کو واجب کرنا مقصود نہیں تھا۔ لہ سورۃ فاتحہ کو ممانعت سے مستثنیٰ کرنے کی وجہ بیان فرمانا مقصود تھا۔ کہ چونکہ کوئی نماز سورۃ فاتحہ سے خالی نہیں ہوتی۔ بلکہ سورۃ فاتحہ ہر نماز میں پڑھی جاتی ہے اس لیے اس میں گڑبڑ ہونے اور امام کے رأت میں بھول جانے کا امکان کم ہے۔

پنجم :-

جس علت کی بنا پر قرأت خلف الامام سے ممانعت فرمائی گئی یعنی اسکی وجہ سے امام کی قرأت میں گڑبڑ ہوتا چونکہ وہ علت سورۃ فاتحہ میں نہیں پائی جاتی تھی اس لیے سورۃ فاتحہ پڑھنے کی اجازت دے دی گئی کیونکہ نہی سے استثنا اباحت کے لیے ہوتا ہے۔ وجوب کے لیے نہیں۔ پس حدیث عبادہؓ سے معلوم ہوا کہ قرأت فاتحہ کو مقتدی کے لیے مباح فرمایا گیا۔ مگر یہ اباحت بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے نزدیک اباحت مرجوحہ تھی۔ چنانچہ ابن ابی شیبہ صفحہ ۳۷۴ ج ۱ میں حضرت ابو قلابہ رضی اللہ عنہ کی مرسل روایت کے الفاظ یہ ہیں۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لاصحابہ، ھل تقرؤن خلف امامکم۔ قال بعض: نعم، وقال بعض: لا، فقال، ان کنتم لا بد فاعلین

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحابؓ سے فرمایا، کیا تم اپنے امام کے پیچھے قرأت کیا کرتے ہو؟ بعض نے اثبات میں جواب دیا اور بعض نے نفی میں۔ پس آپ نے فرمایا، اگر تم کو ضرور کچھ پڑھنا ہی ہے

فلیقرأ احدکم بفاتحۃ الکتاب فی نفسہ۔ | تو تم میں کا ایک فاتحہ اپنے دل میں پڑھ لیا کرے۔

اس روایت میں "اگر تم کو کچھ پڑھنا ہی ہے" کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ مقتدی کے لیے فاتحہ کا پڑھنا بھی پسند نہیں فرماتے تھے۔ سورۃ فاتحہ پڑھنے کی اجازت دی جا رہی ہے۔ مگر ایسے الفاظ میں جن سے ناگواری مترشح ہوتی ہے۔ اور یہ مطلب بھی اس صورت میں ہے کہ "دل میں پڑھنے" سے مراد زبان سے آہستہ پڑھنا ہو۔ اور اگر اس سے تدبر و تفکر اور لیا جائے تو زبان سے پڑھنے کی اجازت بھی ثابت نہیں ہوتی۔

ششم۔ لیکن عام قرأت کی ممانعت اور سورۃ فاتحہ کی اجازت کے باوجود بھی کبھی الجھن کی صورت پیش آ جاتی تھی اس لئے مطلقاً ممانعت فرما دی گئی جیسا کہ مؤطا امام مالکؒ اور سنن کی روایت میں ہے۔

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ	حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت
انّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم	ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم
انصرف من صلوٰۃ جھر فیھا	ایک ایسی نماز سے جس میں جہری قرأت
القراءۃ فقال ھل قرأ معی	فرمائی تھی۔ فارغ ہوئے۔ تو فرمایا، کیا
احد منکم آنفا؟ فقال رجل	ابھی میرے ساتھ تم میں سے کسی نے کچھ
نعم، یا رسول اللہ! قال انی	پڑھا تھا۔ ایک شخص نے کہا جی ہاں!
اقول مالی انازع القرآن۔	میں نے پڑھا تھا۔ فرمایا میں بھی سوچتا تھا
قال فانتھی الناس عن	کہ کیا بات ہے مجھے قرآن پڑھنے میں
القراءۃ مع رسول اللہ صلی اللہ	تشویش کیوں ہو رہی ہے۔ راوی کہتے
علیہ وسلّم فیما جھر فیہ بالقراءۃ	کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم
من الصلوٰۃ حین سمعوا ذالک	کا یہ ارشاد سنکر لوگ رسول اللہ
من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم۔	صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے ساتھ
(رواہ مالک، واحمد۔ وابو داؤد۔	جہری نمازوں میں قرأت
والترمذی۔ والنسائی وروی ابن ماجہ نحوہٗ	کرنے سے رک گئے۔

(مشکوٰۃ صـ۸۱)

ھفتم :- مگر مقتدی کی قرأت خلف الامام سے امام کی قرأت میں گڑبڑ ہونے کا قصہ صرف جہری نمازوں سے مخصوص نہیں بلکہ سری نمازوں میں بھی اس سے گڑبڑ پیدا ہو سکتی ہے ۔ چنانچہ صحیح مسلم (صـ۱۷۲ ج۱) میں حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے :

قال صلى بنا رسول الله صلى الله عليه وسلم صلوة الظهر او العصر، فقال ايكم قرأ خلفي سبح اسم ربك الاعلى؟ فقال رجل انا ـ ولم ارد بها الا الخير ـ قال قد علمت ان بعضكم خالجنيها ـ ـ ـ

فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم کو ظہر یا عصر کی نماز پڑھائی تو فرمایا، تم میں سے کسی نے میرے پیچھے "سبح اسم ربک الاعلیٰ" پڑھی تھی ۔ ایک شخص نے کہا کہ میں نے پڑھی تھی ۔ اور میں نے اس سے خیر کے سوا کسی چیز کا ارادہ نہیں کیا ۔ فرمایا ۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ تم میں سے بعض نے اس میں مجھ سے منازعت کی ہے

اور حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ۔

قال كانوا يقرءون خلف النبي صلى الله عليه وسلم ـ فقال خلطتم على القرآن (رواه احمد وابو يعلى والبزار ـ ورجال احمد رجال الصحيح ـ
(مجمع الزوائد صـ۱۱۰ ج۲)

لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے قرأت کیا کرتے تھے تو آپؐ نے فرمایا کہ تم نے مجھ پر قرأت گڑبڑ کر دی ۔

پس چونکہ مقتدی کے ذمہ قرأت واجب نہیں کی گئی ۔ بلکہ امام کی قرأت کو اس کے لیے کافی قرار دیا گیا ہے اور چونکہ مقتدی کو امام کے پیچھے خاموش رہنے کا حکم دیا گیا ہے ۔ اور چونکہ اس کی قرأت کی وجہ سے امام کی قرأت میں گڑبڑ ہونے کا اندیشہ ہے ۔ اور چونکہ یہ اندیشہ سری اور جہری نمازوں میں یکساں ہے ۔ اس لیے حضرت امام ابو حنیفہؒ قرأت خلف الامام کے مطلقاً قائل نہیں اور جیسا کہ اوپر معلوم ہوا صحابہؓ و تابعینؒ کا عام معمول یہی تھا ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی ۔ اور بعد میں بھی ـــــ

سکتات امام کی بحث :

اور جو حضرات قرأت خلف الامام کے قائل ہیں وہ بھی عین امام کی قرأت کے وقت مقتدی کے قرأت کرنے کو معیوب اور قرآن کریم کے ارشاد: فاستمعوا لہٗ وانصتوا" اور ارشاد نبوی: "واذا قرأ فانصتوا" کے خلاف سمجھتے ہیں۔ اس لیے وہ سکتات امام میں پڑھنے کا حکم فرماتے ہیں۔ لیکن کسی حدیث میں امام کو مقتدی کی قرأت کے لیے سکتے کرنے کا حکم نہیں دیا گیا اور نہ امام کو مقتدیوں کے تابع کہ ناصح ہو سکتا ہے ـــــ اگر سکتات امام میں مقتدی پر قرأت فاتحہ لازم ہوتی تو کوئی وجہ نہ تھی کہ امام کو اس کے لیے پابند نہ کیا جاتا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تین سکتات فرماتے تھے۔ ایک قرأۃ سے پہلے، اور یہ حمد و ثنا کے لیے ہوتا تھا۔ اس وقت اگر مقتدی فاتحہ پڑھے تو اس سے مقتدی کا فاتحہ میں تقدم لازم آتا ہے۔ اور جب عام ارکان میں مقتدی کو امام سے آگے پڑھنے کی اجازت نہیں تو اس کو یہ اجازت کیسے ہو سکتی ہے کہ امام کے قرأت شروع کرنے سے پہلے ہی قرأت کو نمٹا لے۔

اور ایک سکتہ سورۃ فاتحہ کے بعد اور ایک رکوع سے قبل ہوتا تھا۔ مگر یہ سکتات عام معمول کے مطابق ہوتے تھے، اور ان میں اتنی گنجائش نہیں ہوتی تھی کہ مقتدی سورہ فاتحہ پڑھ سکیں ـــــ بہرحال سکتات میں مقتدی کا فاتحہ پڑھنا بھی بعض حضرات کا اجتہاد تھا۔ لیکن جب مقتدی کے ذمہ قرأت واجب ہی نہیں تو اس کو اس تکلف کی ضرورت ہی کیوں ہو۔

ایک شبہ کا ازالہ :

اور سوال میں جو یہ شبہ کیا گیا ہے کہ۔

"اگر امام ہی کا فاتحہ تلاوت کرنا کافی ہے پھر دیگر ارکان کے لیے مقتدی کا اعادہ کیوں ضروری ہے۔ جیسے ثنا۔ تسبیحات۔ تشہد۔ درود شریف وغیرہ"

اس کا جواب حدیث "واذا قرأ فانصتوا" کی شرح میں اوپر گزر چکا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مقتدی کو دوسرے ارکان تو امام کے ساتھ ادا کرنے کا حکم فرمایا۔ لیکن امام کی قرأت کے وقت اس کو قرأت کرنے کا نہیں بلکہ خاموش رہنے کا حکم فرمایا۔ اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ امام مقتدی کی طرف سے قرأت کا کو تحمل

کرتا ہے۔ دوسرے ارکان کا تحمل نہیں کرتا۔

سوال سوم: اذان واقامت کے کلمات:

س ۲۱: متفق علیہ کی حدیث میں اذان کے کلمات جفت اور اقامت طاق پڑھنے کا ذکر موجود ہے یا یہ کہ اگر اذان ترجیع سے دی جائے تو اقامت جفت کہی جائے تو سوال یہ ہے کہ اذان واقامت دونوں جفت کہی جاتی ہیں کس دلیل سے بحوالہ کتب احادیث وضاحت فرمائیں۔ ساتھ ہی صحت کے اعتبار سے کون سی اذان اقامت بہتر ہے۔

ج: اس بحث میں چند امور لائق ذکر ہیں۔

۱:۔ سوال میں جس متفق علیہ حدیث کا ذکر ہے۔ وہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے۔

عن انس رضی اللہ عنہ قال ذکروا النار والناقوس۔ فذکروا الیھود والنصارٰی۔ فامر بلال ان یشفع الاذان وان یوتر الاقامۃ۔ قال اسماعیل فذکرتہ لایوب۔ فقال الا الاقامۃ۔ (متفق علیہ مشکوٰۃ ص ۶۳)	حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ صحابہ نے (نماز کی اطلاع کے لیے) آگ جلانے اور گھنٹی بجادینے کا تذکرہ کیا۔ تو یہود ونصارٰی کا ذکر آیا۔ پس حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا گیا کہ اذان جفت کہا کریں۔ اور اقامت طاق کہا کریں اسماعیل کہتے ہیں کہ میں نے یہ حدیث ایوب سے ذکر کی تو انہوں نے فرمایا۔ مگر اقامت۔

۲:۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی اس روایت میں ابتدائے تشریع اذان کے واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس واقعہ کی مختصر تشریح یہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لائے تو مشورہ ہوا کہ نماز کی اطلاع کے لیے کوئی طریقہ کار وضع کیا جائے۔ بعض حضرات نے مشورہ دیا کہ نصارٰی کی طرح گھنٹی بجائی جایا کرے۔ بعض نے یہودیوں کی طرح بوق بجانے کا اور بعض نے کسی بلند مقام پر آگ روشن کرنے کا مشورہ دیا۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان میں سے کسی تجویز کو پسند نہیں فرمایا۔ کیونکہ یہ چیزیں علی الترتیب نصارٰی۔ یہود اور مجوس کا شعار تھیں۔

بالآخر یہ طے پایا کہ سردست کوئی صاحب گلی کوچوں میں "الصلوٰۃ جامعۃ" کا اعلان کر دیا کریں۔ بعد ازاں حضرت عبداللہ بن زید بن عبد ربہ رضی اللہ عنہ کو خواب میں ایک فرشتے نے اذان و اقامت کی تعلیم دی۔ انہوں نے اس کا ذکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیا۔ آپؐ نے فرمایا یہ سچا خواب ہے۔ تم یہ کلمات بلال کو تلقین کرو۔ وہ اذان کہیں۔ کیونکہ ان کی آواز بلند ہے۔ یہ پورا واقعہ احادیث میں مروی ہے۔ اسی کی طرف حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں اشارہ کیا گیا ہے۔

۳:۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ فرشتہ کی تعلیم کردہ اذان و اقامت ——— جس کے مطابق اذان و اقامت کہنے کا حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم ہوا تھا ——— کیا تھی؟ اس پر تو تمام روایات متفق ہیں کہ فرشتہ کی تلقین کردہ اذان کے کلمات پندرہ تھے۔ البتہ اقامت میں بظاہر روایات میں اختلاف نظر آتا ہے۔ چنانچہ ابوداؤدؒ "باب کیف الاذان" میں دونوں قسم کی روایات جمع کر دی گئی ہیں۔

الف:۔ محمد بن اسحاق کی روایت میں تو حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ صاحب الرؤیا سے اذان کے کلمات پندرہ اور اقامت کے کلمات گیارہ نقل کیے ہیں (ص ۷۱/۷۲) امام ترمذیؒ حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کو مختصراً نقل کرکے فرماتے ہیں۔

"یہ حدیث ابراہیم بن سعد نے محمد بن اسحاق کی روایت سے پوری اور اس سے طویل نقل کی ہے۔ اور اس میں اذان کے کلمات دو دو مرتبہ اور اقامت کے ایک مرتبہ مذکور ہیں" (ص۲۵)

ب:۔ لیکن عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ کی روایت میں ہے۔

فقام على المسجد فاذن ثم قعد قعدة ثم قام فقال مثلها الا انه يقول قد قامت الصلوٰة (ابوداؤد ص۷۴/۱)	وہ (فرشتہ) مسجد پر کھڑا ہوا پس اس نے اذان کہی۔ پھر وہ ذرا سا بیٹھا پھر کھڑا ہوا۔ تو اسی کی مثل الفاظ کہے۔ مگر اس میں "قد قامت الصلوٰۃ" کا اضافہ کیا۔

ایک روایت میں اذان کے کلمات الگ الگ ذکر کرکے یہ کہا ہے۔

ثم امهل هنية ثم قام فقال مثلها۔ الا انه قال زاد بعد	پھر وہ ذرا سا ٹھہرا۔ پھر اٹھا۔ پس اسی کے مثل الفاظ کہے۔ مگر "حی علی الفلاح" کے

حی علی الفلاح قد قامت الصلوٰۃ قد قامت الصلوٰۃ (ص۶۵) کے بعد "قد قامت الصلوٰۃ" دو مرتبہ کا اضافہ کیا۔

ایک روایت میں عبد الرحمن بن ابی لیلیٰ حضرت عبد اللہ بن زید رضی اللہ عنہ صاحب واقعہ سے نقل کرتے ہیں۔

قال کان اذان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شفعاً شفعاً فی الاذان والاقامۃ (ترمذی ص۲۷) وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اذان و اقامت دونوں میں دو دو مرتبہ الفاظ تھے۔

ابن ابی شیبہ کی روایت میں ہے کہ عبد الرحمن بن ابی لیلیٰ فرماتے ہیں۔

حدثنا اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان عبد اللہ بن زید الانصاری جاء الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال یا رسول اللہ! رأیت فی المنام کأن رجلاً قام وعلیہ بردان اخضران۔ فقام علی حائط فاذن مثنیٰ مثنیٰ واقام مثنیٰ مثنیٰ۔ ص۲۰۳ ج۱

ہم سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے بیان کیا کہ عبد اللہ بن زید انصاری آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ پس عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ گویا ایک آدمی، جس نے دو سبز چادریں پہن رکھی تھیں۔ کھڑا ہوا اس نے دو دو مرتبہ اذان کے اور دو دو مرتبہ اقامت کے کلمات کہے۔

نصب الرایہ (۱۔۲۶۷) میں اس روایت کو نقل کر کے حافظ ابن دقیق العید سے نقل کیا ہے۔

وھذا رجال الصحیح وھو متصل علی مذھب الجماعۃ فی عدالۃ الصحابۃ وان جھالۃ اسماءھم لا تضر۔

اس سند کے تمام راوی صحیح کے راوی ہیں۔ اور یہ محدثین کے مطابق سند متصل ہے۔ کیونکہ تمام صحابہ عادل ہیں اور ان کا نام معلوم نہ ہونا مضر نہیں۔

اور نصب الرایہ کے حاشیہ میں محلّٰی ابن حزم (۳ — ۱۵۸) سے نقل کیا ہے ۔

وھذا اسناد فی غایۃ الصحۃ　　　اور یہ سند اہل کوفہ کی اسناد میں سے

من اسناد الکوفیین ۔　　　نہایت صحیح سند ہے ۔

۴ :۔ ان روایات میں پہلی روایت میں عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ "حدثنا اصحابنا" کہتے ہیں ۔ دوسری میں "عن معاذ ابن جبل" فرماتے ہیں ۔ تیسری میں "عن عبداللہ بن زید الانصاری" کہتے ہیں اور چوتھی میں "حدثنا اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم" فرماتے ہیں ۔

دوسری اور تیسری روایت پر محدثین نے یہ اعتراض کیا ہے کہ عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ کو حضرت معاذ بن جبل اور حضرت عبداللہ بن زید الانصاری سے سماع حاصل نہیں اس لیے یہ دونوں روائتیں منقطع ہیں مگر اصل قصہ یہ ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ نے حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے تواتر کے ساتھ سنا تھا ۔ اس لیے وہ کسی ایک صحابی کے نام سے اس کی روایت نہیں کرتے ۔ بلکہ کبھی "حدثنا اصحابنا" کہتے ہیں ۔ اور کبھی "حدثنا اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم" فرماتے ہیں ، پھر چونکہ یہ واقعہ حضرت عبداللہ بن زید الانصاری کا ہے اس لیے وہ کبھی ارسالاً ان کی طرف نسبت کر دیتے ہیں ۔ اور چونکہ اس میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا قصہ بھی ذکر کیا گیا ہے ۔ اس لیے کبھی ارسالاً ان کی طرف منسوب کرتے ہیں ۔ پس اگر انہوں نے حضرت عبداللہ بن زید انصاری اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما سے براہ راست اخذ نہ بھی کیا ہو ۔ تب بھی چونکہ وہ کسی تابعی سے نہیں بلکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم ہی کے واسطہ سے نقل کرتے ہیں اس لیے ان کا ارسال مُضر نہیں ۔

۵ :۔ ان روایات میں اقامت کے بارے میں بظاہر اختلاف نظر آتا ہے ۔ مگر واقعہ کے اعتبار سے ان میں کوئی اختلاف نہیں ۔ بلکہ اقامت کے کلمات ٹھیک وہی تھے جو اذان کے کلمات تھے ۔ مگر اس میں "قد قامت الصلوٰۃ" کا اضافہ تھا ۔ جیسا کہ متعدد روایات میں وارد ہے ۔ اسلئے جس روایت میں اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے اقامت کے کلمات مفرد ذکر کئے گئے ہیں وہ اختصار پر محمول ہیں ۔

۶ :۔ چونکہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اذان واقامت فرشتہ کی تعلیم کردہ اذان واقامت کے مطابق تھی۔ اس لیے ان کی اذان بغیر ترجیع کے پندرہ کلمات پر مشتمل تھی اور اقامت ——— قد قامت الصلوٰۃ ——— قد قامت الصلوٰۃ کے اضافہ کے ساتھ سترہ کلمات پر مشتمل تھی جیسا کہ اوپر حضرت عبداللہ بن زید القماسی رضی اللہ عنہ کی حدیث گزر چکی ہے۔ اور مصنف عبدالرزاق (ج ۱ ص ۴۶۲) میں حضرت اسود بن یزید تابعیؒ سے روایت ہے۔

انّ بلالاً کان یثنی الاذان ویثنی الاقامۃ (نصب الرایہ ج ۱ ص ۲۶۷)	حضرت بلال رضی اللہ عنہ اذان اور اقامت کے کلمات دو دو مرتبہ کہا کرتے تھے۔

اور سنن دارقطنی میں حضرت ابوجحیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

انّ بلالاً کان یؤذن للنبی صلی اللہ علیہ وسلم مثنیٰ مثنیٰ ویقیم مثنیٰ مثنیٰ (حوالہ مذکور)	حضرت بلال رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اذان واقامت کے کلمات دو دو مرتبہ کہا کرتے تھے۔

اس روایت کے ایک راوی زیاد بن عبداللہ البکائی میں بعض حضرات نے کلام کیا ہے۔ مگر ہمارے لیے اتنا بس ہے کہ یہ صحیحین کا راوی ہے۔ حافظ نورالدین ھیثمی اس حدیث کو طبرانی کی معجم اوسط اور کبیر کے حوالے سے نقل کر کے لکھتے ہیں۔ ورجالہٗ ثقات ۔ اس کے تمام راوی ثقہ ہیں۔ (مجمع الزوائد ج ۱ ص ۳۳۰)

۷ ——— اور حضرت ابومحذورہ رضی اللہ عنہ کو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سترہ کلمات کی اقامت کی تلقین فرمائی تھی وہ فرماتے ہیں۔

علمنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الاذان تسع عشرۃ کلمۃ۔ والاقامۃ سبع عشرۃ کلمۃ۔	مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اذان کے انیس کلمات اور اقامت کے سترہ کلمات خود سکھائے تھے۔

(ابوداؤد ج ۱ ص ۷۳، نسائی ج ۱ ص ۱۰۳، ترمذی ج ۱ ص ۲۷، ابن ماجہ ص ۵۲)

اور حضرت ابومحذورہؓ کی اذان میں ترجیع کا ہونا صرف ان کی خصوصیت ہے ورنہ فتح مکہ کے بعد بھی حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اذان بغیر ترجیع کے ہوتی تھی۔

۸ ——— چونکہ اقامت کے سترہ کلمات ہی اصل میں مشروع ہوئے تھے۔ اور مدینہ میں حضرت بلال اور مکہ میں حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہما سترہ کلمات اقامت ہی کہتے تھے۔ اس لیے اسی کو اصل سنت قرار دیا جائے گا۔ اور افراد اقامت کو بیان جواز پر محمول کیا جائے گا۔ یا جن روایات میں اذان کا شفع اور اقامت کا ایتار ذکر کیا گیا ہے۔ ان کا یہ مطلب لیا جائے کہ اذان کے کلمات الگ الگ کہے جائیں۔ اور اقامت میں دو دو کلمات کو ملا کر کہا جائے۔ اور سوال میں جو خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ "اگر اذان ترجیع سے دی جائے تو اقامت جفت کہی جائے" یہ نظریہ شافعیہ میں سے امام ابن خزیمہؒ نے پیش کیا تھا۔ مگر اس کو خود شافعیہ نے بھی قبول نہیں کیا، چہ جائیکہ دوسرے حضرات اس کو قبول کرتے۔ اس لیے احادیث و آثار کے اعتبار سے یہی راجح ہے کہ اذان کے کلمات بغیر ترجیع کے پندرہ ہوں۔ اور اقامت کے کلمات قد قامت الصلوٰۃ کے اضافہ کے ساتھ سترہ ہوں۔ چنانچہ امام طحاویؒ نے شرح معانی الآثار میں نقل کیا ہے کہ حضرت سلمہ بن اکوع اور آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے خادم ثوبان رضی اللہ عنہما اذان و اقامت مثنیٰ مثنیٰ کہا کرتے تھے۔ اور حضرت مجاہدؒ تابعی سے نقل کیا ہے کہ اقامت کے کلمات ایک ایک مرتبہ کہنا ایسی چیز ہے جس کو امراء نے ایجاد کیا ہے۔ (مصنفہ عبدالرزاق ص ۴۶۳، ج ۱، امانی الاحبار شرح معانی الآثار ص ۲۲۵ ج ۲)

امانی الاحبار شرح معانی الآثار (ص ۲۲۵ ج ۲) میں مصنف ابن ابی شیبہ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔

انّ علیاً رضی اللہ عنہ کان یقول الاذان مثنیٰ والاقامۃ۔ واتیٰ علیٰ مؤذن یقیم مرۃ مرۃ فقال الا جعلتھا مثنیٰ۔ لاامّ لک۔	حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ اذان کے کلمات دو دو مرتبہ ہوتے ہیں اور اقامت کے بھی۔ اور آپ ایک مؤذن کے پاس آئے جو ایک ایک مرتبہ اقامت کے کلمات کہتا تھا۔ تو آپ نے فرمایا تو نے اس کو دو دو مرتبہ کیوں نہ کہا تیری ماں نہ رہے۔

اور بیہقی کی خلافیات کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ حضرت ابراہیم نخعیؒ فرماتے تھے کہ جس نے

مت کو سب سے پہلے کم کیا وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ تھے۔

:۔ اذان اور اقامت کے کلمات میں جو اختلاف ہے وہ راجح اور مرجوح کا اختلاف ہے۔ امام حنیفہؒ۔ امام سفیان ثوریؒ۔ اہل کوفہ۔ اور امام احمد بن حنبلؒ نے احادیث و آثار کی بنا پر اذان کے پندرہ اقامت کے سترہ کلمات کو ترجیح دی ہے، ان حضرات کے نزدیک اذان میں ترجیع اور اقامت افراد بھی جائز ہے۔

سوال چہارم: مردوں اور عورتوں کی نماز میں تفریق :

۴ تحقیق طلب یہ سوال ہے کہ مرد عورت کی نماز کی ہیئت (ظاہری شکل) مختلف کیوں ہے مثلاً مرد کا کانوں تک تکبیر کے لیے ہاتھ اٹھانا اور عورت کا کاندھے تک۔ مرد کا زیر ناف دونوں ہاتھ باندھنا اور عورت کا سینے پر۔

ج ۴۔ مرد و عورت کی نماز میں یہ تفریق خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہے۔ چنانچہ مراسیل ابی داؤد (ص ۸ مطبوعہ کارخانہ کتب کراچی) میں یزید بن ابی حبیبؒ سے مرسلاً روایت ہے۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دو عورتوں
مرّ علی امرأتین تصلّیان	کے پاس سے گذرے، جو نماز پڑھ رہی تھیں
فقال اذا سجدتما فضمّا بعض	آپؐ نے ان سے فرمایا، جب تم سجدہ
اللحم الی الارض۔ فان	کرو تو اپنے جسم کا کچھ زمین سے ملالیا کرو
المرأۃ لیست فی ذالک	کیوں کہ عورت کا حکم اس بارے میں
کالرجل۔	مرد جیسا نہیں۔

کنز العمال (جلد ۴ ص ۱۱۷۔ مطبوعہ حیدرآباد دکن ۱۳۱۳ھ) میں بیہقی اور ابن عدی کے حوالے سے بروایت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد نقل کیا ہے۔

واذا سجدت الصقت	عورت جب سجدہ کرے تو اپنا پیٹ

بطنها بفخذيها كاستر ما يكون لها ۔

رانوں سے چپکا لے ایسے طور پر کہ اس کے لیے زیادہ سے زیادہ پردہ کا موجب ہو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات سے جہاں عورت کے سجدہ کا مسنون طریقہ معلوم ہوا کہ اسے بالکل سمٹ کر اور زمین سے چپک کر سجدہ کرنا چاہیے۔ وہاں دو اہم ترین اصول بھی معلوم ہوئے۔ ایک یہ کہ نماز کے تمام احکام اول سے آخر تک مردوں اور عورتوں کے لیے یکساں نہیں بلکہ بعض احکام مردوں کے لیے الگ ہیں اور عورتوں کے لیے ان سے مختلف ہر صنف کو ان احکام کی پابندی لازم ہے جو اس سے متعلق ہوں۔

مردوں کو عورتوں کی اور عورتوں کو مردوں کی مشابہت کی اجازت نہیں۔

دوسرا اہم اصول یہ معلوم ہوا کہ عورتوں کے لیے نماز کی وہ ہیئت مسنون ہے جس میں زیادہ سے زیادہ ستر ہو۔ چونکہ مرد و عورت کی نماز میں یہ تفریق آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود فرما کر اس کے لیے ایک اصولی قاعدہ ارشاد فرما دیا اس لیے امت کا تعامل و توارث اسی کے مطابق چلا آتا ہے

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد ہے۔

اذا سجدت المرأة فلتضم فخذيها (کنز العمال ص۲۲۲ ج۴)

جب عورت سجدہ کرے تو اسے چاہیے کہ اپنی رانوں کو ملا لیا کرے۔

حضرات فقہاء جب عورتوں کے ان مسائل کو۔ جن کی طرف سوال میں اشارہ کیا گیا ہے ذکر کرتے ہیں تو اسی اصول کو پیش نظر رکھتے ہیں جو اوپر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔ چنانچہ ہدایہ میں عورت کے سجدہ کی کیفیت کو ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

والمرأة تنخفض في سجودها وتلزق بطنها بفخذيها لان ذالك استر لها ۔

اور عورت اپنے سجدہ میں سمٹ جائے۔ اور اپنا پیٹ اپنی رانوں سے ملا لے کیونکہ یہ اس کے لیے زیادہ پردہ کی چیز ہے۔

یہ قریب قریب وہی الفاظ ہیں جو اوپر حدیث میں منقول ہوئے ہیں۔ اور قعدہ کی ہیئت کو ذکر کرتے ہوئے صاحب ہدایہ لکھتے ہیں۔

فان کانت امرأۃ جلست ‏ ‏ ‏ ‏ اگر عورت ہو تو اپنے سرین پر بیٹھ جائے
علی الیتها الیسریٰ واخرجت رجلیها ‏ ‏ ‏ ‏ اور پاؤں دائیں جانب نکال لے کیونکہ
الی الجانب الایمن لانهٗ استر لها۔ ‏ ‏ ‏ ‏ یہ اس کے لیے زیادہ پردہ کی چیز ہے۔
آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اس ارشاد فرمودہ اصول کی رعایت صرف فقہائے احناف ہی نے نہیں کی بلکہ قریب قریب تمام ائمہ اور فقہائے امت نے اس اصول کو ملحوظ رکھا ہے۔ جیسا کہ ان کی کتب فقہیہ سے واضح ہے۔ واللہ الموفق۔

سوال پنجم: فاتحہ خلف الامام اور مسئلہ آمین :-

س ۵: نماز کے اندر امام کے پیچھے الفاتحہ پڑھنے سے اور آمین کا امام اور مقتدی کا جہری نماز میں جہر سے کہنے سے کس نے منع کیا ہے۔ جبکہ واضح احادیث و آثار اصحاب سے ہے۔ اگر منسوخ ہو چکا ہے تو قول اور صحت والی احادیث اور آثار اصحاب سے دلیل دیں۔

ج ۵: فاتحہ خلف الامام کی بحث سوال دوم کے ذیل میں گزر چکی ہے۔ اور میں وہاں بتا چکا ہوں کہ قرآن کریم نے بھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بھی امام کی اقتدا میں مقتدی کو خاموش رہنے کا حکم دیا ہے۔ مگر چونکہ سوال میں دوبارہ دریافت کیا گیا ہے کہ اس سے کس نے منع کیا ہے؟ اس لئے مناسب ہے کہ اس سلسلہ میں دو نکتے مزید عرض کر دیئے جائیں۔ واللہ الموفق۔

اوّل: یہ کہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ قرآن کریم کی یہ آیت:
واذا قرئ القرآن فاستمعوا لهٗ ‏ ‏ ‏ ‏ اور جب قرآن پڑھا جائے تو اسپر کان دھرو اور
وانصتوا لعلکم ترحمون۔ ‏ ‏ ‏ ‏ خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔
نماز اور خطبہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اس آیت کریمہ میں حق تعالیٰ شانہٗ نے اپنی رحمت کو مقتدی کی خاموشی پر معلق فرمایا ہے۔ گویا جو مقتدی امام کے پیچھے خاموشی اختیار نہ کرے بلکہ امام کی قرأت کے وقت اپنی قرأت خود شروع کر دے وہ "لعلکم ترحمون" کے زمرے سے خارج ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خطبہ کی حالت میں ذکر و تسبیح کی بھی ممانعت ہے۔ اور امر بالمعروف، جو عام حالات میں واجب ہے اس

کی بھی ممانعت ہے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسے شخص کو بھی لغو کا مرتکب قرار دیا ہے جس سے جمعہ کا ثواب باطل ہو جاتا ہے۔

ارشاد نبوی ہے ۔

اذا قلت لصاحبك يوم الجمعة انصت والامام يخطب فقد لغوت (متفق علیہ۔ مشکوٰۃ ص۱۲۲)	جب تم نے جمعہ کے دن اپنے رفیق سے کہا کہ خاموش رہو جبکہ امام خطبہ دے رہا تھا تو تم نے لغو کا ارتکاب کیا ۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ اس سے جمعہ کا ثواب باطل ہو جاتا ہے ۔

عن ابن عباس رضی الله عنهما قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من تكلم يوم الجمعة والامام يخطب فهو كمثل الحمار يحمل اسفاراً ۔ والذی یقول له انصت ليس له جمعة ۔	ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص نے جمعہ کے دن کوئی بات کی جب کہ امام خطبہ دے رہا تھا۔ تو اس کی مثال اس گدھے کی سی ہے جو بوجھ اٹھائے پھرتا ہے اور جو شخص بات کرنے والے کو خاموش رہنے کا حکم دے اس کا بھی جمعہ نہیں ۔ (رواہ احمد مشکوٰۃ ص۱۲۳)

جب خطبہ کی حالت میں کلام کرنے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس قدر تشدید فرمائی تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نماز جو خطبہ سے بدرجہا فائق ہے ، اس میں امام کی قرأت کے وقت مقتدی کا اپنی قرأت میں مشغول ہونا آپ کی نظر میں کس قدر سنگین ہوگا ۔

دوم : یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے امام کی اقتدا میں قرأت کی صاف صاف ممانعت بھی وارد ہے اس سلسلہ میں مصنف عبدالرزاق سے چند روایات نقل کرتا ہوں ۔

۱۔ عن عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم عن ابیه قال نهى	عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم اپنے والد زید بن اسلم سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
عن القراءۃ خلف الامام ۔

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امام کے پیچھے
قرأت کرنے سے منع فرمایا۔

قال واخبرنی اشیاخنا ان
علیاً رضی اللہ عنہ قال: من
قرأ خلف الامام فلا صلوٰۃ
لہٗ ۔

عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ ہمیں ہمارے
مشائخ نے بتایا کہ حضرت علی کرم اللہ
وجہہٗ نے فرمایا جو شخص امام کے پیچھے قرأت
کرے اس کی نماز نہیں ۔

قال واخبرنی موسیٰ بن عقبۃ
ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم وابوبکرؓ وعمرؓ وعثمانؓ کانوا ینھون
عن القرأۃ خلف الامام (ص ۱۳۹ / ج۲)

اور موسیٰ بن عقبہ نے مجھے بتایا کہ رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات ابوبکر و عمر
و عثمان رضی اللہ عنہم امام کے پیچھے قرأت
کرنے سے منع کیا کرتے تھے ۔

۲:۔ عن زید بن اسلم عن ابن عمر
رضی اللہ عنہ کان ینھی القرأۃ
خلف الامام (ص ۲۲۰ / ج۲)

زید بن اسلم سے روایت کہ ابن عمر رضی
اللہ عنہ امام کے پیچھے قرأت کرنے سے منع
کیا کرتے تھے ۔

۳:۔ عن محمد بن عجلان قال قال
علی: من قرأ مع الامام
فلیس علی الفطرۃ ۔

محمد بن عجلان حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ
کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ جو شخص امام کے
ساتھ قرأت کرے وہ فطرت پر نہیں۔

قال وقال ابن مسعود ملئ
فوہٗ تراباً ۔

اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں
کہ اس کا مُنہ مٹی سے بھر اجائے ۔

قال وقال عمر بن الخطاب
وددت ان الذی یقرأ
خلف الامام فی فیہ
حجر ۔ (ص ۱۳۸ / ج۲)

اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ
کا ارشاد ہے کہ جو شخص امام کے پیچھے
قرأت کرتا ہے میرا جی چاہتا ہے کہ
اس کے مُنہ میں پتھر ہو ۔

۴ :۔ عن عبد اللہ بن ابی لیلیٰ قال سمعت علیاً یقول من قرأ خلف الامام فقد اخطاء الفطرۃ ۔ (صہ ۳۷ ج ۲)	عبداللہ بن ابی لیلیٰ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کو فرماتے سنا ہے کہ جو شخص امام کے پیچھے قرأت کرے اس نے فطرت کے خلاف کیا ۔
۵ :۔ عن زید بن ثابت قال من قرأ مع الامام فلا صلوٰۃ لہٗ (ایضاً)	زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جو شخص امام کے ساتھ قرأت کرے اس کی نماز نہیں ۔
۶ :۔ عن الاسود قال وددت ان الذی یقرأ خلف الامام ملئ فوہٗ تراباً (صہ ۱۳۸ ج ۲)	اسود رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں چاہتا ہوں کہ جو شخص امام کے پیچھے قرأت کرے اس کا منہ مٹی سے بھرا جائے ۔
۷ :۔ ان علقمۃ بن قیس قال ان الذی یقرأ خلف الامام ملئ فوہٗ قال احسبہٗ قال تراباً اور ضفاً	علقمہ بن قیسؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص امام کے پیچھے قرأت کرے خدا کرے اس کا منہ مٹی سے یا پتھر سے بھرا جائے ۔

مؤخر الذکر دونوں حضرات (اسود و علقمہ) کبار تابعین میں ہیں جو حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے زمانہ میں فتویٰ دیا کرتے تھے ۔

ان تمام احادیث و آثار سے واضح ہے کہ قرأت خلف الامام سے آنحضرت صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم، خلفائے راشدین، اکابر صحابہ اور اکابر تابعین (رضوان اللہ علیہم اجمعین) منع فرماتے تھے۔ اور یہ قرآن کریم کی آیت کریمہ " فاستمعوا لہٗ وانصتوا " کی تعمیل تھی ۔ واللہ الموفق ۔

جہاں تک مسئلہ آمین کا تعلق ہے اس سلسلہ میں چند معروضات پیش خدمت ہیں ۔

اوّل :۔ بعض امور میں جائز و ناجائز کا اختلاف ہوتا ہے ۔ مگر آمین کے مسئلہ میں جواز و عدم کا اختلاف نہیں بلکہ اختلاف اگر ہے تو اس میں ہے کہ آمین جہراً کہنا زیادہ بہتر ہے یا آہستہ کہنا ؟ حافظ ابن قیمؒ زاد المعاد (بحث قنوت) میں لکھتے ہیں ۔

وھذا من الاختلاف المباح الذی لا یعنف فیہ من فعلہ ولا من ترکہ۔ وھذا کرفع الیدین فی الصلوٰۃ وترکہ۔ (صفحہ ۱/۲۶ مطبوعہ مصر ۱۳۶۹ھ)	اور یہ مباح اختلاف میں سے ہے جس میں نہ کرنے والے پر کوئی ملامت ہے اور نہ ترک کرنے والے پر۔ اس کی مثال ہے نماز میں رفع یدین کرنا یا نہ کرنا۔

حافظ ابن قیمؒ کی اس عبارت سے دو باتیں معلوم ہوئیں ایک یہ کہ آمین کے آہستہ یا بلند آواز سے کہنے کے جواز پر سب کا اتفاق ہے ۔ البتہ ایک فریق کے نزدیک آہستہ کہنا زیادہ بہتر ہے ۔ اور دوسرے کے نزدیک جہراً کہنا ۔ اس لیے سوال میں جو دریافت کیا گیا ہے کہ جہر سے کس نے منع کیا " سوال کا یہ انداز صحیح نہیں ۔ صحیح انداز یہ تھا کہ آپ کے نزدیک آہستہ کہنا کیوں بہتر ہے ؟

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ اگر ایک فریق کے نزدیک دلائل کی بنا پر ایک پہلو راجح ہو ۔ اور دوسرے فریق کو دوسرا پہلو بہتر معلوم ہو تو کسی فریق کو دوسرے پر ملامت کرنے کا کوئی حق نہیں ۔ اس لیے کہ ملامت سنن مؤکدہ کے ترک پر ہوتی ہے ۔ مستحبات کے اخذ و ترک پر ملامت نہیں ہوا کرتی ۔

دوم : آمین ایک دعا ہے جیسا کہ صحیح بخاری ص۱۰۷ج۱ میں حضرت عطاؒ کا قول نقل کیا ہے ۔ مجمع البحار (ص۵۰ ج۱ طبع جدید حیدر آباد دکن) میں ہے ۔

ومعناہ استجب لی او کذالک فلیکن ۔	اس کے معنی ہیں یا اللہ ! میری دعا قبول فرما یا یہ کہ ایسا ہی ہو ۔

جب معلوم ہوا کہ " آمین " ایک دعا ہے تو سب سے پہلے ہمیں اس پر غور کرنا ہوگا کہ دعا میں جہر افضل ہے یا اخفا ؟ بلاشبہ جہری دعا بھی جائز اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہے ۔ مگر دعا میں اصل اخفا ہے ۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے ۔

ادعوا ربکم تضرعاً وخفیۃ (الاعراف ۵۵)	پکارو اپنے رب کو گڑگڑا کر اور پوشیدہ ۔

اور حضرت زکریا علیہ السلام کے تذکرہ میں فرمایا ہے ۔

اذ نادیٰ ربہ ندآءً خفیاً (مریم ۳)	جب پکارا اپنے رب کو پکارنا پوشیدہ ۔

چونکہ دعا میں اعلیٰ اور اولیٰ صورت اخفاء کی ہے ۔ اس لیے آمین میں بھی اخفا ہی اولیٰ و بہتر ہوگا ۔

مسئلہ ۱۰: جو حضرات جہری نمازوں میں امام اور مقتدی کے جہراً آمین کہنے کو مستحب فرماتے ہیں ان کا مدعیٰ اس وقت ثابت ہو سکتا ہے کہ جب وہ یہ ثابت کر دیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دائمی یا اکثری معمول آمین بالجہر کا تھا۔ یا یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو جہراً آمین کہنے کا حکم فرمایا تھا مگر کسی صحیح و صریح حدیث میں یہ دونوں باتیں کم از کم میری نظر سے نہیں گزری۔ امام بخاریؒ نے "جہر الامام بالتامین" اور "جہر الماموم بالتامین" کے دو الگ الگ باب قائم کئے ہیں۔ اور دونوں کے ذیل میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک ہی حدیث باختلاف الفاظ نقل کی ہے۔ پہلے باب کے ذیل میں یہ الفاظ ہیں:

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اذا امن الامام فامنوا فانہ من وافق تامینہ تامین الملائکۃ غفر لہ ما تقدم من ذنبہ قال ابن شہاب وکان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول آمین۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو کیونکہ جس کی آمین ملائکہ کی آمین کے موافق ہو جائے گی اس کے گذشتہ گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ ابن شہاب کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی آمین کہا کرتے تھے

اور دوسرے باب کے ذیل میں یہ الفاظ ہیں:

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اذا قال الامام غیر المغضوب علیہم ولا الضالین فقولوا آمین فانہ من وافق قولہ قول الملائکۃ غفر لہ ما تقدم من ذنبہ۔ (صحیح بخاری ص ۱۰۸ ج ۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب غیر المغضوب علیہم ولا الضالین کہے تو تم آمین کہا کرو کیونکہ جس کا کہنا ملائکہ کے کہنے کے موافق ہوگا اس کے گزشتہ گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔

جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں اس حدیث میں امام اور مقتدی کو آمین کہنے کا حکم ہے۔ اور اس کی فضیلت ارشاد فرمائی گئی ہے لیکن یہ کہ آمین آہستہ کہنی ہوگی۔ یا جہراً، اس کی تصریح اس حدیث سے ثابت نہیں ہوتی۔ حافظ ابن قیمؒ قنوت فجر کی بحث میں لکھتے ہیں۔

ومن المعلوم بالضرورۃ ان رسول

اور یہ بات بداہۃً معلوم ہے کہ رسول اللہ

الله صلّى الله عليه وسلّم لو كان
يقنت كل غداة يدعوا
بهذا الدعاء ويؤمّن الصحابة
لكان نقل الأمّة لذالك
كلهم كنقلهم لجهره
بالقراءة فيها. وعددها
ووقتها. وان جاز عليهم
تضييع امر القنوت منها
جاز عليهم تضييع
ذالك. ولافرق
ـــــ وبهذا الطريق
علمنا انه لم يكن
هديه الجهر بالتسمية
كل يوم وليلة ست
مرات دائماً مستمراً
ثم يضيع اكثر الامّة
ذالك ويخفى عليها
وهذا من المحال
المحال بل لو كان
واقعاً لكان نقله
كعدد الصلوات وعدد
الركعات والجهر

صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اگر ہر صبح کو قنوت
پڑھا کرتے اور یہ دعا (اللّٰھم اھدنی فیمن
ھدیت) پڑھا کرتے اور صحابہ کرام رضوان اللہ
علیہم اجمعین۔ اس پر آمین کہا کرتے تو پوری
کی پوری امّت اس کو نقل کرتی جیسا کہ
امّت نے نماز میں جہری قرأت کو نمازوں
کی تعداد کو اور ان کے اوقات کو نقل کیا
ہے۔ اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ امّت
نے قنوت کی نقل کو ضائع کر دیا ہے تو ان
مذکورہ بالا امور کا ضائع کرنا بھی بلا کسی فرق
کے صحیح ہوگا۔
اور اسی طریقے سے ہم نے معلوم کر لیا کہ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول مبارک جہراً بسم اللہ
پڑھنے کا نہیں تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے
کہ آپ شب وروز میں چھ مرتبہ دوام واستمرار
کے ساتھ جہراً بسم اللہ پڑھتے ہوں۔
اس کے بعد اکثر امّت اس کو ضائع کر دے۔
اور یہ بات اس پر مخفی رہ جائے۔ یہ سب سے
بڑھ کر محال ہے۔ بلکہ اگر ایسا ہوا ہوتا تو
اس کو بھی اسی طرح نقل کیا جاتا جیسے نماز
کی تعداد کو۔ رکعات کی تعداد کو، قرأت
کے جہر واخفا کو، سجدوں کی تعداد کو،

والاخفاء وعدد السجدات ومواضع	ارکان کے مواضع اوران کی ترتیب کو
الارکان وترتیبها۔ واللہ الموفق۔	نقل کیا گیا۔ واللہ الموفق ۔
والانصاف الذی یرتضیہ	اور انصاف کی بات جسے عالم
العالم المنصف انہ جہر	منصف قبول اور پسند کریگا یہ ہے کہ
واسر وقنت وترک۔	آپؐ نے جہر بھی کیا اور آہستہ بھی۔
وکان اسرارہٗ اکثر	قنوت پڑھی بھی اور چھوڑی بھی۔ اور آپؐ کا
من جہرہ وترکہٗ القنوت	آہستہ کہنا جہر سے زیادہ تھا۔ اور قنوت
اکثر من فعلہ۔ (ص۶۹)	کا ترک کرنا اس کے پڑھنے سے زیادہ تھا۔

حافظ ابن قیمؒ نے جو منصفانہ بات قنوت فجر اور جہر بالتسمیہ کے بارے میں کہی ہے وہ لفظ بلفظ آمین بالجہر میں جاری ہوتی ہے اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا دائمی معمول آمین بالجہر کا ہوتا تو ناممکن تھا کہ اسے عدد رکعات کی طرح نقل نہ کیا جاتا۔ اس مسئلہ میں صحابہ وتابعین اور ائمہ اجتہاد کا اختلاف نہ ہوتا اور امام بخاریؒ کو ایک ایسی حدیث سے استدلال کی ضرورت پیش نہ آتی جس میں جہر کا کوئی شائبہ نظر نہیں آتا۔

چہارم :۔ امام بخاریؒ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مذکورہ بالا حدیث سے، باوجود جہر کی تصریح نہ ہونے کے، قرائن وقیاسات کی مدد سے جہر پر استدلال فرمایا ہے، جو حضرات اخفاء آمین کے قائل ہیں وہ اسی حدیث کے اشارات سے اخفا پر استدلال کرتے ہیں۔ مثلاً :

۱ : آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امام کے "غیر المغضوب علیہم ولا الضالین" کہنے پر مقتدیوں کو آمین کہنے کا حکم فرمایا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ امام بلند آواز سے آمین نہیں کہتا اور نہ اسکے غیر المغضوب علیہم ولا الضالین کہتے پر آمین کہنے کا حکم نہ دیا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ دوسری روایت میں "جب امام آمین کہے" کے جو الفاظ ہیں ان کو خود شافعیہ نے بھی مجاز پر محمول کیا ہے، یعنی جب امام آمین کہنے کا ارادہ کرے یا جب اس کے آمین کہنے کا وقت ہو جائے تو تم بھی آمین کہو۔

۲ : اسی حدیث کی ایک روایت میں بسند صحیح یہ اضافہ ہے۔

وان الامام یقول آمین — اور امام بھی آمین کہتا ہے۔

(سنن نسائی صفحہ ۱۴۷ ج ۱)

اگر امام کو جہراً آمین کہنے کا حکم ہوتا تو اس ارشاد کی ضرورت نہ تھی کہ امام بھی آمین کہا کرتا ہے صحابہ کرامؓ آپؐ کے عمل سے ہی معلوم کر سکتے تھے۔

۳، حدیث میں ملائکہ کی آمین کے موافق ہونے پر مغفرت کا وعدہ فرمایا گیا ہے نمازی کی آمین میں فرشتوں کے ساتھ موافقت وقت میں بھی ہو سکتی ہے۔ خشوع واخلاص میں بھی اور کیفیت میں بھی۔ اسی موافقت کا دائرہ ذرا وسیع کر دیا جائے تو جہر واخفا میں بھی موافقت ہو سکتی ہے۔ فرشتوں کی آمین چونکہ اخفاء کے ساتھ ہوتی ہے تو ہمیں بھی ان کی موافقت کرنی چاہیئے۔

پنجم: آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے آمین بالجہر کے جو واقعات منقول ہیں اوّل تو ان کی اسانید میں اہل علم کو کلام ہے۔ پھر احیاناً جہر تعلیم پر بھی محمول ہو سکتا ہے۔

حافظ ابن قیمؒ لکھتے ہیں۔

فاذا جهر به الامام احياناً	پس جب امام اس (قنوت) کو کبھی جہر کے
ليعلم المأمومين فلا بأس بذالك	ساتھ پڑھے تاکہ مقتدی جان لیں تو کوئی
فقد جهر عمر بالافتتاح	حرج نہیں۔ چنانچہ مقتدیوں کی تعلیم کے
ليعلم المأمومين وجهر	لیے حضرت عمرؓ نے سبحانک اللہم بلند آواز
ابن عباس بقراءة الفاتحة	سے پڑھی تھی اور حضرت ابن عباسؓ نے
فى صلوٰة الجنازة ليعلم	نماز جنازہ میں فاتحہ بلند آواز سے پڑھی
انها سنة ومن هذا ايضاً جهر	تھی تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ سنت ہے
الامام بالتأمين۔	اور امام کا بلند آواز سے آمین کہنا اسی قبیل
(زاد المعاد صفحہ ۷۰ ج ۱)	سے ہے۔

چنانچہ حضرت وائل بن حجرؓ کی حدیث، جو جہر کی روایات میں سب سے قوی ہے اس میں اس مضمون کی تصریح موجود ہے۔

وقرأ غير المغضوب عليهم ولا الضالين۔ فقال آمين يمد بها صوته۔ ما اراه الا يعلمنا (اخرجه ابو بشر الدولابی فی الاسماء والکنی (اعلاء السنن، ص۱۸۶ ج۲)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب غیر المغضوب علیہم ولا الضالین کی قرأت سے فارغ ہوگئے تو آپؐ نے آمین کہی۔ آپؐ اس کے ساتھ اپنی آواز کو کھینچ رہے تھے۔ میرا خیال ہے کہ آپؐ ہمیں تعلیم دینا چاہتے تھے۔

حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ وہ اپنے زمانہ خلافت میں مکہ مکرمہ میں بلند آواز سے آمین کہتے تھے اور ان کے مقتدی بھی، وہ بھی تعلیم ہی پر محمول ہے۔ تاکہ معلوم ہو جائے کہ اس موقعہ پر آمین کہنا سنت ہے ورنہ آمین چونکہ خفیہ کہی جاتی ہے اس سے بہت سے لوگوں کو یہ خیال ہو سکتا تھا کہ آمین کہنا ہی بدعت ہے۔ چنانچہ ایک روایت میں امام مالکؒ امام کے آمین کہنے کے قائل نہیں

ششم۔ علامہ ابن الترکمانی نے الجوہر النقی میں دعویٰ کیا ہے کہ اکثر صحابہ وتابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین اخفاءِ آمین پر عامل تھے، اس سے بھی واضح ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اصل سنت یہی تھی، اور احیاناً اگر جہر فرمایا تھا، تو نو واردوں کی تعلیم کے لیے تھا۔ یہاں چند آثار کا حوالہ دینا کافی ہوگا۔

۱۔ (کنز العمال (جلد ۴ ص۲۲۹ کتاب الصلوٰۃ من قسم الافعال ادب المأموم ماتیعلق بہ) میں ابن جریر کے حوالے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد نقل کیا ہے۔

اربع یخفیهن الامام التعوذ وبسم الله الرحمٰن الرحیم۔ وآمین واللهم ربنا ولك الحمد۔

چاروں چیز کو امام خفیہ ادا کرے گا۔ اعوذ باللہ بسم اللہ۔ آمین اور اللّٰہم ربنا ولک الحمد۔

۲:۔ عن ابی وائل قال کان علی وعبد الله لا یجهران ببسم الله الرحمٰن الرحیم ولا بالتعوذ ولا بالتامین۔ (مجمع الزوائد ص۱۰۸ ج۲)

ابو وائل کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ اور حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو بلند آواز سے نہیں کہتے تھے نہ اعوذ باللہ کو نہ آمین کو۔

قال الہیثمی رواہ الطبرانی فی الکبیر۔ وفیہ ابو سعد البقال وھو ثقۃ مدلس۔

۳: عن ابی وائل قال لم یکن عمر وعلی یجھران ببسم اللہ الرحمٰن الرحیم ولا بآمین (رواہ ابن جریر الطبری فی تھذیب الآثار الجوھر النقی ص ۱۳۰ ج ۱)

ابو وائل کہتے ہیں کہ حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما نہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم بلند آواز سے کہتے اور نہ آمین کو۔

۴: مصنف عبدالرزاق (ص ۸۷ ج ۲) میں حضرت ابراہیم نخعیؒ کا ارشاد نقل کیا ہے۔

اربع یخفضھن الامام۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ والاستعاذۃ وآمین واذا قال سمع اللہ لمن حمدہ قال ربنا لک الحمد۔

چار چیزیں ایسی ہیں کہ امام ان کا اخفا کرے گا۔ بسم اللہ الرحمٰن۔ اعوذ باللہ۔ آمین، اور سمع اللہ لمن حمدہ کے بعد ربنا لک الحمد۔

دوسری روایت میں ہے۔

خمس یخفین سبحانک اللھم وبحمدک والتعوذ وبسم اللہ الرحمٰن الرحیم وآمین. واللھم ربنا لک الحمد۔

پانچ چیزیں خفیہ کہی جاتی ہیں سبحانک اللھم وبحمدک۔ اعوذ باللہ۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم آمین اور اللھم ربنا لک الحمد۔

سوال ششم: رفع یدین کا مسئلہ:

س ۶: رفع الیدین صحاح ستہ سے کثرت سے اصحاب رسولؐ روایت کرتے ہیں جن کی تعداد تقریباً دس سے زائد ہے۔ بعض پچاس سے بھی زائد کہتے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ احناف اس سنت کو ترک کر رہے ہیں، اور اپنانے سے ہچکچاتے ہی نہیں نماز کو فاسد بھی قرار دیتے ہیں۔ اگر یہ حکم منسوخ ہے تو مدلل ثبوت کم از کم تین اصحاب رسولؐ سے (جو راوی کے اعتبار سے معتبر سمجھے جاتے ہوں) واضح فرمائیں۔

ج ۶: رفع یدین کے مسئلہ میں بھی حنفیہ کا موقف ٹھیک سنت نبویؐ کے مطابق ہے اس کو

سمجھنے کے لیے چند امور کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

اوّل: تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین باجماع امت مستحب ہے[1] اور باقی مقامات میں اختلاف ہے۔ (نووی؛ شرح مسلم ص۱۶۸ ج۱) اور اس اختلاف کا منشا یہ ہے کہ اس سلسلہ میں روایات بھی مختلف وارد ہوئی ہیں اور سلف صالحین کا عمل بھی مختلف رہا ہے۔ چنانچہ:

(۱ ـــــ بعض روایات میں صرف تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین کا ذکر ہے۔ (اس سلسلہ کی احادیث آگے ذکر کی جائیں گی۔)

۲ ـــــ بعض روایات میں رکوع میں جاتے اور رکوع سے اٹھتے وقت بھی رفع یدین کا ذکر ہے۔ یہ چونکہ خود سوال میں مذکور ہے اس لیے اس کا حوالہ دینے کی ضرورت نہیں

۳: ـــــ بعض روایات میں سجدہ کو جاتے ہوئے بھی رفع یدین کا ذکر ہے (مثلاً حدیث مالک بن الحویرث رضی اللہ عنہ ـ نسائی ص۱۶۵ ج۱ ص۱۷۲)

۴ ـــــ بعض روایات میں دونوں سجدوں کے درمیان بھی رفع یدین کا ذکر ہے۔ (مثلاً حدیث ابن عباس رضؓ ـــ ابوداؤد ص۱۰۸ نسائی ص۱۷۲)

۵ ـــــ بعض روایات میں دوسری رکعت کے شروع میں بھی رفع یدین کا ذکر ہے۔ (مثلاً حدیث وائل بن حجرؓ واذا رفع رأسہ من السجود" ابوداؤد ص۱۰۵)

۶ ـــــ بعض روایات میں تیسری رکعت کے شروع میں بھی رفع یدین کا ذکر ہے۔ (مثلاً حدیث ابن عمرؓ صحیح بخاری ص۱۰۲ ج۱: " واذا قام من الرکعتین رفع یدیہ" حدیث ابی حمید الساعدی؛ ابوداؤد ص۱۰۶ ج۱ ترمذی ص۴۰ ج۱: ثم اذا قام من الرکعتین کبّر ورفع۔

حدیث ابی ہریرہ؛ ابوداؤد ص۱۰۸، حدیث ابن عمرؓ؛ ابوداؤد ص۱۰۹، حدیث علی؛ ابوداؤد ص۱۰۹ وص۱۱۱)

۷ ـــــ بعض روایات میں ہر اونچ نیچ پر (عند کل خفض ورفع) رفع یدین کا ذکر ہے۔ (مثلاً حدیث عمیر بن حبیب؛ ابن ماجہ ص۶۲ یرفع یدیہ مع کل تکبیر)

رفع یدین کی یہ تمام صورتیں احادیث کی کتابوں میں مروی ہیں۔ اور سلف صالحین کے یہاں معمول بہا رہی ہیں لیکن امام شافعیؒ و احمدؒ صرف تین موقعوں پر رفع یدین کو مستحب سمجھتے ہیں باقی جگہ نہیں اور امام

---

[1] بعض حضرات اس موقعہ پر رفع یدین کے وجوب کے قائل ہیں۔

ابوحنیفہؒ اور (مشہور اور معتمد علیہ روایت کے مطابق) امام مالکؒ صرف تحریمہ کے وقت مستحب سمجھتے ہیں باقی جگہ نہیں جس طرح امام شافعیؒ اور امام احمدؒ باقی مقامات کے رفع یدین کو ترک کرنے کی وجہ سے تارک سنت نہیں کہلاتے اور نہ ان کے بارے میں کوئی شخص یہ کہے گا کہ وہ سنت کو اختیار کرنے سے ہچکچاتے ہیں۔ اسی طرح اگر امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک دلائل و ترجیحات کی بنا پر یہ محقق ہوا کہ تحریمہ کے وقت رفع یدین سنت ہے۔ اور باقی مواقع میں ترک رفع یدین سنت ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کو تارک سنت کا خطاب دیا جائے۔ یا سنت کو اختیار کرنے میں ہچکچاہٹ کا الزام دیا جائے۔

دوم: تین مقامات (تحریمہ۔ رکوع اور قومہ) میں رفع یدین کی جو احادیث مروی ہیں ان میں خاصا انتشار و اضطراب ہے اور وہ مختلف طرق سے مختلف الفاظ کے ساتھ مروی ہیں۔ مثال کے طور پر یہاں ان دو حدیثوں کا ذکر مناسب ہوگا جو رفع یدین کی احادیث میں سب سے اصح اور سب سے قوی سمجھی جاتی ہیں اور امام بخاریؒ و امام مسلمؒ نے صحیحین میں رفع یدین کے استدلال میں صرف انہی دو حدیثوں پر اکتفا کیا ہے۔ ایک حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت جو اس باب کی سب سے صحیح ترین حدیث سمجھی جاتی ہے۔ اور دوسری حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ کی حدیث جو اس سے دوسرے درجہ پر ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث کے طرق ملاحظہ ہوں۔

۱۔ مدونہ کبریٰ ص۷۱ ج۱ میں ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں صرف تحریمہ کے وقت رفع یدین کا ذکر ہے۔ اور اسی روایت کی بنا پر امام مالکؒ نے ترک رفع یدین کو اختیار کیا ہے۔

۲۔ امام بخاری کے استاذ امام حمیدی کی مسند (ص۲۷۷ ج۲ میں اور صحیح ابوعوانہ ص۹۰ ج۲) میں تحریمہ کے سوا باقی مقامات میں رفع یدین کی نفی ہے (یہ حدیث آگے ترک رفع یدین کے دلائل میں مسلسل پر ذکر کروں گا)

۳۔ مؤطا امام مالکؒ کی روایت میں صرف دو جگہ رفع یدین کا ذکر ہے تحریمہ کے وقت اور رکوع سے اٹھتے وقت۔ اور سجدوں میں رفع یدین کی نفی ہے۔

۴۔ صحیح بخاری ص۱۰۲ ج۱ اور صحیح مسلم ص۱۶۸ ج۱ کی روایت میں تین جگہ رفع یدین کا ذکر ہے۔ اور سجدوں کے درمیان رفع یدین کی نفی ہے۔

۵ ـــ صحیح بخاری صفحہ ۱۰۲ ج ۱ کی ایک روایت میں ان تین جگہوں کے علاوہ تیسری رکعت میں بھی رفع یدین کا ذکر ہے۔

۶ ـــ امام بخاری کے رسالہ جزء القراۃ (ص ۱۱ اور مجمع الزوائد ص ۱۰۲ ج ۲ وغیرہ) کی روایت میں ان چار جگہوں کے علاوہ سجدہ کے لیے رفع یدین کا بھی ذکر ہے۔

۷ ـــ امام طحاویؒ کی مشکل الآثار کی روایت میں ہر اونچ نیچ (کل خفض و رفع) رکوع وسجود، قیام وقعود اور سجدوں کے درمیان رفع یدین کا ذکر ہے (فتح الباری ص ۱۸۵ ج ۲ بحوالہ معارف السنن ص ۴۶۷ ج ۲)

حدیث مالک بن حویرثؓ کے طرق۔

۱ ـــ صحیح بخاری ص ۱۰۲ ج ۱ وصحیح مسلم ص ۱۶۸ ج ۱ کی روایت میں صرف تین جگہ رفع یدین کا ذکر ہے۔ تکبیر تحریمہ۔ رکوع کو جاتے وقت اور رکوع سے اٹھتے وقت۔

۲ ـــ سنن نسائی (ص ۱۶۵ ج ۱) کی ایک روایت میں ان تین جگہوں کے علاوہ چوتھی جگہ سجدہ سے اٹھتے وقت بھی رفع یدین کا ذکر ہے۔

۳ ـــ اور سنن نسائی ہی کی ایک روایت میں پانچ جگہ رفع یدین کا ذکر ہے۔ تین مندرجہ بالا مقامات۔ سجدہ کو جاتے ہوئے اور سجدہ سے اٹھتے ہوئے۔ (ص ۱۶۵ ج ۱)

۴ ـــ اور مسند ابو عوانہ ص ۹۵ ج ۲ کی روایت میں ہے "كان يرفع يديه حيال اذنيه في الركوع والسجود" یعنی رکوع اور سجدہ میں رفع یدین کرتے تھے۔

یہ ان دو حدیثوں میں اختلاف روایت کا نقشہ ہے جو محدثین کے نزدیک رفع یدین کے باب میں سب سے قوی اور سب سے صحیح ہیں۔ اور جن پر امام بخاری ومسلم نے اکتفا کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس اختلاف کی موجودگی میں کسی ایک روایت کو لے کر باقی روایات کو ترک کرنا ہوگا۔ اس لیے اگر امام شافعیؒ واحمدؒ یا ان دونوں کے متبعین نے ایک روایت کو ترجیح دے کر باقی صحیح روایات کو ترک کر دیا تو ان پر ترک سنت کا الزام نہیں۔ بلکہ یوں کہا جائے گا کہ سنت کی جو مختلف صورتیں مروی ہیں ان میں سے ایک سنت کو انہوں نے اختیار کر لیا۔ اسی طرح امام ابوحنیفہؒ ومالکؒ اور ان کے متبعین نے بھی ان صورتوں میں سے سنت ہی کی ایک صورت کو اختیار کیا ہے۔ اس لیے ان کو بھی ترکِ سنت کا الزام دینا صحیح نہیں۔

امام بخاریؒ اور امام شافعیؒ کو کوئی شخص یہ الزام نہیں دے سکتا کہ چونکہ انہوں نے مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ کی حدیث رفع یدین فی السجود کو اختیار نہیں کیا اس لیے وہ سنت کو اپنانے سے ہچکچاتے رہیں۔ بلکہ یوں کہا جائے گا کہ ان کے نزدیک اس سنت کے مقابلہ میں ترک رفع یدین کی سنت راجح ہے۔ اور یہ روایات مرجوح ہیں۔ اس لیے وہ اس سنت پر عامل رہیں۔ یہی نیک گمان امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ اور ان کے مقتداؤں اور مقتدیوں کے بارے میں بھی رکھنا چاہیے۔ اور اگر کوئی شخص ائمہ ہدیٰ اور سلف صالحین کے حق میں اس قدر حسنِ ظن سے بھی محروم ہے تو اس کے حق میں دعائے خیر ہی کی جا سکتی ہے۔

سوم: فریقِ مخالف میں سے بعض حضرات، جنہوں نے رفع یدین کے مسئلہ پر قلم اٹھایا ہے۔ ان کے طرزِ نگارش سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ رکوع کو جاتے وقت اور رکوع سے اٹھتے وقت رفع یدین کرنا ہی سنتِ نبوی ہے۔ اور ترکِ رفع یدین گویا ایک بدعت ہے جو حنفیوں نے گھڑ لی ہے۔ حاشا و کلّا کہ امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ ایسے اکابر ائمہ کوئی بدعت ایجاد کر لیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان مواقع پر (بلکہ ان کے علاوہ دوسرے مواقع پر بھی) جس طرح رفع یدین احادیث سے ثابت ہے گو بعض صورتیں معمول بہا نہیں اسی طرح تکبیر تحریمہ کے سوا باقی مواضع میں ترک رفع یدین بھی سنت متواترہ اور سلف صالحین کے توارث و تعامل سے ثابت ہے۔

ذرا غور فرمائیے کہ امام مالکؒ جو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ایک یا دو واسطوں سے شاگرد ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کا عمل گویا ان کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ جن کو محدثین، "امام دار الہجرت، رأس المتقین وکبیر المثبتین" کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ اور جن کی روایت کو (عن نافع عن ابن عمرؓ) امام بخاریؒ وغیرہ اصح الاسانید اور سلسلۃ الذھب شمار کرتے ہیں، ، رفع یدین کی پوری احادیث ان کے سامنے تھیں اس کے باوجود مدونہ کبریٰ (ص ۶۹ ج ۱) میں ان کا ارشاد نقل کیا ہے۔

قال مالک لا اعرف رفع الیدین فی شئ من تکبیر الصلوٰۃ لا فی خفض ولا فی رفع الا فی افتتاح	امام مالکؒ نے فرمایا کہ تکبیر تحریمہ کے سوا نماز کی کسی تکبیر میں، میں رفع یدین کو نہیں جانتا، نہ کسی جھکنے کے موقعہ پر نہ کسی اٹھنے کے

الصلوٰۃ، قال ابن القاسم وکان رفع الیدین عند مالکؒ ضعیفاً

موقعہ پر، ابن قاسمؒ کہتے ہیں کہ امام مالکؒ کے نزدیک رفع یدین ضعیف تھا۔"

مدینہ طیبہ مہبط وحی، مہاجرین و انصار کا مسکن، اجلّہ صحابہؓ کا مستقر اور تین خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کا دار الخلافہ ہے۔ اسی مدینہ طیبہ میں بیٹھکر امام مالکؒ —— جو اہل مدینہ کے علوم کے وارث ہیں —— فرماتے ہیں کہ میں تکبیر تحریمہ کے سوا کسی تکبیر میں رفع یدین سے واقف نہیں ہوں۔ انصاف کیجئے اگر ترک رفع یدین تواتر سے ثابت نہ ہوتا اور خلفائے راشدین سے لیکر اکابر تابعین تک اہل مدینہ میں ترک رفع یدین کی سنت رائج نہ ہوتی۔ تو کیا امام دار الھجرت، رأس المتقین وسلطان المحدثین یہ فرما سکتے تھے کہ میں تحریمہ کے سوا نماز کی کسی تکبیر میں رفع یدین سے واقف نہیں ہوں۔ اور کیا ان کے شاگرد عبد الرحمٰن بن قاسمؒ یہ نقل کر سکتے تھے کہ رفع الیدین امام مالکؒ کے نزدیک ضعیف مسلک تھا؟

اور اس پر بھی غور کیجئے کہ کوفہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں عساکرِ اسلامی کی چھاؤنی تھا جس میں ڈیڑھ ہزار صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین فروکش ہوئے۔ جن میں —————— تین سو اصحاب بیعت رضوان اور ستر بدری صحابہؓ شامل تھے۔ (مقدمہ نصب الرایہ) کوفہ کے معلّم اواخر عہد عثمانی تک حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ تھے۔ اور حضرتِ علیؓ کے دورِ خلافت سے کوفہ اسلام کا دار الخلافہ بن گیا تھا۔ اسی کوفہ کے بارے میں امامِ عراقی نے شرح تقریب میں امام محمد بن نصر المروزی سے نقل کیا ہے۔

لا نعلم مصراً من الامصار ترکوا باجماعھم رفع الیدین عند الخفض والرفع فی الصلوٰۃ الا اھل الکوفۃ۔ فکلھم لا یرفع الا فی الاحرام۔
(اتحاف شرح احیاء العلوم صـ۵۲ ج ۳)

ہمیں شہروں میں سے کوئی شہر معلوم نہیں کہ وہاں کے لوگوں نے نماز میں جھکنے اور اٹھنے کے وقت رفع الیدین بالاجماع ترک کیا ہو۔ سوائے اہل کوفہ کے کہ وہ سب کے سب تحریمہ کے سوا کسی جگہ رفع یدین نہیں کرتے۔

مطلب یہ ہے کہ تمام بلاد اسلامیہ میں جہاں ترک رفع یدین کے عامل ہیں وہاں رفع یدین کے عامل بھی رہے ہیں۔ ایک کوفہ ایسا شہر ہے جس کے تمام علماً و فقہا قدیماً و حدیثاً ہمیشہ ترکِ رفع یدین پر عمل پیرا رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اہلِ کوفہ میں وہ صحابہ کرامؓ بھی شامل ہیں جو دورِ فاروقی سے دورِ مرتضوی تک کوفہ میں رونق افروز ہوئے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور دیگر اکابر صحابہؓ سے استفادہ کے علاوہ کوفہ کے اکابر تابعین حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کے دورِ خلافت میں خلفائے راشدین اور دیگر اکابر صحابہ سے استفادہ کرنے کے لئے مدینہ طیبہ بھی حاضری دیتے رہے۔ اگر ترک رفع یدین پر خلفائے راشدین اور اکابر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا عمل نہ ہوتا تو کیا کوفہ کے تمام صحابہ و تابعین ترک رفع یدین پر متفق ہو سکتے تھے۔ الغرض صدر اول میں مدینہ طیبہ اور کوفہ کے حضرات کا ترک رفع یدین پر متفق ہونا اس امر کی علامت ہے کہ ترک رفع یدین صدر اول میں متواتر و متوارث چلا آتا تھا۔ اور یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت متواترہ ہے جس پر صحابہؓ و تابعینؒ عامل رہے۔

اور پھر اس پر بھی غور کیجئے کہ حضرات محدثین جہاں رفع یدین کا باب قائم کرتے ہیں وہاں ترکِ رفع یدین کا باب بھی رکھتے ہیں۔ چنانچہ امام نسائی نے "رفع الیدین للرکوع" کے بعد "الرخصۃ فی ترک ذالک" کا "رفع الیدین عند الرفع من الرکوع" کے بعد "الرخصۃ فی ترک ذالک" کا (ص۱۶۱ ج۱) "باب رفع الیدین للسجود" کے بعد "ترک رفع الیدین عند السجود" کا (ص۱۶۵) اور "باب رفع الیدین عند الرفع من السجدۃ الاولیٰ" کے بعد "ترک ذالک بین السجدتین" کا (ص۱۷۲ ج۱) عنوان قائم کیا ہے۔

امام ابوداؤد نے "باب رفع الیدین" اور "باب افتتاح الصلوٰۃ" کے بعد "باب من لم یذکر الرفع عند الرکوع" رکھا ہے۔ (ص۱۰۹ ج۱)

ترمذی شریف کے ہندوستانی نسخوں میں "ترک رفع یدین" کا باب سہو کتابت کی وجہ سے رہ گیا ہے۔ ورنہ صحیح نسخوں میں باب کا لفظ موجود ہے۔ اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ امام ترمذیؒ نے باب رفع الیدین عند الرکوع" کے تحت حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث نقل کی ہے۔ اور اس کے ذیل میں "وفی الباب" کہہ کر ان صحابہ کرام کی فہرست دی ہے جن سے رفع یدین کی احادیث مروی

ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث ترک رفع یدین پر نقل کی ہے۔ اور اس کے ذیل میں فرماتے ہیں۔

وفی الباب عن البراء بن عازب ۔ قال ابو عیسٰی حدیث ابن مسعود حدیث حسن۔ وبہ یقول غیر واحد من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم والتابعین وھو قول سفیان واھل الکوفۃ (ص ۳۵ ج ۱)	اس باب میں براء بن عازبؓ سے بھی حدیث مروی ہے۔ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن مسعودؓ کی حدیث حسن ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے صحابہؓ اور تابعین اسی کے قائل ہیں۔ یہی امام سفیان ثوریؒ کا اور اہل کوفہ کا قول ہے۔

"فی الباب" کا لفظ بتاتا ہے کہ انہوں نے حدیث ابن مسعودؓ سے پہلے ترک رفع یدین پر مستقل باب باندھا ہے۔ چنانچہ مولانا قطب الدینؒ "مظاہر حق" میں لکھتے ہیں: "ترمذی نے دو باب لکھے ہیں۔ اول رفع یدین میں۔ دوسرا باب عدم رفع یدین میں"۔ ——— اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نسخہ میں دوسرا باب بھی ہوگا۔

نصب الرایہ کے حاشیہ ص ۳۹۴ ج ۱ پر ہے کہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے شیخ عبداللہ بن سالم البصریؒ کے نسخہ میں (جو پیر جھنڈا کے کتب خانہ میں موجود تھا) عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث سے پہلے "باب من لم یرفع یدیہ الا فی اول مرۃ" کا باب موجود ہے۔ اسی طرح شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے نسخہ میں بھی ——— جیسا کہ "شرح سفر السعادۃ" میں ہے۔ علامہ احمد محمد شاکر مصریؒ شرح ترمذی ص ۴۰ ج ۲ میں لکھتے ہیں۔ شیخ محمد عابد سندھیؒ کے نسخہ ترمذی میں بھی یہاں باب کا عنوان موجود ہے، اور اس نسخہ کے بارے میں موصوف لکھتے ہیں: "وھذہ النسخۃ ہی اصح النسخ التی وقعت لی من کتاب الترمذی" (مقدمہ شرح ترمذی ص ۱۴) "یہ سب سے صحیح تر نسخہ ہے جو کتاب ترمذی کا مجھے میسر آیا"۔

خود شیخ احمد محمد شاکر نے شرح ترمذی میں جو متن لیا ہے، اس کے بارے میں فرماتے ہیں۔

ولم اکتب حرفا واحدا الا | میں نے اس کا ایک ایک حرف ثبت و یقین

عن ثبت ویقین وبعد بحث واطمینان (شرح ترمذی ص۱۲) کے ساتھ اور بحث واطمینان کے بعد لکھا ہے

اس متن میں انہوں نے حدیث عبداللہ بن مسعودؓ سے پہلے باب کا عنوان اس طرح تحریر فرمایا ہے۔ "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ باب ماجاء ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لم یرفع الامرۃ"

(شرح ترمذی ج۲ ص۴۰)

الغرض اکابر محدثین جہاں رفع الیدین کا باب قائم کرتے ہیں وہاں ترک رفع الیدین کا باب بھی قائم کرتے ہیں۔ اور امام ترمذیؒ اس کو بہت سے صحابہؓ وتابعینؒ کا مسلک بتاتے ہیں اگر "ترک رفع یدین" بدعت ہوتا۔ جیسا کہ بعض حضرات یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں تو کیا یہ اکابر محدثین بدعات کے اثبات کے لیئے عنوانات قائم کرتے تھے۔ اور پھر اگر ترک رفع یدین کی سنت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہ ہوتی تو بہت سے صحابہ وتابعین (علیہم الرضوان) اس کو کیسے اختیار فرما سکتے تھے۔

اس تمام تر بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ ترک رفع یدین سنت نبویؐ ہے۔ اور یہ سنت صحابہؓ وتابعینؒ کے دور سے لے کر آج تک امت میں متواتر ومتوارث چلی آتی ہے۔ اس لیے اس کو بدعت سمجھ کر سرے سے اس کی نفی کر دینا انصاف سے بعید ہے۔ ہاں ترجیح میں گفتگو ہو سکتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ پہلے وہ دلائل ذکر کیے جائیں جن کی بنا پر حنفیہ ومالکیہ ترکِ رفع یدین کی سنت کے قائل ہیں۔ اور پھر ان امور کو ذکر کیا جائے جن کی وجہ سے ترک رفع یدین کو رفع یدین پر ترجیح دیتے ہیں۔ واللہ الموفق۔

ترک رفع یدین کے دلائل

حدیث ابن عمرؓ:

۱۔۔۔ صحیح ابوعوانہ ج۲ ص۹۰ میں بروایت سفیان بن عیینہ عن الزھری عن سالم عن ابیہ یہ حدیث ذکر کی ہے۔

قال رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا افتتح الصلوٰۃ — ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ جب

رفع یدیہ حتی یحاذی بھما	نماز شروع کرتے تب آپ اپنے دونوں ہاتھ کندھوں
وقال بعضھم حذو منکبیہ۔	کے برابر تک اٹھاتے ــــ اور جب رکوع کا ارادہ
واذا اراد ان یرکع وبعد ما یرفع	کرتے اور رکوع سے اٹھتے تو ہاتھ نہیں
رأسہ من الرکوع لا یرفعھما۔ وقال	اٹھاتے تھے۔ اور سجدوں کے درمیان
بعضھم ولا یرفع بین السجدتین۔	بھی نہیں اٹھاتے تھے۔
والمعنیٰ واحد۔	

۲ ـــــ امام ابو عوانہؒ نے سفیان تک اس کی چار سندیں ذکر کی ہیں چوتھی سند امام بخاریؒ کے استاذ حمیدیؒ کی ہے۔

"حدثنا الصائغ بمکۃ قال حدثنا الحمیدی قال حدثنا سفیان عن الزھری قال اخبرنی سالم عن ابیہ قال رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مثلہ"

چنانچہ مسند حمیدی (ص ۲۷۷ ج ۲ حدیث نمبر ۶۱۴) میں یہ حدیث اسی سند سے اور انہی الفاظ میں مذکور ہے۔

حدثنا الحمیدی (قال حدثنا سفیان[1]	حمیدی سفیان سے۔ وہ زہری سے۔ وہ
قال حدثنا الزھری قال اخبرنی	سالم بن عبد اللہ سے، وہ اپنے والد سے
سالم بن عبد اللہ عن ابیہ قال	روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ
رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ	صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ جب نماز
وسلم اذا افتتح الصلوٰۃ رفع یدیہ	شروع کرتے تو دونوں ہاتھ کندھوں
حذو منکبیہ، واذا اراد ان	تک اٹھاتے۔ اور جب رکوع کا ارادہ
یرکع وبعد ما یرفع رأسہ	کرتے اور رکوع سے سر اٹھاتے تو رفع
فلا یرفع۔ ولا بین	یدین نہیں کرتے تھے اور نہ دونوں
السجدتین۔	سجدوں کے درمیان۔

---

[1] بین القوسین کی عبارت طباعت کی غلطی سے رہ گئی ہے۔ جیسا کہ اس مقام کے حاشیہ سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔

صحیح ابوعوانہ کی احادیث کا صحیح ہونا سب کو مسلّم ہے۔ اور مسند حمیدی کی یہ حدیث نہ صرف صحیح ہے۔ بلکہ صحیح ترین سند سے مروی ہے۔ امام حمیدیؒ (عبد اللہ بن الزبیر بن عیسیٰ القرشی الحُمیدی المکی المتوفیٰ ۲۱۹ھ) امام بخاری کے استاذ ہیں۔ صحیح ابوعوانہ اور مسند حمیدی کی مذکورہ بالا احادیث نہ صرف صحیح ہے بلکہ صحیح ترین سند سے مروی ہے۔

۳ــــ مدونہ کبریٰ ص۷۱ ج۱ میں ہے۔

ابن وھب وابن القاسم عن	ابن وہب اور ابن القاسم امام مالکؒ سے
مالک عن ابن شہاب عن	وہ ابن شہاب زہری سے، وہ سالم سے،
سالم عن ابیہ ان رسول اللّٰہ	وہ اپنے والد حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ
صلی اللّٰہ علیہ وسلم کان	عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ
یرفع یدیہ حذو منکبیہ اذا	صلی اللہ علیہ وسلم کندھوں تک ہاتھ
افتتح الصلوٰۃ۔	اٹھاتے تھے۔ جب نماز شروع فرماتے تھے۔

یہ سند بھی اصح الاسانید ہے۔ اس میں صرف افتتاح صلوٰۃ کے وقت رفع یدین ذکر کیا گیا ہے۔ اور اسی حدیث کی بنا پر امام مالکؒ نے ترک رفع یدین قبل الرکوع وبعد الرکوع کا مسلک اختیار کیا ہے۔ جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں رکوع سے قبل وبعد رفع یدین کا ذکر امام مالکؒ کے نزدیک صحیح نہیں۔ صحیح ابوعوانہ اور مسند حمیدی کی روایت میں اس کی صراحت گزر چکی ہے۔

۴ــــ نصب الرایہ ص۴۰۴ ج۱ میں خلافیات بیہقی کے حوالے سے یہ حدیث اس طرح نقل کی گئی ہے

عن عبد اللّٰہ بن عون الخرّاز[1]	عبد اللہ بن عون الخراز مالک سے وہ زہری
عن مالک عن الزھری عن	سے، وہ سالم سے۔ وہ عبد اللہ بن عمر
سالم عن ابن عمر رضی اللّٰہ عنھما	رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ

---

[1] بخاء معجمۃ، بعدہا راء مہملۃ، آخرہ زاء معجمۃ (نصب الرایہ وتقریب)۔

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یرفع یدیہ اذا افتتح الصلوٰۃ ثم لا یعود ۔	نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رفع یدین کیا کرتے تھے جب نماز شروع فرمائیں۔ پھر دوبارہ نہیں کرتے تھے۔

اس حدیث کو نقل کر کے امام بیہقیؒ امام حاکمؒ کے حوالے فرماتے ہیں ۔

ھذا باطل موضوع، ولا یجوز ان یذکر الا علی سبیل القدح . فقد رویناالاسانید الصحیحۃ عن مالک بخلاف ھذا ۔	یہ حدیث باطل موضوع ہے۔ اور جائز نہیں کہ اس کو ذکر کیا جائے ۔ مگر بطور اعتراض۔ کیونکہ ہم نے صحیح اسانید کے ساتھ امام مالک سے اس کے خلاف روایت کیا ہے۔

مگر امام حاکم کا یہ فیصلہ یکطرفہ ہے۔ اگر اس کی سند میں کسی راوی پر کلام ہے تو اس کو ذکر کرنا چاہیے تھا۔ لیکن اگر راوی سب کے سب ثقہ اور قابل اعتماد ہیں تو ان کی روایت کو باطل اور موضوع کہنا تحکم ہے۔ اور ان کی یہ دلیل بھی ناکافی ہے کہ ہم نے امام مالک سے صحیح اسانید کے ساتھ اس کے خلاف روایت کیا ہے ۔ اس لئے کہ اسانید صحیحہ کے ساتھ امام مالک سے ترک رفع یدین کی حدیث بھی منقول ہے۔ اور خود امام مالکؒ کا مسلک بھی ترک رفع یدین ہے۔ تو کیا امام حاکم، مالکیہ کو یہ اجازت دیں گے کہ چونکہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ترک رفع یدین امام مالکؒ سے صحیح اسانید کے ساتھ منقول ہے اور چونکہ ترک ہی کی روایت امام مالکؒ کے نزدیک صحیح اور معتمد علیہ ہے اور چونکہ اسی روایت پر امام مالکؒ نے ترک رفع یدین کو اختیار کیا ہے ۔ اس لیے ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں رفع یدین کا ذکر ——— باطل اور موضوع ہے۔ ظاہر ہے کہ محض ایسے قرائن اور قیاسات سے ثقہ راویوں کی حدیث کو موضوع کہنا صحیح نہیں ۔

اس لیے امام العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ نے نیل الفرقدین ص۱۲۷ میں صحیح لکھا ہے ۔

ھذا حکم من الحاکم لا یکفی ولا یشفی	حاکم کا یہ حکم ناکافی اور غیر تسلی بخش ہے ۔

۵ — عن ابن عباس و ابن عمر رضی اللہ عنہم عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال	ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

ترفع الایدی فی سبعۃ مواطن۔ افتتاح الصلوٰۃ۔ واستقبال البیت۔ والصفا والمروۃ۔ والموقفین۔ وعند الحجر — (نصب الرایہ ص۳۹ بحوالہ مسند بزار)

نے فرمایا، رفع یدین سات جگہ کیا جاتا ہے۔ نماز کے شروع میں، استقبال بیت اللہ کے وقت، صفا و مروہ پر، وقوف عرفات میں، وقوف مزدلفہ میں، اور حجر اسود کے پاس۔

اس حدیث کے بارے میں محدثین کی رائے ہے کہ یہ موقوف ہے۔ تاہم یہ موقوف بھی مرفوع کے حکم میں ہے خصوصاً جب کہ اس کو مرفوعاً بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اور دیگر احادیث بھی اس کی مؤید ہیں۔

حدیث ابن مسعودؓ

۱ — عن علقمۃ قال قال عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ الا اصلی بکم صلوٰۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فصلی فلم یرفع یدیہ الا فی اول مرۃ۔

حضرت علقمہ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز پڑھاؤں؟ پھر آپ نے نماز پڑھائی۔ پس پہلی مرتبہ کے سوا رفع یدین نہیں کیا۔

(ترمذی ص۳۵ ج۱۔ نسائی ص۱۶۱ ج۱۔ ابوداؤد ص۱۰۹ ج۱)

امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔ اور حافظ ابن حزمؒ نے محلّی (ص۸۸ ج۴) میں اسے صحیح کہا ہے۔

علامہ احمد محمد شاکر شرح ترمذی میں فرماتے ہیں کہ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے اور بعض نسخوں میں "حسنٌ صحیحٌ" ہے۔ مگر چونکہ بہت سے حضرات نے ترمذی سے اس کی تحسین ہی نقل کی ہے اس لیے علامہ موصوف نے "حسن صحیح" کے نسخہ کو مرجوح قرار دیا ہے۔ اس حدیث پر بعض محدثین نے جو کلام کیا ہے اس کو مسترد کرتے ہوئے علامہ موصوف فرماتے ہیں۔

وھذا الحدیث صحیح صححہٗ ابن حزم وغیرہٗ من الحفاظ وما قالوا فی تعلیلہ لیس بعلۃ۔

یہ حدیث صحیح ہے۔ ابن حزمؒ اور دیگر حفاظِ حدیث نے اس کو صحیح کہا ہے۔ اور لوگوں نے اس کی تعلیل میں جو کچھ بیان کیا ہے وہ

(صہ۲۲۴ ج۲) علت نہیں۔

۲۔۔۔ عن علقمة عن عبد الله رضی الله عنه قال الا اخبركم بصلٰوة رسول الله صلی الله علیه وسلم قال فقام رفع یدیه اوّل مرة ثم لم یعد۔ (نسائی صہ۱۵۸ ج۱)

حضرت علقمہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کیا تمہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کی خبر نہ دوں! پس کھڑے ہوئے پس پہلی مرتبہ رفع یدین کیا، پھر دوبارہ نہیں کیا۔

اس حدیث کی سند صحیح ہے۔ (اعلاء السنن صہ۴۵ ج۳)

۳۔۔۔ عن علقمة عن عبد الله عن النبی صلی الله علیه وسلم انه کان یرفع یدیه فی اوّل تکبیرة ثم لا یعود۔

حضرت علقمہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صرف پہلی تکبیر میں رفع یدین کرتے تھے۔ پھر دوبارہ نہیں کرتے تھے۔ (طحاوی: شرح معانی الآثار صہ۱۱۰ ج۱)

اس کی سند بھی قوی ہے۔ (نیل الفرقدین صہ۶۰)

۴۔۔۔ ابو حنیفة عن حماد عن ابراهیم عن الاسود ان عبد الله بن مسعود رضی الله عنه کان یرفع یدیه فی اوّل التکبیر ثم لا یعود الی شیئ من ذالك ویأثر ذالك عن رسول الله صلی الله علیه وسلم (مسند امام اعظم صہ۵۰ ج۱)

امام ابو حنیفہؒ اپنے شیخ حمادؒ سے وہ ابراہیم نخعی سے وہ اسود سے نقل کرتے ہیں کہ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ پہلی تکبیر میں رفع یدین کیا کرتے تھے۔ اس کے بعد نماز کے کسی حصہ میں نہیں کرتے تھے اور وہ اس عمل کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں۔

حضرت امام ابو حنیفہؒ کی روایت کے طرق کو مولانا ابو الوفا افغانیؒ نے حاشیۂ کتاب الآثار میں جمع کر دیا ہے۔

امام ابو حنیفہؒ نے اس حدیث کی بنا پر ترک رفع یدین کو اختیار کیا ہے۔ اس لیے یہ ان کی جانب سے حدیث

کی تصحیح ہے۔

۵ ـــــ عن محمد بن جابر عن حماد بن ابی سلیمان عن ابراهیم عن علقمة عن عبد الله رضی الله عنه قال صلّیت مع رسول الله صلّی الله علیه وسلّم وابی بکر وعمر۔ فلم یرفعوا ایدیهم الّا عند استفتاح الصلوٰة۔

محمد بن جابر حماد بن ابی سلیمان سے۔ وہ ابراہیم نخعی سے۔ وہ علقمہ سے۔ وہ عبد اللہ بن مسعودؓ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اور حضرات ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ نماز پڑھی ہے۔ وہ تکبیر تحریمہ کے سوا رفع یدین نہیں کرتے تھے۔

(سنن دارقطنی ص۱۱۱، سنن بیہقی ص۷۹ ج۲، نصب الرایہ ص۳۹۶ ج۱، مجمع الزوائد ص۱۰۱ ج۲)

یہ حدیث محمد بن جابر یمامی کی روایت سے ہے۔ جو صدوق تھے۔ مگر نابینا ہو گئے تھے اس لئے ان کی احادیث میں اختلاط ہو گیا تھا۔ بعض محدثین نے محمد بن جابر کی وجہ سے اس روایت کو کمزور کہا ہے۔ اور ابن جوزیؒ ایسے متشددین نے (جو بعض اوقات صحیح بخاری کی احادیث کو بھی موضوع کہہ جاتے ہیں) اس کو موضوع تک قرار دیا ہے۔ لیکن محمد بن جابر سے امام شعبہ ایسے اکابر محدثین نے روایت کی ہے۔ (جیساکہ نصب الرایہ ص۳۹۷ ج۱ میں نقل کیا ہے) اور دارقطنی ص۱۱۱ میں ہے کہ اسحاق بن ابی اسرائیل اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

وبه ناخذ فی الصلوٰة کلها۔ — پوری نماز میں ہمارا عمل اسی حدیث پر ہے۔

اس تصریح سے واضح ہوتا ہے کہ یہ روایت محمد بن جابر کے اختلاط سے پہلے زمانہ کی ہے۔ اس لئے اس کے صحیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

علاوہ ازیں اس حدیث کا مضمون متواتر روایات سے ثابت ہے۔ کیونکہ اس حدیث میں دو باتیں کہی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ ابن مسعودؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم اور حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے پیچھے نمازیں پڑھی ہیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی عاقل اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ حضرات تکبیر تحریمہ کے علاوہ رفع یدین نہیں کرتے تھے۔ اور جیساکہ پہلے لکھ چکا ہوں کہ یہ مضمون بھی متواتر ہے۔

چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایات میں مختلف طرق اور صحیح اسانید سے یہ مضمون مروی ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کا نقشہ دکھایا۔ اور اس میں رفع یدین نہیں فرمایا، اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ان کے اصحاب سے ایک روایت بھی اس کے خلاف مروی نہیں۔ اور یہ ناممکن ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات شیخینؓ کی سنت تو رفع یدین ہو اور حضرت ابن مسعودؓ، حضرت علیؓ اور ان کے اصحاب اس سنت کو ترک کر دیں۔ پس جب محمد بن جابر کی روایت کے دونوں مضمون تواتر سے ثابت ہیں تو اس حدیث کے ثبوت میں کیا شبہ ہے؟

حدیث جابر بن سمرہؓ:

عن تمیم بن طرفة عن جابر بن سمرة رضی الله عنه قال خرج علینا رسول الله صلی الله علیه وسلم فقال مالی اراکم رافعی ایدیکم کانها اذناب خیل شمس اسکنوا فی الصلوٰة۔	حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس گھر سے باہر تشریف لائے تو فرمایا کیا بات ہے تمہیں رفع یدین کرتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ گویا وہ بدکے ہوئے گھوڑوں کی دُمیں ہیں۔ نماز میں سکون اختیار کرو۔

(صحیح مسلم ص۱۸۱ ج۱، سنن نسائی ج۱ ص۱۷۶، ابوداؤد ص۱۴۳ ج۱)

اس حدیث کی صحت میں کسی کو کلام نہیں۔ البتہ بعض حضرات نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اس حدیث میں سلام کے وقت اشارہ کرنے کی ممانعت فرمائی ہے جیسا کہ صحیح مسلم ہی میں حضرت جابر بن سمرہؓ کی دوسری حدیث ہے۔

کنا اذا صلینا مع رسول الله صلی الله علیه وسلم قلنا السلام علیکم ورحمة الله السلام علیکم ورحمة الله۔ واشار بیده الی الجانبین فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم	ہم جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھتے تھے تو السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہتے وقت دونوں جانب ہاتھ سے اشارہ کیا کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، تم ہاتھوں سے اشارہ کس لئے

علام تؤمون بایدیکم کانہا اذناب خیل شمس۔ انما یکفیکم ان یضع یدہ علی فخذہ ثم یسلم علی اخیہ من علی یمینہ و شمالہ (صحیح مسلم ص۱۸۱ ج۱)

کرتے ہو، جیسے وہ بدکے ہوئے گھوڑوں کی دُمیں ہوں، تمہارے لیے یہی کافی ہے کہ ہاتھ رانوں پر رکھے ہوئے دائیں بائیں اپنے بھائی کو سلام کیا کرو۔

ان دونوں حدیثوں میں چونکہ "کانہا اذناب خیل شمس" کا فقرہ آگیا ہے غالباً اسی سے ان حضرات کا ذہن اس طرف منتقل ہو گیا ہے کہ یہ دونوں حدیثیں ایک ہی واقعہ سے متعلق ہیں، لیکن جو شخص ان دو حدیثوں کے سیاق پر غور کریگا اسے یہ سمجھنے میں قطعاً دشواری نہیں ہوگی کہ یہ دونوں الگ الگ واقعہ سے متعلق ہیں اور ان دونوں کا مضمون ایک دوسری سے یکسر مختلف ہے۔ چنانچہ ۔

۱۔ پہلی حدیث میں ہے کہ ہم اپنی اپنی نماز میں مشغول تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور دوسری حدیث میں نماز باجماعت کا ذکر ہے۔

۲۔ پہلی حدیث میں ہے کہ آپؐ نے صحابہؓ کو نماز میں رفع یدین کرتے دیکھا اور اس پر نکیر فرمائی اور دوسری حدیث میں ہے کہ سلام کے وقت دائیں بائیں اشارہ کرنے پر نکیر فرمائی۔

۳۔ پہلی حدیث میں ہے کہ آپؐ نے نماز میں سکون اختیار کرنے کا حکم فرمایا۔ اور دوسری میں ہے کہ آپ نے سلام پھیرنے کا طریقہ بتایا۔

۴۔ اور پھر یہ دونوں حدیثیں الگ الگ سندوں سے مذکور ہیں۔ پہلی حدیث کے راوی دوسرے واقعہ کی طرف کوئی اشارہ نہیں کرتے۔ اور دوسری حدیث کے راوی پہلے واقعہ سے کوئی تعرض نہیں کرتے۔

اس لیے دونوں حدیثوں کو جن کا الگ الگ مخرج ہے۔ الگ الگ قصہ ہے۔ الگ الگ حکم ہے، ایک ہی واقعہ سے متعلق کہہ کر دل کو تسلی دے لینا کسی طرح بھی صحیح نہیں۔

اور اگر بطور تنزل تسلیم بھی کر لیا جائے کہ دونوں حدیثوں کی شانِ ورود ایک ہی ہے۔ تب بھی یہ مسلمہ اصول ہے کہ خاص واقعہ کا اعتبار نہیں ہوتا۔ بلکہ الفاظ کے عموم کا اعتبار ہوتا ہے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رفع یدین پر نکیر فرمائی ہے۔ اور اس کے بجائے نماز میں سکون اختیار کرنے کا حکم فرمایا ہے

اس سے ہر صاحب فہم یہ سمجھے گا کہ رفع یدین سکون کے منافی ہے۔ اور آپؐ نے اسے ترک کرنے کا حکم فرمایا ہے۔ مزید یہ کہ جب بوقت سلام رفع یدین کو سکون کے منافی سمجھا گیا حالانکہ وہ نماز سے خروج کی حالت ہے تو نماز کے عین وسط میں سکون کی ضرورت اس سے بدرجہا بڑھ کر ہوگی۔

حدیث ابن عباسؓ:

۱ ـــ عن ابن عباس رضی الله عنهما عن النبی صلی الله علیه وسلم قال لا ترفع الایدی الا فی سبعة مواطن حین یفتتح الصلوٰة، وحین یدخل المسجد الحرام فینظر الی البیت، وحین یقوم علی الصفا، وحین یقوم المروة، وحین یقف مع الناس عشیة عرفة، وبجمع۔

(رواہ الطبرانی۔ نصب الرایہ ص ۲۹۰ ج ۱)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، رفع یدین نہیں کیا جاتا مگر سات جگہوں میں، جب نماز شروع کرے، جب مسجد حرام میں داخل ہو کر بیت اللہ کو دیکھے، جب صفا پر کھڑا ہو، جب مروہ پر کھڑا ہو جب عرفہ کی شام کو لوگوں کے ساتھ عرفات میں وقوف کرے۔ اور مزدلفہ میں۔

۲ ـــ عن ابن عباس رضی الله عنهما ان النبیّ صلی الله علیه وسلم قال السجود علی سبعة اعضاء، الیدین، والقدمین، والرکبتین، والجبهة۔ ورفع الایدی اذا رأیت البیت، وعلی الصفا والمروة، وبعرفة، وعند رمی الجمار۔ واذا قمت للصلوٰة ـــ (ایضاً)

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا سجدہ سات اعضا پر ہوتا ہے۔ دونوں ہاتھ۔ دونوں قدم۔ دونوں گھٹنے اور پیشانی۔ اور رفع یدین کیا جاتا ہے جب تم بیت اللہ کو دیکھو، صفا و مروہ پر، عرفات میں، رمی جمار کے وقت، اور جب تم نماز کے لیے کھڑے ہو۔

امام ہیثمیؒ مجمع الزوائد صـ۲۴۸ ج۲ میں ان احادیث کو ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں ۔

و فی الاسناد الاول محمد بن ابی لیلی وھو سیئ الحفظ وحدیثہ حسن انشاء اللہ ۔ و فی الثانی عطاء بن السائب وقد اختلط ۔	پہلی سند میں محمد بن ابی لیلی ہیں، جو سیئ الحفظ ہیں۔ اور ان کی حدیث انشاء اللہ حسن ہے۔ اور دوسری میں عطاء بن السائب ہیں ان کا حافظہ آخری زمانے میں گڑبڑ ہو گیا تھا۔

نواب صدیق حسن خان صاحب نزول الابرار صـ۴۴ میں فرماتے ہیں :

من حدیث ابن عباسؓ بسند جید ۔	ابن عباسؓ کی حدیث سے سند جید کے ساتھ ۔

(بحوالہ نور المصباح صـ۶۹)

دوسری روایت حافظ سیوطیؒ نے جامع صغیر میں بھی ذکر کی ہے ۔ اس کی شرح السراج المنیر صـ۴۵۸ میں علامہ عزیزی نے اس کو حدیث صحیح کہا ہے ۔ (نیل الفرقدین صـ۱۱۸)

۳ ـــ عن ابن عباس رضی اللہ عنھما قال لا ترفع الایدی الا فی سبع مواطن، اذا قام الی الصلوٰۃ و اذا رأی البیت و علی الصفا والمروۃ و فی عرفات و فی جمع و عند الجمار ۔	ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا رفع یدین صرف سات جگہوں میں کیا جاتا ہے۔ جب نماز کیلئے جب کھڑا ہو۔ جب بیت اللہ کو دیکھے صفا مروہ پر۔ عرفات میں، مزدلفہ میں اور رمی جمار کے وقت

(مصنف ابن ابی شیبہ صـ۲۳۷)

محدثین کو اس حدیث کا موقوف ہونا مسلّم ہے۔ تاہم اگر موقوف بھی ہو تو حکماً مرفوع ہے ۔ خصوصاً جب کہ مرفوعاً بھی ثابت ہے ۔

حدیث البراء بن عازبؓ :

۱ ـــ عن البراء بن عازب رضی اللہ	حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے

عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا افتتح الصلوۃ رفع یدیہ الی قریب من اذنیہ ثم لا یعود ۔ وفی روایۃ مرۃ واحدۃ وفی روایۃ ثم لم یرفعہما حتی انصرف وفی روایۃ ثم لا یرفعہما حتی یفرغ ۔ (ابوداؤد ص۱۰۹ ج۱ مصنف عبدالرزاق ص۷۱ ج۲ طحاوی ص۱۱۰ ج۱ مصنف ابن ابی شیبہ ص۲۳۶ ج۱)

روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز شروع کرتے تو کانوں کے قریب تک ہاتھ اٹھاتے اس کے بعد نہیں اٹھاتے تھے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ پھر نماز سے فارغ ہونے تک رفع یدین نہیں کرتے تھے۔

۲ ــــ عن شعبۃ عن یزید بن ابی زیاد قال سمعت ابن ابی لیلی یقول سمعت البراء رضی اللہ عنہ فی ہذا المجلس یحدث قوماً منہم کعب ابن عجرۃ رضی اللہ عنہ قال رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حین افتتح الصلوۃ یرفع یدیہ فی اول تکبیرۃ ۔ (دارقطنی ص۱۱۱)

امام شعبہ یزید بن ابی زیاد سے روایت کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ میں نے ابن ابی لیلی سے سنا وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کو اس مجلس میں ایک جماعت کے سامنے، جن میں حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے ۔ یہ حدیث بیان کرتے ہوئے سنا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ جب نماز شروع کرتے تو صرف پہلی تکبیر میں رفع یدین کرتے تھے۔

یہ حدیث ترک رفع یدین پر نص صریح ہے ، بعض حضرات نے "ثم لا یعود" کی زیادتی کو یزید بن ابی زیاد کے اختلاط وتلقین کا نتیجہ قرار دیا ہے ۔ مگر یہ رائے بوجوہ غلط ہے ۔
ایک یہ کہ دارقطنی کی روایت میں "ثم لا یعود" کے بجائے "فی اول تکبیرۃ" کا لفظ ہے ۔ اور جن روایتوں میں "ثم لا یعود" کا لفظ نہیں ان کا مفہوم بھی اس کے سوا کیا ہے کہ صرف پہلی تکبیر میں رفع یدین کیا ۔

دوم یہ کہ اس میں وہ واقعہ بھی ذکر کیا گیا ہے جس موقع پر حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث بیان کی تھی۔ اور یہ انکے کمال ضبط کی علامت ہے۔

سوم :۔ یزید سے اس روایت کو یزید کے اکابر اصحاب نقل کر رہے ہیں۔
مثلاً امام سفیان ثوری[1]، سفیان بن عیینہ[2]، اسماعیل بن زکریا[3]، شعبہ[4]، اسرائیل بن ابی اسحاق[5]، نضر بن شمیل[6]، حمزہ زیات[7]، ہشیم[8]، شریک[9]، محمد بن ابی لیلی[10] ——— کوئی وجہ نہیں کہ ان اکابر کی ایک پوری جماعت کی روایت کے بعد بھی اس لفظ کو غیر محفوظ کہا جائے، حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی حدیث چونکہ متعدد طرق سے مروی ہے اس لیے اس کو محدثین کے اصول پر صحیح ہے۔

چہارم :۔ عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ، جو حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے اس حدیث کی روایت کرتے ہیں، ترک رفع یدین پر عامل تھے (مصنف ابن ابی شیبہ ص۲۳۷ ج۱) اس سے واضح ہے کہ ترک رفع یدین ہی ان کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت تھی جو انہوں نے صحابہ کرامؓ سے سیکھی تھی۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ یزید کی روایت بالکل صحیح ہے۔

پنجم :۔ دار قطنی کی روایت میں جو واقعہ ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت براء بن عازبؓ نے صحابہ وتابعین کے مجمع میں یہ حدیث بیان کی تھی، اس سے ترک رفع یدین کی سنت اور مؤکد ہو جاتی ہے۔

مرسل عباد بن عبداللہ بن الزبیر :

۱ ——— عن عباد بن الزبیر ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا افتتح الصلوٰۃ رفع یدیہ فی اوّل الصلوٰۃ ثم لم یرفعھما فی شیٔ حتیٰ یفرغ۔	عباد بن زبیر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز شروع کرتے تھے تو فقط پہلی تکبیر میں رفع یدین کرتے تھے پھر نماز سے فارغ ہونے تک کسی جگہ رفع یدین نہیں کرتے تھے۔

(نصب الرایہ ص۴۰۴ ج۱ بحوالہ خلافیات بیہقی)

۲ ——— بسط الیدین ص۵۳ میں المواہب اللطیفہ کے حوالہ سے یہ روایت مفصل نقل کی ہے۔

عن محمد بن ابی یحییٰ قال صلیت	محمد بن ابی یحییٰ کہتے ہیں کہ میں نے عباد بن

الیٰ جنب عباد بن عبد اللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہم. قال فجعلت ارفع ایدی فی کل رفع وخفض قال یا ابن اخی رأیتک ترفع فی کل رفع وخفض وان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا افتتح الصلوٰۃ رفع یدیہ فی اول صلوٰۃ ثم لم یرفعھما فی شئ حتی یفرغ۔	عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم کے پہلو میں نماز پڑھی میں ہر اونچ نیچ میں رفع یدین کرنے لگا انہوں نے فرمایا بھتیجے! میں نے تجھے دیکھا ہے کہ تم ہر اونچ نیچ میں رفع یدین کر رہے تھے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جب نماز شروع کرتے تھے تو صرف پہلی تکبیر میں رفع یدین کرتے تھے۔ پھر آپؐ نے نماز سے فارغ ہونے تک رفع یدین نہیں کیا۔

عباد بن عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما تابعی ہیں۔ اس لیے یہ روایت مرسل ہے۔ اور مرسل روایت جب کہ اس کی سند صحیح ہو، امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام احمدؒ اور اکثر فقہاء کے نزدیک حجت ہے۔ اور اگر اس کی تائید دوسری روایات سے ہو تو بالاتفاق حجت ہے۔ (نووی مقدمہ شرح مسلم ص۱۷)

زیر نظر حدیث کی سند بھی صحیح اور ثقہ ہے، اور اس کی تائید میں بہت سی احادیث بھی موجود ہیں اس لیے اس کے حجت ہونے میں کسی کو شبہ نہیں۔ اور حضرت عبادؒ کا محمد بن ابی یحییٰ کے رفع یدین پر نکیر فرمانا اور صرف اول تکبیر میں رفع یدین کو سنت قرار دینا اس امر کی دلیل ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری عمل ترک رفع یدین ہے۔

مزید احادیث:۔

یہ تو وہ احادیث تھیں جن میں تکبیر تحریمہ کے سوا ترک رفع یدین کی تصریح موجود ہے۔ ان کے علاوہ وہ احادیث بھی ترک رفع یدین کی دلیل ہیں جن میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کی کیفیت بیان فرمائی اور اس کا پورا نقشہ کھینچ کر دکھایا۔ مگر رفع یدین کا ذکر نہیں فرمایا۔ ان احادیث کا متن پیش کرنا طوالت کا موجب ہوگا۔ اس لئے صرف کتابوں کے حوالے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

۱ حدیث ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ :-

موطا امام مالک ص ۲۶، موطا امام محمد ص ۸۸، کتاب الأم للشافعی ج ۱ ص ۹۵
عبدالرزاق ص ۶۲ ج ۲، ابن ابی شیبہ ص ۲۴۱ ج ۱، مسند احمد ج ۲ ص ۲۳۶، ۲۷۰، ۳۱۹، ۴۱۷،
۴۳۴، ۴۵۲، ۴۵۴، ۵۰۰، ۵۰۲، ۵۲۷۔ سنن دارمی ص ۱۳۷، صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۰۸
ص ۱۰۹، صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۶۹، سنن ابی داؤد ج ۱ ص ۱۲۱ سنن نسائی صفحات ج ۱ ۱۵۸، ۱۴۳،
۱۴۱، منتقی ابن الجارود ص ۴۷، حدیث ۱۹۱ صحیح ابن خزیمہ صفحات ج ۱ ۲۹۰، ۲۹۱،
حدیث نمبر بالترتیب ۵۷۸، ۵۷۹، صحیح ابی عوانہ صفحات ج ۲ ۹۵، ۹۶ شرح معانی
الآثار للطحاوی ج ۱ ص ۱۰۸ سنن بیہقی صفحات ج ۲ ۶۷، ۱۱۸، ۳۷۳، مسند ابی داؤد
الطیالسی ج ۹ ص ۲۰۵، حدیث نمبر ۲۲۲۰ اور ج ۱۰ ص ۳۱۳ حدیث نمبر ۲۲۷۴،

۲ حدیث انس بن مالک رضی اللہ عنہ :-

مسند ابی داؤد الطیالسی ج ۸ ص ۲۷۶ حدیث نمبر ۲۰۷۶، مصنف عبدالرزاق ج ۲ ص ۶۴ مصنف ابن ابی شیبہ
ج ۱ ص ۲۴۴ مسند احمد صفحات ج ۳ ۱۲۵، ۱۳۲، ۲۵۱، ۲۵۷، ۲۶۲ سنن نسائی ج ۱ ص ۱۴۶، طحاوی ج ۱ ص ۱۰۸،
بیہقی ج ۲ ص ۶۷،

۳ حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہما :-

مسند احمد ج ۲ ص ۴۷، ص ۱۵۲، سنن نسائی ج ۱ ص ۱۹۴، ۱۹۵ صحیح ابن خزیمہ ج ۱ ص ۲۸۹ حدیث ۵۷۶

۴ حدیث ابی مالک الاشعری :-

عبدالرزاق ج ۲ ص ۶۳، مصنف ابن ابی شیبہ صفحات ج ۱ ۲۴۰، ۲۴۱، مسند احمد ج ۵ ص ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳،

۵ حدیث ابی موسیٰ رضی اللہ عنہ :-

مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱ ص ۲۴۱، مسند احمد ج ۴ ص ۳۹۲، ۴۰۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۵۔ طحاوی
ج ۱ ص ۱۰۸، البزار ج ۲ ص ۱۳۱،

۶ حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما :-

مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱ ص ۲۴۱، مسند احمد ج ۱ ص ۲۱۸، ۲۵۰، ۲۹۲، ۳۲۷، ۳۵۵، ۳۲۹،
۳۵۱، صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۰۸، صحیح ابن خزیمہ ج ۱ ص ۲۹۰، ۲۹۳، طحاوی ج ۱ ص ۱۰۸، بیہقی ج ۲ ص ۶۸،

۷ ـــ حدیث جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ :-

مسند ابی داؤد الطیالسی ص۲۳۶ ج۷ ، حدیث ۱۶۹۹ ، مسند بزار ص۱۳۱ ج۲

۸ ـــ حدیث ابی سعید الخدری رضی اللہ عنہ :-

مسند احمد ص۱۸ ج۳ ، صحیح بخاری ص۱۱۳ ج۱ ، صحیح ابن خزیمہ ص۲۹۱ حدیث ۵۸۰ ، مستدرک حاکم ص۲۲۳ ج۱ ، بیہقی ص۱۸ ج۲ ،

۹ ـــ حدیث ابی مسعود البدری رضی اللہ عنہ :-

طحاوی ص۱ ج۱

۱۰ حدیث رفاعۃ البدری رضی اللہ عنہ :-

مسند ابی داود الطیالسی ص۱۹۶ ج۶ حدیث ۱۳۷۲ ، کتاب الام للشافعی ص۸۸ ج۱ ، مصنف عبد الرزاق ص۲ ج۲ حدیث ۳۷۳۹ ، مصنف ابن ابی شیبہ ص۲۸۷ ج۱ ، مسند احمد ص۳۴۰ ج۴ ، مسند دارمی ص۱۵۸ ، سنن ابی داؤد ص۱۲۵ ج۱ ، ترمذی ص۶۶ ج۱ ، سنن نسائی ص۱۶۱ ج۱ ، ۱۸۰ ، ۱۹۳ ، منتقی ابن الجارود ص۶۰ ، صحیح ابن خزیمہ ص۲۷۴ ج۱ ، حدیث ۵۴۵ ، طحاوی ص۱۱۲ ج۱ ، مستدرک حاکم ص۲۴۲ ج۱ ، بیہقی ص۳۷۲ ج۲ ، ۳۷۳ ، البغوی ص۷ ، ۹ ، ۱۰ ،

آثار صحابہ و تابعینؒ :

۱ ـــ حضرت صدیق اکبر اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما رفع یدین نہیں کرتے تھے (دیکھئے حدیث عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نمبر ۵)

۲ ـــ عن الاسود قال صلیت مع عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فلم یرفع یدیہ فی شیٔ من صلوٰۃ الا حین افتتح الصلوٰۃ ـ

حضرت اسود فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ نمازیں پڑھی ہیں، وہ نماز کے شروع کے علاوہ کسی جگہ بھی رفع یدین نہیں کرتے تھے ـ

قال عبد الملک ورأیت الشعبی وابراھیم وابا اسحاق لا یرفعون ایدیھم الاحین یفتتحون الصلوٰۃ (طحاوی ص۱۱۱ ج۱، مصنف ابن ابی شیبہ ص۲۳۶ ج۱، نصب الرایہ ص۴۰۵ ج۱)

یہ سند صحیح ہے (نصب الرایہ)

عبد الملک (راوی حدیث) کہتے ہیں کہ میں نے شعبی، ابراہیم نخعی اور ابو اسحاق کو دیکھا ہے کہ وہ ابتدائے نماز کے سوا رفع یدین نہیں کرتے تھے۔

۳۔ عن عاصم بن کلیب عن ابیہ ۔۔۔ وکان من اصحاب علیؓ ان علی بن ابی طالب کرّم اللہ وجھہٗ کان یرفع یدیہ فی التکبیرۃ الاولیٰ التی یفتتح بہ الصلوٰۃ ثم لا یرفعھما فی شئ من الصلوٰۃ۔

عاصم بن کلیب اپنے والد سے روایت کرتے ہیں، جو حضرت علی کرّم اللہ وجہہ کے اصحاب میں سے تھے، کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نماز کی صرف پہلی تکبیر میں رفع یدین کرتے تھے۔ اس کے بعد نماز کے کسی حصہ میں رفع یدین نہیں کرتے تھے۔

(مؤطا امام محمد ص۹۴، طحاوی ص۱۱۱ ج۱، مصنف ابن ابی شیبہ ص۲۳۶ ج۱) نصب الرایہ ص۴۰۶ ج۱ میں فرماتے ہیں: "وہو اثر صحیح"۔ حافظ ابن حجرؒ الدرایہ ص۸۵ (طبع دہلی) میں فرماتے ہیں: "رجالہ ثقات وہو موقوف"

۴۔ عن ابراھیم عن عبد اللہ رضی اللہ عنہ انہٗ کان یرفع یدیہ فی اوّل ما یستفتح ثم لا یرفعھما (مصنف ابن ابی شیبہ ص۲۳۶ ج۱) (طحاوی ص۱۳۳ ج۱)

حضرت ابراہیم نخعی فرماتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نماز کے شروع میں رفع یدین کیا کرتے تھے پھر نہیں کرتے تھے۔

اس کی سند صحیح ہے (نصب الرایہ) اور امام طحاوی نے شرح الآثار ص۱۳۳ ج۱ میں، امام ترمذیؒ نے کتاب العلل ط۲۲۹ ج۲ اور ابن سعد نے طبقات ص۱۹۰ ج۶ میں امام اعمشؒ سے نقل کیا ہے کہ میں نے حضرت ابراہیمؒ سے عرض کیا کہ آپ جب حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث بیان کیا کریں تو اس کی سند

ذکر کیا کیجئے (کہ فلاں صاحب سے آپ نے یہ حدیث سنی ہے) وہ فرمانے لگے کہ جب میں یہ کہوں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے یوں فرمایا تو یہ بات میں نے آپ کے شاگردوں کی ایک پوری جماعت سے سنی ہوتی ہے۔ اور جب کسی خاص شخص کے حوالے سے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل کروں تو یہ حدیث میں نے صرف انہی صاحب سے سنی ہوتی ہے ــــــ امام بیہقی نے سنن ص۱۴۸ ج۱ میں یحییٰ بن معینؒ سے نقل کیا ہے کہ ابراہیم نخعی کی مرسل روایتیں صحیح ہیں سوائے دو حدیثوں کے حدیث تاجر البحرین اور ضحک فی الصلوٰۃ (حاشیہ نصب الرایہ ص۴۰ ج۱)

۵ ــــ عن مجاهد قال ما رأيت ابن عمر يرفع يديه الا في اوّل ما يفتتح۔	امام مجاہد فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو ابتدائے نماز کے سوا رفع یدین کرتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔
(طحاوی ص۱۱۰ ج۱، مصنف ابن ابی شیبہ ص۲۳۷ ج۱)	

امام ابن ابی شیبہ نے یہ روایت ابوبکر بن عیاش سے انہوں نے حصین سے اور انہوں نے مجاہد سے نقل کی ہے، یہ سند بخاری و مسلم کی شرط پر ہے، چنانچہ صحیح بخاری کتاب التفسیر ص۷۲۵ ج۲ میں ابوبکر بن عیاش عن حصین کی سند موجود ہے۔ اس لیے اس روایت کے صحیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث کے تحت عرض کر چکا ہوں کہ ان سے مختلف احادیث مروی ہیں۔ رفع یدین کی بھی اور ترک رفع یدین کی بھی ــــــ ان کا یہ عمل، جو امام مجاہد نے نقل کیا ہے، ترک رفع یدین کی روایت کے مطابق ہے۔

۶ ــــ امام محمد موطا ص۹۰ میں اور کتاب الحجہ ص۹۵ ج۱ میں امام مالکؒ سے روایت کرتے ہیں۔

اخبرني نعيم المجمر و ابو جعفر القاري ان ابا هريرة كان يصلي بهم فيكبر كلما خفض و رفع۔ و كان يرفع يديه حين يكبر و يفتتح الصلوٰة۔	امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ مجھے نعیم بن عبداللہ المجمر اور ابوجعفر القاری نے بتایا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ان کو نماز پڑھاتے تھے تو ہر اونچ نیچ میں تکبیر کہتے تھے اور رفع یدین نماز کے شروع میں تکبیر تحریمہ کے وقت کرتے تھے۔
یہ اثر بھی نہایت صحیح ہے۔	

۷۔ مصنف ابن ابی شیبہ ص۲۳۷ ج۱ میں ہے۔

حدثنا وکیع وابو اسامۃ عن شعبۃ عن ابی اسحاق قال کان اصحاب عبد اللہ واصحاب علی لا یرفعون ایدیھم الا فی افتتاح الصلوٰۃ۔ قال وکیع ثم لا یعودون:

ہم سے وکیع اور ابواسامہ نے بیان کیا، شعبہ سے، انہوں نے ابواسحاق سے، کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے اصحاب اور حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کے اصحاب صرف نماز کے شروع میں رفع یدین کیا کرتے تھے۔

یہ سند بھی نہایت صحیح ہے، اور اس امر کی دلیل ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کے اصحاب کا ترک رفع یدین پر اجماع تھا۔

۸۔ حدثنا یحیی بن سعید عن اسماعیل قال کان قیس یرفع یدیہ اول ما یدخل فی الصلوٰۃ ثم لا یرفعھما (حوالہ مذکور)

اسماعیل کہتے ہیں کہ حضرت قیس بن ابی حازمؒ صرف نماز شروع کرتے وقت رفع یدین کرتے تھے پھر نہیں کرتے تھے۔

قیس بن ابی حازم البجلی الکوفیؒ اکابر تابعین میں سے ہیں، حافظؒ تقریب میں لکھتے ہیں کہ انہوں نے زمانۂ نبوت پایا۔ اور کہا جاتا ہے کہ ان کو شرف رؤیت بھی حاصل ہے، انہی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کو عشرہ مبشرہ سے روایت کا اتفاق ہوا ہے۔ سنہ ۹۰ھ کے بعد یا اس سے پہلے انتقال ہوا۔ سِن مبارک سو سے متجاوز تھا۔ اور قویٰ میں تغیر پیدا ہو گیا تھا۔"

یہ جلیل القدر تابعی جن کی یہ منفرد خصوصیت ہے کہ عشرہ مبشرہ سے روایت کرتے ہیں۔ ترک رفع یدین پر عامل تھے۔ اگر ترک رفع یدین اکابر صحابہ کے زمانہ میں متواتر نہ ہوتا تو یہ اس پر عامل نہ ہوتے۔

۹۔ عن الاسود وعلقمۃ انھما کانا یرفعان ایدیھما اذا افتتحا ثم لا یعودان (ایضاً ص۲۳۷ ج۱)

حضرت اسودؒ و علقمہؒ صرف نماز شروع کرتے وقت رفع یدین کرتے تھے پھر دوبارہ نہیں کرتے تھے۔

۱۰۔ حدثنا معاویۃ بن ھشیم عن سفیان بن مسلم الجھنی قال کان ابن ابی لیلی یرفع یدیہ اول شئ اذا کبر۔	سفیان بن مسلم جہنی کہتے ہیں کہ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ صرف پہلی تکبیر کے وقت رفع یدین کیا کرتے تھے۔
۱۱۔ عن خیثمہ وابراھیم۔ کانا لا یرفعان ایدیھما الا فی بدء الصلوٰۃ (ص۲۳۶ ج۱)	حضرت خیثمہ اور حضرت ابراہیم نخعیؒ دونوں رفع یدین نہیں کرتے تھے مگر نماز کی ابتدا میں۔
۱۲۔ عن ابراھیم قال لا ترفع یدیک فی شئ من الصلوٰۃ الا فی الافتتاحۃ الاولی (ص۲۳۶ ج۱)	حضرت ابراہیم نخعیؒ فرماتے ہیں کہ تکبیر تحریمہ کے سوا نماز کے کسی حصہ میں رفع یدین مت کرو۔
۱۳۔ عن ابراھیم انہ کان یقول اذا کبرت فی فاتحۃ الصلوٰۃ فارفع یدیک ثم لا ترفعھما فی ما بقی (ایضاً)	حضرت ابراہیم نخعیؒ فرمایا کرتے تھے کہ جب تکبیر تحریمہ کہو تو رفع یدین کرو باقی نماز میں مت کرو۔

حضرات اسودؒ و علقمہؒ، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے جلیل القدر شاگرد اور اکابر تابعین میں سے ہیں، حضرت اسود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں بھی دو سال رہے ہیں اور ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے بھی خصوصی تلمذ تھا۔ حضرت ابراہیم نخعیؒ بھی جلیل القدر تابعی ہیں۔ صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں فتویٰ دیا کرتے تھے۔

۱۴۔ حدثنا ابن مبارک عن اشعث عن الشعبی انہ کان یرفع یدیہ فی اول التکبیر ثم لا یرفعھما (ایضاً)	اشعث کہتے ہیں کہ امام شعبیؒ صرف پہلی تکبیر کے وقت رفع یدین کرتے تھے پھر نہیں کرتے تھے۔

۱۵۔ شرح آثار طحاوی ص۱۱۲ ج۱ میں ابوبکر بن عیاش کا قول صحیح سند سے نقل کیا ہے۔

ما رأیت فقیھا قط یفعلہ یرفع یدیہ فی غیر التکبیرۃ الاولی	میں نے کسی فقیہ کو کبھی ایسا کرتے نہیں دیکھا کہ وہ تکبیر تحریمہ کے سوا رفع یدین کرتا ہو۔

ترک رفع یدین کے وجوہ ترجیح

یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ و تابعینؒ سے ترک رفع یدین کا عمل متواتر ہے۔ اب یہ معلوم کر لینا بھی مناسب ہے کہ اہل کوفہ و اہل مدینہ اور مالکیہ نے ترک رفع یدین کو کن وجوہ سے راجح قرار دیا۔

۱ــــ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ جو عمل اوفق بالقرآن ہو وہ راجح ہے۔ قرآن کریم میں ان مومنین کی مدح فرمائی ہے جو نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں۔ "الذین هم فی صلوتهم خاشعون" (المؤمنون:۲)
"(جو لوگ کہ اپنی نماز میں خشوع کرتے ہیں) اور خشوع کے معنی سکون کے ہیں۔

گویا نماز میں جس قدر ظاہری و باطنی قلباً و قالباً سکون ہوگا اسی قدر خشوع ہوگا۔ اور اوپر سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ کی حدیث سے معلوم ہو چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رفع یدین سے منع کرتے ہوئے نماز میں سکون اختیار کرنے کا حکم فرمایا، اس سے واضح ہوتا ہے کہ ترک رفع یدین اوفق بالقرآن ہے۔

۲ــــ اوپر روایات سے معلوم ہو چکا ہے کہ رفع یدین مواضع ثلاثہ کے علاوہ بھی متعدد مواضع میں ہوتا تھا۔ مگر صحیح روایات کے مطابق باقی مواضع میں سے رفع یدین سب کے نزدیک متروک ہے۔ اور تحریمہ کے وقت رفع یدین سب کے نزدیک سنت ہے۔ دو جگہوں میں اختلاف ہے۔ پس حنفیہ و مالکیہ نے متفق علیہ کو اختیار کر لیا، اور جس چیز میں اختلاف اور تردد تھا اسے ترک کر دیا۔

۳ــــ نماز میں حرکت سے سکون کی طرف تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں جیسا کہ ابوداؤد میں "تحویلات ثلاثہ" کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے، اس کے برعکس یہ نہیں ہوا کہ پہلے نماز میں سکون ہوتا ہو پھر حرکات شروع ہو گئی ہوں۔ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے رفع یدین کی روایات بھی مروی ہیں اور ترک رفع یدین کی بھی۔ مندرجہ بالا اصول کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری عمل ترک رفع یدین تھا۔

۴ــــ امام حازمیؒ نے متعارض روایات میں ترجیح کے جو اصول بیان فرمائے ہیں ان میں سے دوسرا اصول یہ بیان کیا ہے کہ ایک روایت کا راوی اگر حفظ و اتقان میں دوسرے سے بڑھ کر ہو تو اس کی روایت مقدم ہوگی ـــــ "الوجه الثانی ان یکون احد الراویین احفظ و اتقن" (ص۱۱)

۵ــــ دسواں اصول یہ لکھا ہے کہ ایک راوی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ کا زیادہ قرب حاصل ہو تو اس کی

روایت مقدم ہوگی ۔

"العاشر: ان یکون احد الراویین اقرب مکانا من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فحدیثہ اولی بالتقدیم" (ص۱۲)

۶ ـــ گیارہواں اصول یہ لکھا ہے کہ اگر ایک راوی کا اپنے شیخ سے زیادہ تعلق رہا ہو۔ اور اسے شیخ سے طویل صحبت رہی ہو تو اس کی روایت مقدم ہوگی "الحادی عشر: ان یکون احد الراویین اکثر ملازمۃ لشیخہ۔ فان طول الصحبۃ لہ زیادۃ تاثیر فیرجح بہ" (کتاب الاعتبار ص۱۳)

۷ ـــ تئیسواں اصول یہ لکھا ہے، جب دو روایتوں کے راوی حفظ و اتقان میں یکساں ہوں مگر ان میں سے ایک روایت کے راوی فقیہ ہوں ۔ اور احکام کے عارف ہوں تو ان کی روایت مقدم ہوگی۔

"الثالث والعشرون: ان یکون رواۃ احد الحدیثین مع تساویہم فی الحفظ والاتقان فقہاء عارفین باجتناء الاحکام من مثمرات الالفاظ۔ فالاسترواح الی حدیث الفقہاء اولی" (ص۱۵)

یہ چار اصول جو امام حازمیؒ نے ارشاد فرمائے ہیں ان کو زیر بحث مسئلہ پر منطبق کیجئے۔ رفع یدین کی روایات حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت مالک بن حویرث اور حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں (گو ان کے الفاظ میں بھی اختلاف و اضطراب ہے) ادھر ترک رفع یدین کی احادیث حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں۔ اور حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے عمل کی تائید ان کو حاصل ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم ضبط و اتقان میں بھی فائق ہیں۔ طولِ صحبت میں بھی۔ اور تفقہ فی الدین میں بھی۔ امام ذہبی تذکرۃ الحفاظ (ج ا ص ۱۳ و ما بعد) میں لکھتے ہیں۔

ابن مسعود الامام الربانی صاحب	ابن مسعود: امام ربانی۔ آنحضرت صلی اللہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و	علیہ وسلم کے رفیق اور خادم۔
خادمہ واحد السابقین الاولین	سابقین اولین اور اکابر اہل بدر میں سے۔
ومن کبار البدریین، ومن	تھے، بلند پایہ فقہاء اور مقربین میں ان کا
نبلاء الفقہاء والمقربین کان	شمار تھا۔ الفاظِ حدیث کے ادا کرنے میں
ممن یتحری فی الاداء ویشدد فی	بڑی احتیاط کرتے تھے روایت میں بڑی
الروایۃ ویزجر تلامذتہ عن التہاون	سختی فرماتے تھے اپنے تلامذہ کو ضبط الفاظ

فی ضبط الالفاظ وکان یقل من الروایۃ للحدیث ویتورع، وکان تلامذتہ لا یفضلون علیہ احدا من الصحابۃ۔ وکان من سادات الفقہاء واوعیۃ العلم وائمۃ الھدیٰ"

میں سستی کرنے پر ڈانٹ پلاتے تھے۔ حدیث کی روایت بہت کم کرتے تھے، اور اس بارے میں خاص احتیاط و ورع سے کام لیتے تھے ان کے تلامذہ ان پر کسی صحابی کو ترجیح نہیں دیتے تھے۔ ان کا شمار سادات صحابہ، خزانہ علم اور ائمہ ہدیٰ میں ہوتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ چونکہ ضبط و اتقان طول صحبت اور فقاہت میں دوسرے حضرات سے فائق ہیں اس لیے ان کی روایت مقدم ہوگی۔ امام طحاویؒ نے بسند صحیح نقل کیا ہے کہ۔

"مغیرہ بن مقسم الضبی کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابراہیم نخعیؒ سے حضرت وائل رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رکوع سے قبل و بعد رفع یدین کیا کرتے تھے فرمانے لگے اگر حضرت وائل رضی اللہ عنہ نے ایک بار آپ کو رفع یدین کرتے دیکھا ہے تو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے پچاس بار ترک رفع یدین کرتے دیکھا ہے"۔

"عمرو بن مرہ کہتے ہیں کہ میں حضر موت کی مسجد میں داخل ہوا تو دیکھا کہ علقمہ بن وائل اپنے والد حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے حدیث بیان کر رہے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رکوع سے قبل و بعد رفع یدین کرتے تھے، میں نے ابراہیم نخعیؒ سے اس کا ذکر کیا تو غضبناک ہو کر فرمایا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ نے دیکھا ہے؟ ابن مسعودؓ اور ان کے رفقاءؓ نے نہیں دیکھا؟ (طحاوی ص۱۱۲، مؤطا امام محمد ص۹۲، کتاب الآثار امام ابو یوسف ص۲۱)

۸ ــــــ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ رفع یدین کے باب میں جو احادیث مروی ہیں ان میں اختلاف و اضطراب ہے، لیکن حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث اضطراب سے پاک ہے چنانچہ ان سے رفع یدین کی ایک روایت بھی نہیں ہے، پس جو حدیث کہ اختلاف و اضطراب سے پاک ہو وہ مقدم ہوگی۔

۹۔۔۔۔ کسی حدیث میں یہ نہیں آتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رفع یدین کا حکم فرمایا ہو۔ اس کے برعکس حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ممانعت موجود ہے۔ اور جب قولی حدیث اور فعلی احادیث میں اختلاف ہو تو قولی احادیث مقدم ہوتی ہیں۔

۱۰۔۔۔۔ جن احادیث میں ذکر کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رفع یدین کرتے تھے، ان میں سے کسی صحیح حدیث میں یہ ذکر نہیں کہ آپ کا یہ عمل مدۃ العمر رہا۔ اور نہ کسی حدیث میں یہی بیان کیا گیا ہے کہ آپ کی آخری نماز رفع یدین کے ساتھ ہوئی تھی۔ جب تک ان دو باتوں میں سے ایک بات ثابت نہ ہو رفع یدین کا سنت دائمہ مستمرہ ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ اس کے مقابلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ترک رفع یدین احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔ پھر رفع الیدین کی ممانعت بھی موجود ہے۔ اور حضرات خلفائے راشدین اور اکابر صحابہؓ کا عمل بھی ترک رفع الیدین پر ثابت ہے ان تمام امور سے معلوم ہوتا ہے کہ رفع الیدین آپکی سنت دائمہ نہیں بلکہ سنت متروکہ ہے۔ واللہ اعلم۔

دو شبہات کا ازالہ:

آخر میں دو غلط فہمیوں کا ازالہ ضروری ہے۔ جن کی طرف سوال میں اشارہ کیا گیا ہے۔

ایک یہ کہ رفع الیدین میں اختلاف جواز یا عدم جواز کا نہیں، بلکہ اولیٰ اور غیر اولیٰ کا ہے جیسا کہ حافظ ابن قیمؒ کی عبارت اس سے پہلے نقل کر چکا ہوں اس لیے حنفیہ کے نزدیک رفع الیدین سے نماز فاسد نہیں ہوتی، البتہ ان کے نزدیک یہ عمل سنت متروکہ ہونے کی وجہ سے خلاف اولیٰ ہے۔

دوم یہ کہ سوال میں جو ذکر کیا گیا کہ رفع الیدین کے باب میں پچاس سے زائد صحابہ روایت کرتے ہیں یہ محض مبالغہ ہے، پچاس صحابہ کی روایت کا حوالہ محدثین نے تکبیر تحریمہ کے وقت رفع الیدین کے لیے دیا ہے۔ چنانچہ علامہ شوکانیؒ نیل الاوطار ص ۱۸۴ ج ۲ میں لکھتے ہیں۔

وجمع العراقی عدد من روی رفع	علامہ عراقیؒ نے ان حضرات کا شمار کیا ہے
الیدین فی ابتداء الصلوٰۃ فبلغو خمسین	جن سے ابتدائے نماز میں رفع یدین کی احادیث
صحابیاً منهم العشرة المشهود	مروی ہیں۔ چنانچہ ان کی تعداد پچاس صحابہؓ تک

لھم بالجنۃ ۔ پہنچی ۔ جن میں حضرات عشرہ مبشرہ بھی شامل ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ پچاس صحابہؓ سے تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین کی احادیث مروی ہیں جو باجماع امت مستحب ہے ۔ اور جس سے حنفیہ کو بھی اختلاف نہیں ۔ جس مسئلہ میں اختلاف ہے وہ رکوع سے پہلے اور رکوع کے بعد رفع الیدین ہے ۔ اس میں پچاس صحابہؓ کی روایات تو کجا ، ایک صحابی کی بھی ایسی روایت نہیں جو صحیح بھی ہو ۔ اور اختلاف و معارضہ سے خالی بھی ہو ، اس لیے اس متنازع فیہ مسئلہ پر پچاس صحابہ کی روایات کا حوالہ دینا محض مغالطہ ہے دراصل اس مسئلہ میں اصل حقائق کے بجائے مبالغہ آرائی سے زیادہ کام لیا گیا ہے ۔ ان مبالغات کی دو دلچسپ مثالیں پیش کرتا ہوں ۔

امام بخاریؒ نے رسالہ جزء رفع الیدین میں حضرت حسن بصریؒ کا قول نقل کیا ہے ۔

کان اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یرفعون ایدیھم فی الصلوۃ ۔	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ نماز میں رفع یدین کیا کرتے تھے ۔

امام حسن بصریؒ کے اس قول کو نقل کر کے امام بخاریؒ لکھتے ہیں ۔

ولم یستثن احداً ولا یثبت عن احد من الصحابۃ انہ لم یرفع یدیہ (بحوالہ نصب الرایہ ص ۱/۴۱۶)	امام حسن بصریؒ نے کسی کو مستثنیٰ نہیں کیا ۔ اور نہ کسی صحابی سے یہ ثابت ہے کہ اس نے رفع یدین نہ کیا ہو ۔

لیجئے حضرت حسن بصریؒ کے اس قول سے امام بخاریؒ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ کرامؓ سے رفع یدین ثابت کر دیا ، اور اس کے مقابلہ وہ تمام روایات صحیحہ غلط قرار پائیں جن میں صحابہ کرامؓ کا رفع یدین نہ کرنا ثابت ہے ۔

اس سے قطع نظر کہ حسن بصریؒ کا یہ قول کیسی سند سے امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے ۔ اول تو اس میں صرف رفع یدین کا ذکر ہے ۔ متنازعہ فیہ رفع یدین کا ذکر نہیں ۔ پھر اگر دو چار صحابہؓ سے بھی رفع الیدین ثابت ہو تو امام حسن بصریؒ کا یہ کہنا صحیح نہیں کہ صحابہ کرامؓ سے رفع یدین بھی ثابت ہے لیکن امام بخاریؒ نے امام حسن بصریؒ کے قول کا جو مفہوم بیان فرمایا اس سے مبالغہ آرائی اپنی آخری حد کو پہنچ گئی ۔ اور مزے کی بات یہ کہ حسن بصریؒ جن کا سماع حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی محدثین تسلیم نہیں کرتے ،

ان کا قول یہاں تمام صحابہ کرامؓ کے حق میں حجت مان لیا گیا۔ اور ان کے مقابلہ میں اکابر صحابہؓ و تابعینؒ کی تصریحات مسترد کر دی گئیں۔ رفع الیدین کے متنازعہ فیہ مسئلہ کو ثابت کرنے کے لیے جن حضرات نے کاوشیں فرمائی ہیں ان میں سے اکثر و بیشتر اسی قسم کے مبالغوں سے کام چلایا ہے۔

اس کی دوسری مثال شیخ مجد الدین فیروز آبادی صاحب قاموس کی عبارت ہے وہ "سفر السعادۃ" میں لکھتے ہیں۔

دریں سہ موضع برداشتن دست ثابت شدہ، واز کثرت رواۃ ایں معنیٰ بمتواترہ ماندہ است۔ چہار صد خبر واثر دریں باب صحیح شدہ۔ وعشرہ مبشرہ روایت کردہ اند کہ لایزال عمل آنحضرت بریں کیفیت بود تا ازیں جہاں رحلت کرد۔	ان تین مواضع میں رفع یدین ثابت ہے۔ اور راویوں کی کثرت کی وجہ سے متواتر کے مشابہ ہے۔ چنانچہ اس مسئلہ میں چارسو صحیح حدیثیں مرفوع و موقوف ثابت ہیں۔ اس کو عشرہ مبشرہ نے روایت کیا ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ اسی کیفیت پر رہے یہاں تک کہ اس عالم سے رحلت فرما گئے۔ اور رفع الیدین کے خلاف کوئی روایت بھی ثابت نہیں۔

(شرح سفر السعادۃ ص۶۴)

فن مبالغہ آرائی کا کمال دیکھئے کہ شیخ فیروز آبادی نے ایک ہی سانس میں کتنی باتیں کہہ ڈالیں۔

۱ــــ "ان تین مواضع میں رفع یدین ثابت ہے"۔ حالانکہ پورے ذخیرہ حدیث میں ایک روایت بھی ایسی نہیں جو صحیح بھی ہو، اور سالم عن المعارضہ بھی ہو۔

۲ــــ "رفع یدین پر چارسو صحیح حدیثیں ہیں"۔ حالانکہ امام بخاریؒ و امام مسلمؒ کو ان کی شرط کے مطابق صرف دو حدیثیں مل سکیں، وہ بھی شدید الاضطراب ہیں اور محدثین کی اصطلاح میں ایسی مضطرب روایات کو صحیح نہیں کہا جا سکتا۔

۳ــــ چارسو حدیثوں کے باوجود مسئلہ شیخ فیروز آبادیؒ کے نزدیک پھر بھی متواتر نہیں بلکہ "متواترہ کے

مشابہ" ہے، خدا جانے کہ ان کے نزدیک کسی مسئلہ کے متواتر ہونے کے لیے کتنے "چار سو" کی ضرورت ہوگی۔

۴ — "رفع یدین عشرہ مبشرہ کی روایت سے ثابت ہے"، حالانکہ عشرہ مبشرہ میں سے کسی ایک سے بھی صحیح سند سے ثابت نہیں۔ اس کے مقابلہ میں حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہم سے۔ جو عشرہ مبشرہ کے سرخیل ہیں ترک رفع یدین صحیح اسانید سے ثابت ہے۔ افسوس ہے کہ شیخ فیروزآبادیؒ کی عشرہ مبشرہ سے مروی روایات کا سراغ امام بخاریؒ، امام مسلمؒ کو نہ ملا۔ ورنہ یہ روایتیں صحیحین کی زینت ضرور بنتیں۔

۵ — "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مرتے دم تک رفع یدین کرتے رہے"، غالباً شیخ کے پیش نظر ابن عمر رضی اللہ عنہ سے منسوب کردہ وہ روایت ہے جس کو امام بیہقیؒ نے سنن میں ذکر کیا ہے۔

فمازالت تلک صلوتہ حتیٰ — پس ہمیشہ رہی آپ کی یہی نماز۔ یہاں تک

لقی اللہ تعالیٰ (نصب الرایہ ص ۴۱۰ ج ۱) — کہ جا ملے اللہ تعالیٰ سے۔

مگر یہ روایت موضوع ہے۔ اس کے دو راوی کذاب ہیں۔ (حاشیہ نصب الرایہ) عجیب بات یہ ہے کہ امام بیہقیؒ اور حافظ ابن حجرؒ ایسے اکابر بھی نہ صرف اس روایت پر خاموشی سے گزر گئے ہیں۔ بلکہ اس کو رفع یدین کے دلائل میں ذکر کر جاتے ہیں۔ اس سے ان حضرات کی اس مسئلہ میں بے بسی واضح ہے۔

۶ — شیخ فیروزآبادیؒ فرماتے ہیں کہ "ترک رفع یدین کی کوئی حدیث ثابت نہیں"، حالانکہ اکابر محدثین سے صحیح روایات اوپر نقل ہو چکی ہیں۔

رفع الیدین کے مسئلہ میں بے جا غلو اور مبالغوں سے کام نہ لیا جائے۔ تو خلاصہ یہ ہے کہ روایات و آثار دونوں جانب مروی ہیں، امام شافعیؒ و احمدؒ اور ان کے متبعین تین مواضع میں رفع الیدین کو راجح سمجھتے ہیں۔ اور امام ابوحنیفہؒ و مالکؒ —— جن کا زمانہ اول الذکر حضرات سے قدیم ہے —— ترک رفع یدین کو راجح سمجھتے ہیں۔ اور امت کا بیشتر تعامل اسی پر رہا ہے۔ چنانچہ صدر اول میں اسلام کے دو مرکزی شہروں مدینہ اور کوفہ میں ترک ہی پر عمل تھا۔ مکہ مکرمہ میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ

کے دورِ خلافت میں رفع یدین کا رواج ہوا۔ جن کا شمار صغارِ صحابہ میں ہے۔ ورنہ صحابہؓ و تابعینؒ کی اکثریت ترکِ رفع یدین پر عامل تھی۔ صحابہؓ و تابعینؒ کے بعد ائمہ مجتہدین کا زمانہ آتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں احناف اور مالکیہ ـــــ جو امت کا دو تہائی حصہ ہیں ـــــ ترکِ رفع یدین ہی پر عامل چلے آتے ہیں۔ اس لیے روایت و درایت اور توارث و تعامل کے لحاظ سے ترکِ رفع یدین ہی قوی اور راجح ہے۔ واللہ الموفق لکل خیر و سعادۃ۔

سوال ہفتم: سجدۂ سہو کا طریقہ:

س ۷: "سجدہ سہو جو عام رائج ہے داہنی جانب ایک سلام پھیر کر دو سجدے کرنا یہ کس دلیل پر بنیاد ہے؟ جب کہ متفق علیہ کی احادیث سے صاف اور واضح ثبوت ملتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں سہو ہونے پر اس وقت سجدۂ سہو کیا جب نماز اپنے آخری مرحلہ سے گذر رہی تھی یعنی قریب سلام پھیرنے کے تھے جب آپ نے دو سجدے کئے اب تحقیق طلب امر یہ ہے کہ ایک سلام پھیرنے (تشہد کے بعد) اور پھر دوبارہ تشہد و درود پڑھنے کا کیا ثبوت ہے؟"

ج ۷: اس سلسلہ میں چند امور لائق توجہ ہیں۔

اوّل: سجدہ سہو کے بارے میں متفق علیہ روایات صرف سلام سے پہلے سجدۂ سہو کرنے کی نہیں بلکہ اس سلسلہ میں بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے سجدۂ سہو سلام سے پہلے کیا۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن بُحینہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے۔ جو صحاح ستہ میں ہے۔ اور سوال میں اسی کا حوالہ دیا گیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن بحینہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ظہر کی نماز میں تشہد کئے بغیر تیسری رکعت کے لیے کھڑے ہوگئے اور نماز پوری کر کے سلام سے قبل سجدۂ سہو کیا۔ (بخاری ص ۱۶۳ ج ۱، مسلم ص ۲۱۱ ج ۱، ابوداؤد ص ۱۴۸ ج ۱، نسائی ص ۱۸۱ ج ۱ و ص ۱۸۶ ج ۱، ترمذی ص ۵۱ ج ۱، ابن ماجہ ص ۸۵)

دوسری قسم ان احادیث کی ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے سلام کے بعد سجدہ سہو کیا چنانچہ:

۱ ـــــ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی پانچ رکعتیں پڑھیں، عرض کیا گیا کہ کیا نماز میں اضافہ ہوگیا؟ فرمایا! کیا بات ہوئی؟ عرض کیا گیا آپ نے پانچ

رکعتیں پڑھی ہیں پس آپؐ نے سلام کے بعد دو سجدے کئے۔ (بخاری ص۱۶۳ ج۱، مسلم ص۲۱۳ ج۱، نسائی ص۱۸۵ ج۱، ابوداؤد ص۱۴۶ ج۱، ترمذی ص۵۲ ج۱، ابن ماجہ ص۸۵)

۲ ـــــ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عصر کی نماز میں دو رکعت پر سلام پھیر دیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باقی ماندہ نماز پوری کی۔ پھر بیٹھ کر سلام کے بعد دو سجدے کئے (بخاری ص۱۶۴ ج۱، مسلم ص۲۱۳ ج۱، ابوداؤد ص۱۴۴ ج۱، نسائی ص۱۸۲ ج۱، ترمذی ص۵۲ ج۱، ابن ماجہ ص۸۶)

۳ ـــــ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے نماز پڑھائی تو دو رکعتوں پر تشہد کیے بغیر اٹھ گئے۔ ۔ ۔ جب نماز پوری کر کے سلام پھیرا تو دو سجدے کئے۔ اور نماز سے فارغ ہو کر فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح کرتے دیکھا ہے۔

(ابوداؤد ص۱۴۸ ج۱، ترمذی ص۴۸ ج۱، ابن ابی شیبہ ص۳۶ ج۲)

۴ ـــــ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھول کر دو رکعتوں پر سلام پھیر دیا۔ ۔ ۔ پھر دو رکعتیں اور پڑھیں، پھر سلام پھیرا پھر سجدۂ سہو کیا (ابن ماجہ ص۸۶)

تیسری قسم کی احادیث وہ ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے دو سلام کئے۔ ایک سجدۂ سہو سے پہلے اور ایک بعد، چنانچہ۔

۱ ـــــ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین رکعتوں پر سلام پھیر دیا۔ ۔ ۔ ۔ پھر آپؐ نے ایک اور رکعت پڑھی۔ پھر سلام پھیرا، پھر دو سجدے کئے۔ پھر سلام پھیرا (صحیح مسلم ص۲۱۳ ج۱، ابوداؤد ص۱۴۶ ج۱، نسائی ص۱۹۵ ج۱، ابن ماجہ ص۸۶، ابن ابی شیبہ ص۳۲ ج۲)

۲ ـــــ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر یا عصر میں دو رکعت پر سلام پھیر دیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر دو رکعتیں اور پڑھیں اور سلام پھیرا پھر سجدۂ سہو کیا پھر سلام پھیرا (ابن ماجہ ص۸۶)

۳ ـــــ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ دو رکعتوں پر قعدہ کئے بغیر کھڑے ہو گئے۔ ۔ ۔ جب نماز پوری ہوئی تو سلام پھیرا، اور سجدۂ سہو کیا، اور پھر سلام پھیرا، پھر فرمایا کہ رسول اللہ صلی

علیہ وسلم نے ایسا ہی کیا تھا (ترمذی ص ۴۸ ج ۱ وقال وہذا حدیث حسن صحیح ——— ابن ابی شیبہ ص ۴۲ ج ۲)

۴ ——— حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھول کر دو رکعت پر سلام پھیر دیا ..... پھر دو رکعتیں اور پڑھیں۔ پھر سلام پھیرا۔ پھر سجدۂ سہو کیا پھر سلام پھیرا ،

(ابن ابی شیبہ ص ۳۸ ج ۲)

۵ ——— طحاوی ص ۲۵۶ ، مسند احمد ص ۴۲۹ ج ۱ ، سنن بیہقی ص ۳۴۵ ج ۲ میں بروایت ابوعبیدہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی موقوف حدیث ہے ۔

فانه یسلم ثم یسجد سجدتی السهو ثم یسلم ۔ (حاشیہ نصب الرایہ ص ۱۶۴ ج ۲)

سجدۂ سہو کا طریقہ یہ ہے کہ سلام پھیرے پھر سجدہ سہو کرے۔ پھر سلام پھیرے ۔

دوم :۔ ان مختلف احادیث کے درمیان توفیق و تطبیق یا ترجیح کے مسئلہ میں ائمہ اجتہاد کا اختلاف ہے چنانچہ امام ترمذیؒ نے اس مسئلہ میں پانچ قول نقل کئے ہیں :

۱ ——— امام شافعیؒ سلام سے پہلے سجدۂ سہو کے قائل ہیں ۔

۲ ——— امام مالک رحؒ فرماتے ہیں کہ سجدہ سہو نماز میں زیادتی کی وجہ سے ہو تو سلام کے بعد ہوگا اور اگر نماز میں کمی رہ جانے کی وجہ سے ہو تو سلام سے قبل ہوگا ۔

۳ ——— امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سجدہ سہو کی جو صورتیں منقول ہیں ان پر اسی طرح عمل کیا جائے گا ۔ چنانچہ :

الف :۔ اگر بھول سے پہلا قعدہ چھوٹ جائے تو سجدۂ سہو سلام سے پہلے ہوگا ۔ جیساکہ حضرت ابن بحینہؓ کی حدیث میں ہے ۔

ب :۔ اگر ظہر کی پانچ رکعتیں پڑھلیں تو سجدۂ سہو سلام کے بعد ہوگا جیساکہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے ۔

ج :۔ اگر ظہر یا عصر کی دو رکعتوں پر سلام پھیر دیا تو سجدۂ سہو سلام کے بعد ہوگا ۔ جیساکہ حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے ۔

د :۔ اور جن صورتوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حکم منقول نہیں وہاں سجدۂ سہو سلام سے

پہلے ہوگا۔

۴ ـــــ امام اسحاق بن راہویہؒ کا قول امام احمدؒ کے موافق ہے۔ البتہ آخری شق میں انہیں اختلاف ہے۔ اور وہ فرماتے ہیں کہ جن صورتوں کا حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں وہاں زیادتی کی صورت میں سجدۂ سہو سلام کے بعد اور کمی کی صورت میں سلام سے پہلے ہوگا۔

۵ ـــــ امام سفیان ثوریؒ اور بعض اہل کوفہ کے نزدیک ہر صورت میں سجدۂ سہو سلام کے بعد ہوگا یہی امام ابوحنیفہؒ کا قول ہے۔

سوم :۔ مذاہب اربعہ اس پر متفق ہیں کہ سجدۂ سہو قبل از سلام اور بعد از سلام دونوں طرح جائز ہے اختلاف صرف افضلیت میں ہے چنانچہ ہدایہ میں ہے۔

وھذا الخلاف فی الاولویۃ۔	یہ اختلاف صرف اولویت میں ہے۔

امام نوویؒ شرح مسلم ص۲۱۱ ج۱ میں فرماتے ہیں۔

ولاخلاف بین ھٰولاء المختلفین وغیرھم من العلماء انہٗ لو سجد قبل السلام او بعدہٗ للزیادۃ او للنقص انہٗ یجزیہ، ولا یفسد صلوٰتہٗ وانما اختلافھم فی الافضل، واللہ اعلم	ان اختلاف کرنے والے حضرات اور دیگر علماء کے درمیان اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ اگر کسی نے سجدہ سہو سلام سے پہلے کر لیا یا بعد میں کر لیا۔ خواہ زیادتی کی صورت میں ہو یا نقصان کی صورت میں۔ تو سجدۂ سہو بہر صورت صحیح ہے۔ اختلاف ہے تو اس میں ہے کہ افضل کونسی صورت ہے۔

چہارم :۔ ائمہ احنافؒ نے سلام کے بعد سجدۂ سہو کے طریقہ کو چند وجوہ سے راجح قرار دیا ہے۔

ایک یہ کہ اس طریقہ سے تمام احادیث جمع ہو جاتی ہیں اور ان کے درمیان کوئی اختلاف نہیں رہتا چنانچہ جن احادیث میں دو سلاموں کا ذکر آتا ہے وہ بھی اس طریقہ کی تائید کرتی ہیں۔

دوسری وجہ یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد و عمل سے بھی یہی طریقہ راجح معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ بیشتر متفق علیہ احادیث اس مضمون کی ہیں کہ آپؐ نے سجدۂ سہو سلام کے بعد کیا۔ اور اس سلسلہ

ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات حسب ذیل ہیں۔

۱ ـــــ صحیح بخاری ص۱۵۸ ج۱، ابوداؤد ص۱۴۶ ج۱، نسائی ص۱۴۱ ج۱، میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اذا شک احدکم فی صلوٰتہ	جب تم میں سے کسی کو اپنی نماز میں شک
فلیتحر الصواب، فلیتم	ہو جائے تو سوچ کر درست پہلو اختیار کرے
علیہ، ثم لیسلم ثم لیسجد	اس کے مطابق اپنی نماز پوری کرے پھر سلام
سجدتین۔	پھیرے پھر سجدۂ سہو کرے۔

۲ ـــــ ابوداؤد ص۱۴۹ ج۱، ابن ماجہ ص۸۷، مصنف ابن ابی شیبہ ص۳۳ ج۲، مسند ابوداؤد طیالسی ص۱۳۴ اور مسند امام احمد ص۲۸۰ ج۵ میں حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لکل سھو سجدتان بعد السلام	ہر سہو کے لیے دو سجدے ہیں سلام کے بعد

۳ ـــــ ابوداؤد ص۱۴۸ ج۱ میں حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من شک فی صلوٰتہ	جس شخص کو اپنی نماز میں شک ہو جائے اسے
فلیسجد سجدتین بعد ما یسلم	چاہیئے کہ سلام کے بعد دو سجدے کر لے۔

تیسری وجہ ترجیح یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اکابر صحابہؓ و تابعینؒ کا عمل بھی اسی کے مطابق تھا۔ چنانچہ امام طحاویؒ نے صحیح اسانید سے حضرت عمر، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت عبداللہ ابن مسعود، حضرت مغیرہ بن شعبہ، حضرت عمران بن حصین، حضرت عبداللہ بن زبیر، حضرت انس بن مالک، اور حضرت عمر بن عبدالعزیز (رضی اللہ عنہم) کے آثار نقل کئے ہیں کہ وہ سلام کے بعد سجدۂ سہو کرتے تھے۔
اور امام ابوداؤد حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

وفعل سعد بن ابی وقاص مثل	جس طرح حضرت مغیرہؓ نے کیا۔ اسی طرح
ما فعل المغیرۃ، وعمران بن حصین	سعد بن ابی وقاص، عمران بن حصین، ضحاک

والضحاك بن قیس ومعاویة بن ابی	بن قیس، معاویہ بن ابی سفیان اور ابن عباس
سفیان وابن عباس، وافتیٰ بذالک	(رضی اللہ عنہم) نے کیا، اور عمر بن عبدالعزیزؒ
عمر بن عبد العزیز (ص۱۴۸ ج۱)	نے اسی پر فتویٰ دیا۔

امام حازمیؒ نے کتاب الناسخ والمنسوخ میں صحابہ میں سے حضرت علی، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم کے اور تابعین میں سے حسن بصریؒ، ابراہیم نخعیؒ، عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ کے اسمائے گرامی ذکر کئے ہیں (نصب الرایہ ص۱۷۱ ج۲)۔

پنجم: چونکہ سجدۂ سہو کو نماز سے تعلق ہے۔ اس لیے ائمہ احناف کے نزدیک نماز کو ختم کرنے کے لئے سجدۂ سہو کے بعد دوبارہ تشہد پڑھ کر سلام پھیرنا ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل احادیث وارد ہیں۔

۱۔ اوپر صحیح بخاری ص۵۸ ج۱ وغیرہ کے حوالے سے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث گزر چکی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کے بعد سجدۂ سہو کرنے کا حکم فرمایا۔ امام طحاوی نے شرح معانی الآثار ص۲۵۲ ج۱ میں اسی حدیث میں بسند صحیح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے۔

ثم لیسلم، ثم لیسجد سجدتی	پھر سلام پھیرے۔ پھر سجدۂ سہو کرے اور
السھو ویتشھد ویسلم۔	تشہد پڑھ کر سلام پھیرے۔

۲۔ ابوداؤد ص۱۴۹ ج۱، اور ترمذی ص۵۲ ج۲ میں حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:۔

ان النبیّ صلّی اللہ علیہ وسلم صلّی	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھائی جس میں
بھم۔ فسھا، فسجد سجدتین ثم	آپؐ کو سہو ہو گیا تو آپ نے سجدہ سہو کیا
تشھد ثم سلم۔	پھر تشہد پڑھا پھر سلام پھیرا۔

اوپر حضرت عمران رضی اللہ عنہ کی حدیث صحیح مسلم وغیرہ کے حوالے سے گزر چکی ہے جس میں دو مرتبہ سلام پھیرنے کا ذکر تھا۔ حضرت عمران رضی اللہ عنہ کی ان دونوں روایتوں کو جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تشہد پڑھ کر سلام پھیرا۔ پھر سجدۂ سہو کیا۔ پھر تشہد پڑھا، اور پھر آخری سلام پھیرا۔

۳ ـــ ابوداؤد صـ۱۴۳ ج۱ میں ابوعبیدہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اذا کنت فی صلوٰۃ فشککت	جب تم نماز میں ہو پس تمہیں اس میں شک
فی ثلاث او اربع۔ واکبر ظنک	ہو جائے کہ تین رکعتیں پڑھی ہیں یا چار؟
علی اربع۔ تشہدت ثم سجدت	اور زیادہ خیال چار کا ہو تو تشہد کے بعد
سجدتین وانت جالس قبل ان تسلم،	سجدۂ سہو کر لو، آخری سلام سے پہلے دوبارہ
ثم تشہدت ایضاً ثم تسلم۔	تشہد پڑھو، اور پھر سلام پھیرو۔

امام ابوداؤدؒ اس حدیث کو نقل کرکے فرماتے ہیں کہ متعدد حضرات (جن کے نام انہوں نے ذکر کئے ہیں) اس حدیث کو مرفوعاً نقل نہیں کرتے۔

۴ ـــ مصنف ابن ابی شیبہ صـ۳۱ ج۲ میں ابوعبیدہ (حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے صاحبزادہ) اور ابراہیم نخعیؒ کی روایت سے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ارشاد نقل کیا ہے کہ سجدہ سہو کے بعد تشہد ہے۔

سوال ہشتم؛ مسائل وتر:

س ۸:۔ "وتر کی نماز میں دو رکعات پر تشہد پڑھنے کے لیے بیٹھنا اور آخری یعنی تیسری رکعت میں فاتحہ اور سورت کی تلاوت کے بعد اللہ اکبر کہہ کر دونوں ہاتھ کانوں تک اٹھانا اور پھر نیت باندھ کر قنوت پڑھنا کس دلیل سے ثابت ہے واضح فرمائیں جب کہ حضرت عائشہؓ سے ثابت ہے کہ حضورؐ نے تین، پانچ یا سات رکعات وتر پڑھے تو تشہد کے لیے دو رکعات پر نہ بیٹھے۔ بلکہ آخری رکعت پر ہی صرف بیٹھتے تھے۔ ان ہی سے ایک رکعت وتر بھی ثابت ہے۔ اسی ضمن میں وضاحت مطلوب ہے کہ قنوت دونوں ہاتھ دعا کی طرح اٹھا کر پڑھیں یا ہاتھ باندھ کر پڑھیں۔ احادیث نبوی سے کوئی ثبوت دیکر آگاہ فرمائیں۔

ج ۸:۔ یہ سوال وتر سے متعلق چند مسائل پر مشتمل ہے۔

۱ ـــ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وتر کی تین ہی رکعتیں پڑھتے تھے۔ یا ایک، پانچ، سات بھی؟

۲ ــــ وتر کی دو رکعتوں پر قعدہ بھی فرماتے تھے یا نہیں۔

۳ ــــ قنوت وتر کے لیے تکبیر اور رفع یدین؟

۴ ــــ قنوت وتر ہاتھ اٹھا کر پڑھی جائے یا ندھ کر؟

ان مسائل کو ترتیب وار لکھتا ہوں۔ واللہ الموفق۔

پہلا مسئلہ: وتر کی رکعات:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول مبارک وتر کی تین رکعات کا تھا۔ ایک رکعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں۔ اور جن روایات میں پانچ، سات یا نو رکعتوں کا ذکر ہے۔ ان میں بھی وتر کی تین ہی رکعتیں ہوتی تھیں۔ راوی نے ماقبل یا مابعد کی رکعات کو ان کے ساتھ ملا کر مجموعہ کو "وتر" کے لفظ سے تعبیر کر دیا۔

تین رکعات کے معمول کا ثبوت مندرجہ ذیل احادیث سے ہوتا ہے۔

۱ ــــ عن ابی سلمۃ بن عبدالرحمٰن انہ سأل عائشۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کیف کان صلوٰۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی رمضان؟ قالت ما کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یزید فی رمضان ولا فی غیرہ علیٰ احدیٰ عشرۃ رکعۃ۔ یصلی اربعاً فلا تسئل عن حسنھن وطولھن۔ ثم یصلی اربعاً فلا تسئل عن حسنھن وطولھن ثم یصلی ثلاثاً۔	ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن سے روایت ہے انہوں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے دریافت کیا کہ رمضان مبارک میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کیسی ہوتی تھی؟ انہوں نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رمضان اور غیر رمضان میں گیارہ رکعتوں سے زیادہ نہیں پڑھا کرتے تھے۔ پہلے چار رکعتیں پڑھتے پس کچھ نہ پوچھو کہ وہ کتنی حسین اور طویل ہوتی تھیں۔ پھر چار رکعتیں اور پڑھتے۔ پس کچھ نہ پوچھو کہ وہ کتنی حسین اور طویل ہوتی تھیں۔ پھر تین رکعتیں (وتر کی) پڑھتے تھے۔

(صحیح بخاری ج۱ ص۱۵۳، صحیح مسلم ج۱ ص۲۵۴، نسائی ج۱ ص۲۴۸، ابوداؤد ج۱ ص۱۹۸، مسند احمد ج۶ ص۳۶)

۲۔۔۔ عن سعد بن هشام ان عائشة حدثته ان رسول الله صلی الله علیه وسلم کان لا یسلم فی رکعتی الوتر ۔۔

سعد بن ہشام کہتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے انہیں بتایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وتر کی دو رکعتوں میں سلام نہیں پھیرتے تھے۔

(نسائی ج۱ ص۲۴۸، مؤطا امام محمد ص۱۵۱)

۳۔۔۔ امام حاکم نے مستدرک ج۱ ص۳۰۴ میں سعد بن ہشام کی روایت کو ان الفاظ سے نقل کیا ہے۔

کان رسول الله صلی الله علیه وسلم لا یسلم فی الرکعتین الاولیین من الوتر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وتر کی پہلی دو رکعتوں میں سلام نہیں پھیرتے تھے۔

امام حاکم اس کو نقل کرکے لکھتے ہیں۔

هذا حدیث صحیح علی شرط الشیخین ولم یخرجاه (صفحہ مذکور)

یہ حدیث بخاری و مسلم کی شرط پر صحیح ہے۔

علامہ ذہبی تلخیص مستدرک میں حاکم کی تصحیح کو تسلیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

علی شرطهما۔

یہ حدیث صحیحین کی شرط پر ہے۔

۴۔۔۔ امام حاکم نے سعد بن ہشام کی یہی روایت ایک اور سند سے نقل فرمائی ہے۔ جس کے الفاظ یہ ہیں۔

کان رسول الله صلی الله علیه وسلم یوتر بثلاث، لا یسلم الا فی آخرهن ۔۔۔ وهذا وتر امیر المؤمنین عمر بن الخطاب رضی الله عنه۔ وعنه اخذه اهل المدینة۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تین رکعت وتر پڑھا کرتے تھے۔ اور صرف ان کے آخر میں سلام پھیرتے تھے ۔۔۔ اور امیر المؤمنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بھی اسی طرح وتر پڑھتے تھے اور انہی سے اہل مدینہ نے اخذ کیا۔

۵ ـــ مسند احمد ج۶ ص۱۵۶ میں سعد بن ہشام کی روایت ان الفاظ میں نقل کی ہے۔

ان رسول الله صلى الله عليه وسلم اذ صلى العشاء دخل المنزل ثم صلى ركعتين. ثم صلى بعدهما ركعتين اطول منهما. ثم اوتر بثلاث لا يفصل بينهن ثم صلى ركعتين وهو جالس، يركع وهو جالس ويسجد وهو جالس.

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز عشاء سے فارغ ہوتے تو گھر میں تشریف لاتے۔ پھر دو رکعتیں پڑھتے۔ پھر ان کے بعد دو رکعتیں ان سے طویل پڑھتے۔ پھر تین وتر پڑھتے۔ ان کے درمیان فصل نہیں کرتے تھے۔ اس کے بعد آپ بیٹھ کر دو رکعتیں پڑھتے۔ جن میں بیٹھ کر رکوع وسجود کرتے۔

۶ ـــ عن عبد الله بن ابی قيس قال سألت عائشة رضی الله عنها بكم كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يوتر قالت باربع وثلاث. وست وثلاث، وثمان وثلاث ولم يكن يوتر باكثر من ثلاث عشرة ولا انقص من سبع.

عبداللہ بن ابی قیس کہتے ہیں میں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کتنی رکعتوں کے ساتھ وتر پڑھا کرتے تھے، فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وتر پڑھا کرتے تھے چار اور تین کے ساتھ، چھ اور تین کے ساتھ اور آٹھ اور تین کے ساتھ۔ آپ کے وتر کی رکعتیں تیرہ سے زیادہ اور سات سے کم نہیں ہوتی تھیں۔

(ابوداؤد ج۱ ص۱۹۳، طحاوی ج۱ ص۱۳۹)

یہاں وتر سے مراد مجموعی طور پر نماز تہجد ہے۔ تین رکعتیں وتر کی ہوتی تھیں اور باقی تہجد کی

۷ ـــ عن عبد العزيز بن جريج قال سألت عائشة رضی الله تعالى عنها بای شیء كان يوتر رسول الله صلى الله عليه وسلم، قال يقرأ فی الاولى

عبدالعزیز بن جریج کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کن سورتوں کے ساتھ وتر پڑھتے تھے۔ فرمایا، پہلی رکعت

بسبح اسم ربک الاعلیٰ و فی الثانیۃ بقل یا ایها الکٰفرون و فی الثالثۃ بقل هو اللہ احد والمعوذتین ـــ قال ابو عیسٰی هذا حدیث حسن غریب۔

میں سبح اسم ربک الاعلیٰ۔ دوسری میں قل یا ایہا الکٰفرون اور تیسری میں قل ہو اللہ احد اور معوذتین پڑھا کرتے تھے۔
امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔

(ابوداؤد صـ۲۰۱، ترمذی صـ۱۶، ابن ماجہ صـ۸۳، مسند احمد صـ۲۲، عبدالرزاق صـ۳)

۱ ـــ عن عمرۃ عن عائشۃ رضی اللہ تعالیٰ عنها۔ ان رسول صلی اللہ علیہ وسلم کان یوتر بثلاث۔ یقرأ فی الرکعۃ الاولیٰ بسبح اسم ربک الاعلیٰ۔ و فی الثانیۃ قل یا ایها الکٰفرون و فی الثالثۃ قل هو اللہ احد و قل اعوذ برب الفلق و قل اعوذ برب الناس۔ هذا حدیث صحیح علی شرط الشیخین و لم یخرجاہ۔ و قال الذهبی رواہ ثقات عنہ و هو علی شرطہما۔
(مستدرک حاکم صـ۳۰۵ ج۱)

عمرۃ بنت عبد الرحمٰن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تین رکعت وتر پڑھا کرتے تھے، پہلی رکعت میں سبح اسم ربک الاعلیٰ، دوسری رکعت میں قل یا ایہا الکٰفرون، تیسری میں قل ہو اللہ احد، قل اعوذ برب الفلق، قل اعوذ برب الناس پڑھا کرتے تھے۔
امام حاکم فرماتے ہیں کہ یہ حدیث بخاری و مسلم کی شرط پر صحیح ہے ـــ علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ اس کے راوی ثقہ ہیں اور یہ بخاری و مسلم کی شرط پر ہے۔

۹ ـــ عن محمد بن علی عن ابیہ عن جدہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ قام من اللیل فاستن ثم صلی رکعتین ثم نام ثم قام فاستن ثم توضأ فصلی رکعتین حتی صلی

محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس اپنے والد سے اور وہ اپنے والد عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رات کو اٹھے۔ پس مسواک کی۔ پھر

ستاً ثم اوتر بثلاث وصلى ركعتين۔

(صحیح مسلم ص۲۶۱ ج۱، النسائی ص۲۴۹ ج۱، واللفظ له)

دو رکعتیں پڑھیں۔ پھر سو گئے۔ پھر اٹھے، مسواک کی پھر وضو کیا پھر دو رکعتیں پڑھیں یہاں تک کہ چھ رکعتیں پڑھیں۔ پھر تین وتر پڑھے۔ پھر دو رکعتیں پڑھیں۔

۱۰ — عن يحيى بن الجزار عن ابن عباس رضي الله عنهما قال كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يصلي من الليل ثمان ركعات ويوتر بثلاث ويصلي ركعتين قبل صلوة الفجر۔

(النسائی ص۲۴۹ ج۱، واللفظ له۔ طحاوی ص۱۴۰ ج۱)

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات میں آٹھ رکعتیں پڑھتے تھے۔ اور وتر کی تین رکعتیں پڑھتے تھے اور فجر کی نماز سے پہلے دو رکعتیں پڑھتے تھے۔

۱۱ — عن سعيد بن جبير عن ابن عباس رضي الله عنهما قال كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يوتر بثلاث يقرأ في الاولى سبح اسم ربك الاعلى وفي الثانية قل يايها الكفرون وفي الثالثة قل هو الله احد۔

سعید بن جبیر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تین وتر پڑھا کرتے تھے پہلی رکعت میں سبح اسم ربک الاعلیٰ۔ دوسری میں قل یایہا الکفرون۔ اور تیسری میں قل ہو اللہ احد پڑھا کرتے تھے۔

(سنن دارمی ص۳۱۱ ج۱، طبع ملتان حدیث نمبر ۱۵۹۸، ترمذی ص۶۱ ج۱، النسائی ص۲۴۹ ج۱، ابن ماجہ ص۸۳، طحاوی ص۱۴۰ ج۱، ابن ابی شیبہ ص۲۹۹ ج۱، محلی ابن حزم ص۵۱ ج۲)

نصب الرایہ ص۱۱۹ ج۲ میں ہے کہ امام نوویؒ نے خلاصہ میں اس کو باسناد صحیح کہا ہے۔

وتر کی تین رکعتوں میں تین سورتیں پڑھنے کی احادیث حضرت ابن عباس اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما کے علاوہ مندرجہ ذیل صحابہ کرامؓ سے بھی مروی ہیں۔

۱ — حضرت عبد الرحمن بن ابزیؓ (نسائی ص۲۵۱ ج۱، طحاوی ص۱۴۳ ج۱، ابن ابی شیبہ ص۲۹۸ ج۲، عبد الرزاق ص۳۳ ج۲)

۲۔ حضرت ابی بن کعبؓ (نسائی ص۲۴۸ ج۱، ابن ابی شیبہ ص۳۰۲ ج۲)
۳۔ حضرت علیؓ (ترمذی ص۶۱ ج۱، عبدالرزاق ص۳۲ ج۳، طحاوی ص۱۴۲ ج۱)
۴۔ حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰؓ (مجمع الزوائد ص۲۴۱ ج۲)
۵۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ 〃
۶۔ حضرت نعمان بن بشیرؓ 〃
۷۔ حضرت ابوہریرہؓ 〃
۸۔ ابن عمرؓ 〃
۹۔ عمران بن حصینؓ (طحاوی ص۱۴۲ ج۱، ابن ابی شیبہ ص۲۹۵ ج۲، مجمع الزوائد ص۲۴۱ ج۲، کنزالعمال ص۱۹۶ ج۱)
۱۰۔ ابوخیثمہؓ عن ابیہ معاویہ بن خدیج رضی اللہ عنہ (مجمع الزوائد ص۲۴۱ ج۲)
معارف السنن (ص۲۲۲ ج۴ و ص۲۲۶ ج۴) میں حضرت جابرؓ اور حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہما کا بھی حوالہ دیا ہے

۱۲۔ عن عامر الشعبي قال سألت ابن عمر و ابن عباس رضي الله عنهما كيف كان صلوٰة رسول الله صلى الله عليه وسلم بالليل فقالا ثلث عشرة ركعة۔ ثمان ويوتر بثلاث۔ وركعتين بعد الفجر۔ (طحاوی ص۱۳۶ ج۱)

امام شعبیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے دریافت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رات کی نماز کا کیا معمول تھا؟ دونوں نے فرمایا کہ تیرہ رکعتیں پڑھتے تھے۔ آٹھ تہجد کی تین وتر کی۔ اور دو رکعتیں صبح صادق کے بعد۔

۱۳۔ عن ثابت البناني قال قال لي انس بن مالك يا ثابت خذ عني، فانك لن تأخذ عن احد اوثق مني، اني اخذته

حضرت ثابت بنانیؒ فرماتے ہیں کہ مجھ سے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ اے ثابت! مجھ سے سیکھ لو، تم مجھ سے زیادہ قابل اعتماد آدمی سے حاصل نہیں

عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	کر سکو گے۔ میں نے اس کو آنحضرت صلی
واخذہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ	اللہ علیہ وسلم سے اخذ کیا ہے۔ اور آنحضرت
وسلم عن جبریل واخذ	صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریل علیہ السلام
جبریل عن اللہ عزوجل۔	سے۔ اور جبریل علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے۔
قال ثم صلی بی العشاء ثم صلی ست	پھر انہوں نے میرے ساتھ عشاء کی نماز پڑھی۔
رکعات یسلم بین کل رکعتین۔ ثم	پھر چھ رکعتیں پڑھیں۔ پھر تین وتر پڑھ کر ان
اوتر بثلاث، یسلم فی اخرھن۔	کے آخر میں سلام پھیرا۔
رواہ الرویانی وابن عساکر	
ورجالہ ثقات۔ (کنز العمال ج۴ ص۱۹۶)	

۱۴۔۔۔ اخبرنا ابوحنیفہ احدثنا	امام ابوحنیفہؒ امام محمد باقرؒ سے روایت
ابوجعفر قال کان رسول اللہ صلی	کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز
اللہ علیہ وسلم یصلی ما بین صلوٰۃ	عشاء اور نماز فجر کے مابین تیرہ رکعتیں پڑھا
العشاء الی صلوٰۃ الصبح ثلث عشرۃ رکعۃ	کرتے تھے۔ آٹھ نفل تین رکعات وتر اور
ثمان رکعات تطوعاً۔ وثلث رکعات الوتر	دو رکعت سنت فجر۔
ورکعتی الفجر (مؤطا امام محمد ص۱۲۹)	

ان احادیث سے مندرجہ ذیل امور معلوم ہوئے۔

الف:۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول مبارک تین وتر کا تھا۔

ب:۔ یہ تینوں رکعتیں ایک ہی سلام سے پڑھی جاتی تھیں۔

ج:۔ ان تین رکعتوں میں خاص خاص سورتوں کی تلاوت کا معمول تھا۔

اب اس سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چند ارشادات بھی ملاحظہ فرمائیے۔

۱۔۔۔ عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ	حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت
ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لا	ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
توتروا بثلاث واوتروا بخمس	صرف تین رکعت وتر نہ پڑھا کرو بلکہ پانچ

او سبع ، ولا تشبهوا بصلوٰۃ المغرب (طحاوی ص۱۳۳ ج۱ ، دارقطنی ص۱۷۱ وقال رجالہ ثقات . مستدرک حاکم ص۳۰۴ ج۱ ، وقال صحیح علی شرط الشیخین)	یا سات رکعت پڑھا کرو اور نماز مغرب کے ساتھ مشابہت نہ کرو۔
۲ــــ عن ابن عمر رضی اللہ عنہما ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال صلوٰۃ المغرب وتر النہار فاوتروا صلوٰۃ اللیل ۔ (عبدالرزاق ص۲۸ ج۳)	ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نماز مغرب دن کے وتر ہیں۔ پس رات کی نماز کو وتر بنایا کرو۔
ولاحمد عنہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال صلوٰۃ المغرب اوترت صلوٰۃ النہار فاوتروا صلوٰۃ اللیل ۔ قال العراقی سندہ صحیح ۔	مسند احمد کی روایت یوں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ، نماز مغرب نے دن کی نمازوں کو وتر بنا دیا ، پس رات کی نماز کو بھی وتر بنایا کرو ۔

(زرقانی شرح مؤطا ص۲۵۹ ج۱ ، اعلاء السنن ص۱۱ ج۶)

۳ــــ عن عائشۃ رضی اللہ عنہا قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الوتر ثلاث کثلاث المغرب (قال فی مجمع الزوائد ص۲۴۲ ج۲ ،	حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وتر کی تین رکعتیں ہیں جیسے نماز مغرب کی تین رکعتیں ہیں ۔

رواہ الطبرانی فی الکبیر وفیہ ابوبحر البکراوی وفیہ کلام کثیر قلت ورواہ الدارقطنی کما فی نصب الرایہ ص۱۲۲ ج۲ عن اسماعیل المکی عن الحسن عن سعد بن ہشام عن عائشۃ مرفوعاً ، واسماعیل بن مسلم المکی فقیہ ضعیف الحدیث من رجال الترمذی وابن ماجہ ۔ کما فی التقریب)

۴ــــ عن عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وتر اللیل	حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا رات کے وتر کی تین

ثلث کوتر النهار صلوٰۃ المغرب (رواہ الدارقطنی نصب الرایہ ۱۱۹[1])	رکعتیں ہیں جیسے دن کے وتر یعنی نماز مغرب کی ۔

ان ارشادات سے معلوم ہوا کہ شارع علیہ السلام کی نظر میں وتر کی ٹھیک اسی طرح تین رکعتیں ہیں جس طرح نماز مغرب کی ۔ نماز مغرب کی تین رکعتیں اس لیے مشروع کی گئیں تاکہ اس کے ذریعہ دن کی تمام نمازیں وتر (طاق) ہو جائیں ۔ "انّ اللہ وتر یحب الوتر" ٹھیک اسی طرح وتر کی تین رکعتیں مشروع کی گئیں تاکہ ان کے ذریعہ رات کی نماز وتر (طاق) بن جائے ۔ اسی لیے شارع علیہ السلام نے صرف تین وتر پر اکتفا کو پسند نہیں فرمایا، بلکہ وتر سے پہلے کم از کم دو یا چار رکعات نفل پڑھنے کا حکم فرمایا، تاکہ نماز وتر اور نماز مغرب کے درمیان امتیاز ہو جائے ۔ کیونکہ نماز مغرب سے پہلے نوافل نہیں پڑھے جاتے ۔ خلاصہ یہ کہ رکعات کی تعداد میں نماز وتر نماز مغرب کے مشابہ ہے، اس لیے دونوں کے درمیان فرق و امتیاز کی یہ صورت تجویز فرمائی گئی کہ مغرب سے پہلے نوافل نہیں ۔ اور وتر سے پہلے کم از کم دو چار نوافل ضرور ہونے چاہئیں ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معمول مبارک اور آپ کے ارشادات کے بعد اب یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ اس مسئلہ میں صحابہ و تابعین (رضوان اللہ علیہم) کا تعامل کیا تھا۔

۱ ـــ عن مسور بن مخرمۃ رضی اللہ عنہ قال دفنّا ابا بکر رضی اللہ عنہ لیلۃ فقال عمر رضی اللہ عنہ	حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم رات کے وقت حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے دفن سے فارغ ہوئے تو حضرت عمر

---

[1] ان دونوں روایتوں کے مرفوع ہونے میں محدثین کو کلام ہے ۔ لیکن اول تو ان کا مضمون اوپر کی صحیح احادیث سے مؤید ہے ۔ پھر متعدد طرق کی وجہ سے یہ دونوں حدیثیں حسن ہیں ۔ علاوہ ازیں حضرت عائشہؓ اور ابن مسعودؓ کے ارشادات صحیح سند سے ثابت ہیں (جیسا کہ آگے آئے گا) اور یہ بات محض رائے اور قیاس سے نہیں کہی جا سکتی ۔ اس لیے موقوف احادیث بھی مرفوع کے حکم میں ہیں ۔

الیٰ لھم اوتر۔ فقام۔ فصففنا وراءہ فصلّی بنا ثلاث رکعات لم یسلم الا فی آخرھن۔	رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں نے ابھی وتر نہیں پڑھے۔ پس وہ وتر کی نماز کے لیے کھڑے ہوئے تو ہم نے بھی ان کے پیچھے صف باندھ لی۔ پس آپ نے تین رکعتیں پڑھائیں جن میں صرف تیسری رکعت پر سلام پھیرا۔
(طحاوی ص۱۴۳ ج۱، ابن ابی شیبہ ص۲۹۳ ج۱، عبدالرزاق ص۲۰ ج۳)	

ظاہر ہے کہ اس موقعہ پر اکابر صحابہ موجود تھے جنہوں نے اس عمل میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اقتدا فرمائی۔ ان اکابر کے عمل سے معلوم ہوا کہ وتر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول مبارک ایک سلام سے تین رکعات کا تھا۔

۲ ــــ اوپر مستدرک حاکم ص۳۰۴ ج۱ کے حوالے سے سعد بن ہشام کی روایت گزر چکی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وتر کی تیسری رکعت پر سلام پھیرا کرتے تھے۔ اس روایت کے آخر میں تھا۔

وھذا وتر امیر المؤمنین عمر بن الخطاب۔	اور وتر میں یہی طریقہ تھا امیر المؤمنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا۔
۳ ــــ عن ابراھیم عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ انہ قال ما احبّ انی ترکت الوتر بثلاث وانّ لی حمر النعم۔ (مؤطا امام محمد ص۱۵۱)	حضرت ابراہیم نخعی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ میں تین رکعات وتر کو چھوڑنا پسند نہیں کرتا خواہ اس کے بدلے میں مجھے سرخ اونٹ بھی مل جائیں۔
۴ ــــ عن الحسن: قیل لہ کان ابن عمر رضی اللہ عنہما یسلم فی الرکعتین من الوتر، فقال کان عمر رضی اللہ عنہ افقہ منہ کان ینھض فی الثانیۃ بالتکبیر۔ (مستدرک حاکم ص۳۰۴ ج۱)	حضرت حسن بصری سے کہا گیا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما وتر کی دو رکعتوں پر سلام پھیر دیا کرتے تھے۔ فرمایا۔ ان کے والد حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان سے زیادہ فقیہ تھے، وہ دوسری رکعت پر سلام پھیرے بغیر تکبیر کہہ کر اٹھ جایا کرتے تھے۔

۵ ـــ عن مكحول عن عمر بن الخطاب رضي الله عنه انه اوتر بثلاث ركعات لم يفصل بينهن بسلام۔

(ابن ابی شیبہ ص۲۹۴ ج۲)

حضرت مکحولؒ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ وہ تین رکعت وتر پڑھا کرتے تھے۔ ان کے درمیان سلام کے ساتھ فصل نہیں کرتے تھے۔

۶ ـــ عن زاذان ابی عمران علیاً کرم الله وجهه کان یفعل ذالك ۔

(ابن ابی شیبہ ص۲۹۵ ج۲)

زاذان ابوعمر کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی یہی کیا کرتے تھے۔

۷ ـــ عن عبد الله بن مسعود رضي الله عنه قال الوتر ثلاث كوتر النهار صلوة المغرب۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ وتر کی تین رکعتیں ہیں جیسا کہ دن کے وتر یعنی نماز مغرب کی تین رکعتیں ہیں۔

(موطا امام محمد ص۱۵۰، طحاوی ص۱۴۳ ج۱، عبد الرزاق ج۳ ص۱۹، ھو قال الہیثمی فی الزوائد ج۲ ص۲۴۲، اخرجہ الطبرانی فی الکبیر ورجالہ رجال الصحیح)

۸ ـــ عن علقمة قال اخبرنا عبد الله بن مسعود رضي الله عنه اهون ما يكون الوتر ثلاث ركعات

(موطا امام محمد ص۱۵۰)

حضرت علقمہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ہمیں بتایا کہ وتر کی کم سے کم تین رکعتیں ہیں۔

۹ ـــ عن ابراهيم عن عبد الله بن مسعود رضي الله عنه انه قال ما اجزأت ركعة واحدة قط۔

(موطا امام محمد ص۱۵۰)

حضرت ابراہیم نخعیؒ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ وتر کی ایک رکعت کبھی کافی نہیں ہو سکتی۔

۱۰ ـــ عن عقبة بن مسلم قال: سألت

عقبہ بن مسلم کہتے ہیں میں نے ابن عمر

عبد الله ابن عمر رضي الله عنهما عن الوتر، فقال اتعرف وتر النهار؟ فقلت نعم صلوة المغرب، قال صدقت واحسنت۔ (طحاوی ص۱۳۶ ج۱ باسناد صحیح)

رضی اللہ عنہما سے وتر کے بارے میں دریافت کیا (کہ اس کی کتنی رکعتیں ہیں) تو فرمایا کہ تم دن کے وتر کو جانتے ہو؟ میں نے کہا جی ہاں! نماز مغرب۔ فرمایا تم نے ٹھیک کہا اور بہت اچھا جواب دیا (بس اتنی ہی رکعتیں رات کے وتر کی ہیں)۔

۱۱۔ عن انس رضي الله عنه قال الوتر ثلث ركعات وكان يوتر بثلث ركعات (طحاوی ص۱۴۳ ج۱ ابن ابی شیبہ ص۲۹۲ ج۲، ص۲۹۳ و قال الحافظ فی الدرایۃ ص۱۱۵ اسنادہ صحیح)

حضرت انس رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ وتر کی تین رکعتیں ہوتی ہیں۔ اور وہ تین رکعت وتر پڑھا کرتے تھے۔

۱۲۔ عن ابی منصور قال سألت ابن عباس رضي الله عنهما عن الوتر فقال ثلث۔ (طحاوی ص۱۴۱ ج۱)

ابو منصور کہتے ہیں میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے وتر کے بارے میں دریافت کیا تو فرمایا تین رکعتیں۔

۱۳۔ عن عطاء قال ابن عباس رضي الله عنهما الوتر كصلوة المغرب (مؤطا امام محمد ص۱۵۰)

حضرت عطا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ وتر (تعداد رکعات میں) نماز مغرب کی طرح ہے۔

۱۴۔ عن ابی یحیی قال سمر المسور بن مخرمة وابن عباس رضي الله عنهما حتى طلعت الحمراء، ثم نام ابن عباس رضي الله عنهما

ابو یحیی کہتے ہیں کہ حضرت مسور بن مخرمہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما رات میں گفتگو کرتے رہے یہاں تک کہ سرخ ستارہ طلوع ہو گیا۔ پھر ابن عباس رضی اللہ عنہما

فلم یستیقظ الا باصوات اھل الزورا فقال لاصحابہ اترونی ادرک اصلی ثلاثا یرید الوتر ورکعتی الفجر وصلوۃ الصبح قبل ان تطلع الشمس؟ فقالوا نعم، وھذا فی آخر وقت الفجر۔ (طحاوی ص۱۴۱ ج۱)

سو گئے۔ پھر ان کی آنکھ اس وقت کھلی جب اہل زوراء کی آوازیں آنے لگیں۔ تو اپنے رفقاء سے فرمایا کہ کیا خیال ہے۔ میں سورج طلوع ہونے سے پہلے تین وتر۔ دو رکعتیں سنت فجر کی اور نماز صبح پڑھ سکوں گا؟ انہوں نے عرض کیا جی ہاں! اور یہ فجر کا آخری وقت تھا۔

امام طحاوی اس روایت کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ اگر ابن عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک تین رکعت سے کم وتر جائز ہوتے تو یا ممکن تھا کہ ایسے تنگ وقت میں، جب کہ نماز فجر کے قضا ہونے کا اندیشہ تھا۔ تین ہی وتر پڑھتے۔"

۱۵ عن سعید بن جبیر عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال الوتر سبع۔ او خمس۔ والثلاث بتیراء وانی لاکرہ بتیراً (طحاوی ص۱۴۲ ج۱ عبدالرزاق ص۲۳ ج۳)

سعید بن جبیر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ وتر کی پانچ یا سات رکعتیں ہونی چاہئیں۔ تین رکعتیں تو دم بریدہ ہیں۔ اور میں دم بریدہ کو پسند نہیں کرتا۔

۱۶۔۔۔ عن سعید بن المسیب عن عائشۃ رضی اللہ عنہا، کان الوتر سبعاً وخمساً والثلاث بتیراً۔

سعید بن مسیب حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ وتر تو سات اور پانچ تھے۔ تین رکعتیں تو دم بریدہ ہیں۔

(طحاوی ص۱۳۹ ج۱ ابن ابی شیبہ ص۲۹۴ ج۲)

دونوں حضرات کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ وتر کی اصل رکعتیں تو تین ہی ہیں۔ مگر یہ اچھی بات نہیں کہ آدمی خالی وتر پڑھ کر فارغ ہو جائے۔ اس سے پہلے دو چار رکعتیں نفل کی نہ پڑھے۔

۱۷۔۔۔ عن الحسن قال کان ابی بن کعب رضی اللہ عنہ یوتر بثلاث

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ تین وتر پڑھا کرتے

لا یسلم الا فی الثالثة مثل المغرب۔

(عبدالرزاق ص ۲۶ ج ۳)

تھے، دوسری رکعت پر سلام نہیں پھیرتے تھے بلکہ نماز مغرب کی طرح صرف تیسری رکعت پر سلام پھیرتے تھے۔

۱۸۔۔۔عن ابی غالبؒ ان ابا امامة رضی اللہ عنہ کان یوتر بثلاث۔

(طحاوی ص ۱۴۲ ج ۱، ابن ابی شیبہ ج ۲ ص ۲۹۴)

ابو غالب کہتے ہیں کہ حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ تین وتر پڑھا کرتے تھے۔

۱۹۔۔۔عن ابی خالدة قال سألت ابا العالیة عن الوتر فقال علمنا اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم او علمونا ان الوتر مثل صلوٰة المغرب غیر انا نقرأ فی الثالثة۔ فھذا وتر اللیل وھذا وتر النھار۔

(طحاوی ص ۱۴۳ ج ۱)

ابو خالدہ کہتے ہیں کہ میں نے ابو العالیہؒ سے وتر کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نے ہمیں تعلیم دی ہے کہ وتر کی نماز مغرب کی نماز کی طرح پڑھی جاتی ہے۔ ماسوا اس کے کہ ہم اس کی تیسری رکعت میں بھی قرأت کرتے ہیں۔ پس یہ رات کا وتر ہے اور مغرب کی نماز دن کا وتر ہے۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے نزدیک نماز مغرب اور نماز وتر کے درمیان کیفیت ادا میں اس کے سوا کوئی فرق نہیں تھا کہ مغرب کی تیسری رکعت میں قرأت ضروری نہیں اور وتر میں ضروری ہے۔

۲۰۔۔۔عن القاسم قال رأینا اناساً منذ ادرکنا یوترون بثلاث وان کلاً لواسع وارجو ان لا یکون بشئ منہ بأس۔

(صحیح بخاری ص ۱۳۵ ج ۱)

قاسم بن محمدؒ فرماتے ہیں کہ ہم نے جب سے ہوش سنبھالا ہے لوگوں کو تین ہی وتر پڑھتے دیکھا ہے۔ ویسے سب طرح گنجائش ہے۔ اور مجھے توقع ہے کہ کسی چیز میں بھی کوئی حرج نہیں ہوگا۔

مطلب یہ کہ جب سے ہم نے ہوش سنبھالا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کو تین ہی وتر پڑھتے دیکھا ہے۔ چونکہ ان کے زمانہ میں بعض حضرات اپنے اجتہاد سے ایک رکعت کے جواز کا بھی فتویٰ دینے لگے تھے۔ اس لیے اختلاف اجتہاد کی بنا پر فرمایا کہ صحابہ کرامؓ کی اصل سنت تو تین ہی وتر ہے ہاں! جو لوگ ایک رکعت کے جواز کا فتویٰ دیتے ہیں ان کا قول چونکہ اجتہاد پر مبنی ہے اس لیے مواخذہ ان سے بھی نہیں ہوگا۔

۲۱ — عن علقمة قال الوتر ثلاث. (ابن ابی شیبہ ص۲۹۴ ج۲)

حضرت علقمہؒ کا ارشاد ہے کہ وتر کی تین رکعتیں ہیں۔

۲۲ — عن ابراهيم .... وكان يقال لا وتر اقل من ثلاث (ایضاً)

حضرت ابراہیم نخعیؒ فرماتے ہیں کہ (صحابہؓ کے زمانے میں) کہا جاتا تھا کہ تین سے کم وتر نہیں ہوتے۔

۲۳ — عن ابی اسحاق قال كان اصحاب علیّ واصحاب عبد الله لا يسلمون فی ركعتی الوتر۔ (ایضاً ص۲۹۵)

ابو اسحاقؒ فرماتے ہیں کہ حضرت علی اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کے اصحاب وتر کی دو رکعتوں پر سلام نہیں پھیرا کرتے تھے۔

۲۴ — عن ابی الزناد عن السبعة. سعيد بن المسيّب. وعروة الزبير. والقاسم بن محمد. وابی بكر بن عبد الرحمٰن. وخارجة بن زيد. وعبيد الله بن عبد الله. وسليمان بن يسار. فی مشيخة سواهم اهل فقه وصلاح وفضل وربما اختلفوا فی شیء فاخذ بقول اكثرهم وافضلهم رأياً فكان مما وعيت عنهم علی هذه الصفة ان الوتر ثلث لا يسلم الا فی آخرهن۔

ابو الزنادؒ کہتے ہیں کہ میں نے مدینہ کے سات فقہا یعنی سعید[1] بن مسیب، قاسم[2] بن محمد، عروہ[3] بن زبیر، ابوبکر[4] بن عبدالرحمٰن، خارجہ[5] بن زید، عبیداللہ[6] بن عبداللہ، سلیمان[7] بن یسار کا زمانہ اور ان کے علاوہ ایسے مشائخ کا زمانہ پایا ہے جو علم و فضل اور صلاح و تقویٰ میں ممتاز تھے۔ کبھی ان حضرات کا کسی مسئلہ میں اختلاف ہو جاتا تو ان میں سے اکثر و افضل کے قول پر عمل کیا جاتا تھا۔ ان حضرات سے اسی شان کے ساتھ جو مسئلہ میں نے محفوظ کیا وہ یہ تھا کہ وتر کی تین رکعتیں ہیں جن کے

(طحاوی ص۱۴۵ ج۱) صرف آخر میں سلام پھیرا جاتا ہے۔

۲۵ ـــ عن ابی الزناد قال اثبت عمر بن عبد العزیز الوتر بقول الفقہاء ثلاثا لا یسلم الا فی آخرھن۔ (طحاوی ص۱۴۵ ج۱)

ابو الزناد فرماتے ہیں کہ خلیفہ راشد عمر بن عبد العزیزؒ نے فقہاء کے قول کے مطابق فیصلہ کیا تھا کہ وتر کی تین رکعتیں ہیں جن کے صرف آخر میں سلام پھیرا جاتا ہے۔

۲۶ ـــ عن الحسن قال اجمع المسلمون ان الوتر ثلاث لا یسلم الا فی آخرھن۔ (ابن ابی شیبہ ص۲۹۴ ج۲)

حسن بصریؒ ارشاد فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ وتر کی تین رکعتیں ہیں جن کے صرف آخر میں سلام پھیرا جاتا ہے۔

صحابہ کرامؓ کے آثار، مدینہ طیبہ کے فقہائے سبعہ اور دیگر اکابر تابعین کے فتویٰ اور خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے فیصلے سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ کرامؓ تک اور صحابہ کرامؓ سے تابعین عظامؒ تک تین وتر کی تعلیم توارث و تعامل کے ساتھ چلی آتی تھی۔ اسی کو امام حسن بصریؒ "مسلمانوں کے اجماع" سے تعبیر فرما رہے ہیں۔

دوم: یہ کہ بعض روایات کے پیش نظر بعض حضرات صحابہؓ و تابعینؒ ایک رکعت وتر کے بھی قائل تھے۔ ان حضرات فقہاء نے ان روایات کی تحقیق و تفتیش کے بعد فتویٰ دیا (اور ان کے فتویٰ پر حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے فیصلہ فرمایا) کہ احادیث طیبہ، جمہور صحابہؓ کے تعامل کے پیش نظر تین وتر کا قول ہی جادۂ مستقیمہ ہے۔ اس کے مقابلہ میں دوسرے اقوال و آراء مرجوح اور شاذ ہیں۔

مخالف روایات پر ایک نظر:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول مبارک اور حضرات صحابہ و تابعین کا تعامل و توارث معلوم ہو جانے کے بعد ان روایات کی تشریح بھی ضروری ہے جن کی طرف سوال میں یہ کہہ کر اشارہ کیا گیا ہے۔

"حضرت عائشہؓ سے ثابت ہے کہ حضورؐ نے تین پانچ یا سات رکعات وتر پڑھے تو تشہد کے لیے دو دو رکعات پر نہ بیٹھتے تھے۔ ان ہی سے ایک رکعت وتر بھی ثابت ہے۔"

اس قسم کی روایات حضرت عائشہ صدیقہ۔ حضرت ام سلمہ۔ حضرت ابن عباس حضرت ابن عمر اور حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں، ذیل میں ہر روایت کی تشریح کی جاتی ہے۔

حدیث عائشہؓ :

حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا وارضاہا کو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے "أعلم اھل الارض بوتر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" فرمایا ہے۔ یعنی روئے زمین پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وتر کی سب سے زیادہ عالم۔ (صحیح مسلم ص۲۵۶ ج۱) وتر کے بارے میں حضرت عائشہؓ کی حدیث ان سے متعدد راویوں نے مختلف طرق اور مختلف الفاظ سے نقل کی ہے، بعض حضرات نے ان مختلف الفاظ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وتر کی مختلف صورتیں قرار دیا ہے۔ حالانکہ اگر تمام طرق کو جمع کیا جائے تو قدر مشترک یہ نکلتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وتر کی تین رکعتیں دو قعدوں اور ایک سلام کے ساتھ پڑھتے تھے سب سے پہلے حضرت عائشہؓ کی حدیث کے طرق پر غور کیا جاتا ہے۔

روایت سعد بن ھشام :-

صحیح مسلم ص۲۵۶ ج۱ میں سعد بن ہشام انصاری کی روایت ہے کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے عرض کیا۔

انبئینی عن وتر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، فقالت کنا نعد لہ سواکہ وطہورہ، فیبعثہ اللہ ماشاء ان یبعثہ من اللیل فیتسوک ویتوضأ۔ ویصلی تسع رکعات لایجلس فیھا الا فی الثامنۃ فیذکر اللہ ویحمدہ ویدعوہ ثم ینھض ولایسلم ثم یقوم فیصلی التاسعۃ ثم یقعد فیذکر اللہ ویحمدہ	مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وتر کے بارے میں بتائیے! فرمایا، ہم آپ کے لیے مسواک اور پانی تیار کر رکھتے تھے۔ رات کے کسی حصہ میں اللہ تعالیٰ آپکو بیدار کرتے تو آپ مسواک کرتے۔ وضو کرتے۔ اور نو رکعتیں پڑھتے۔ ان میں صرف آٹھویں رکعت پر بیٹھتے۔ پس اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے۔ حمد و ثنا کرتے۔ دعائیں مانگتے۔ پھر سلام پھیرے بغیر اٹھ جاتے۔ پھر نویں رکعت پہ بیٹھتے۔

ويدعوه ثم يسلم تسليماً يسمعنا	اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ۔ حمد وثنا کرتے ۔ دعا
ثم يصلي ركعتين بعد ما يسلم	کرتے ۔ پھر اس طرح سلام پھیرتے کہ ہمیں
وهو قاعد ۔ فتلك احدى	سن جاتا ۔ پھر سلام کے بعد دو رکعتیں بیٹھ کر
عشرة ركعة يا بني ۔ فلما اسن	پڑھتے ۔ پس یہ کل گیارہ رکعتیں ہو گئیں ۔
نبي الله صلى الله عليه وسلم	پس جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سن رسیدہ
واخذه اللحم اوتر بسبع	ہوگئے اور بدن بھاری ہو گیا تو سات رکعت
وصنع في الركعتين مثل	وتر پڑھا کرتے تھے ۔ اور دو رکعتیں اسی
صنيعه في الاول فتلك تسع	طرح پڑھتے تھے ۔ جس طرح پہلے پڑھا کرتے
يا بني ۔	تھے ۔ پس یہ کل نو رکعتیں ہوئیں ۔

اس روایت سے بعض حضرات نے یہ سمجھا ہے کہ پہلے زمانے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وتر کی نو رکعتیں پڑھتے تھے ۔ اور صرف آٹھویں رکعت پر قعدہ فرماتے تھے اور نویں رکعت پر سلام پھیرتے تھے اور آخری زمانے میں سات وتر پڑھتے تھے ۔ ان میں چھٹی رکعت پر بغیر سلام کے قعدہ کرتے اور ساتویں پر سلام پھیرتے تھے ۔

حالانکہ ٹھیک یہی حدیث اسی سند سے نسائی ص ۲۴۸ ج ۱ ، مؤطا امام محمد ص ۱۵۱ ، طحاوی ص ۱۴۷ ج ۱ ، محلی ابن حزم ص ۴۹ ج ۴ ، ابن ابی شیبہ ص ۲۹۵ ج ۲ ، مستدرک حاکم ص ۳۰۴ ج ۱ ، دارقطنی ص ۱۷۵ ، بیہقی ص ۳۱ ج ۳ میں بایں الفاظ ہے ۔

كان النبي صلى الله عليه وسلم لا يسلم	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وتر کی دو رکعتوں
في ركعتي الوتر ۔	پر سلام نہیں پھیرتے تھے ۔

اور مستدرک حاکم ص ۳۰۴ ج ۱ میں یہی حدیث ان الفاظ سے ہے ۔

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تین وتر پڑھا
يوتر بثلاث لا يسلم الا في	کرتے تھے ۔ اور صرف ان کے آخر میں سلام
آخرهن ۔	پھیرا کرتے تھے ۔

اور مسند احمد (ص ۱۵۶ ج ۶) میں سعد بن ہشام کی یہی حدیث ان الفاظ میں ہے ۔

ان رسول الله صلی الله علیه وسلم	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز عشاء
اذا صلی العشاء دخل المنزل ثم	سے فارغ ہو کر گھر میں تشریف لاتے
صلی رکعتین. ثم صلی بعدها	تو پہلے دو رکعتیں پڑھتے۔ پھر دو رکعتیں
رکعتین اطول منهما. ثم	ان سے طویل پڑھتے۔ پھر تین رکعتیں
اوتر بثلاث لا یفصل	پڑھتے تھے۔ ایسے طور پر کہ ان کے
بینهن ثم صلی رکعتین وهو	درمیان سلام کا فصل نہیں کرتے تھے۔
جالس۔	پھر بیٹھ کر دو رکعتیں پڑھتے تھے۔

یہ ایک ہی راوی کی روایت کے مختلف الفاظ ہیں۔ ان تمام طرق و الفاظ کو جمع کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ۔

الف :۔ سعد بن ہشام کی روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کل گیارہ رکعتیں پڑھتے تھے جن میں وتر اور وتر کے بعد کے دو نفل بھی شامل تھے۔

ب :۔ ہر دو رکعت پر قعدہ کرتے تھے۔

ج :۔ ان میں تین رکعتیں وتر کی ہوتی تھیں۔

د :۔ وتر کی دو رکعتوں پر قعدہ کرتے تھے مگر سلام نہیں پھیرتے تھے۔

ہ :۔ وتر کے بعد بیٹھ کر دو نفل پڑھتے تھے۔

اس تفصیل سے واضح ہو جاتا ہے کہ صحیح مسلم میں سعد بن ہشام کی روایت میں جن نو رکعتوں کا ذکر ہے ان میں چھ رکعتیں تہجد کے نوافل تھے۔ اور تین رکعتیں وتر کی۔ مگر روایت میں وتر سے ماقبل و مابعد کے نوافل کو ملا کر ذکر کر دیا گیا جس سے اشکال پیدا ہوا۔ چونکہ ان کا سوال صلوٰۃ اللیل کے بارے میں نہیں بلکہ وتر کے بارے میں تھا۔ اس لیے جواب میں حضرت امّ المؤمنینؓ نے صلوٰۃ اللیل کی رکعات کو تو اجمالاً بیان فرمایا۔ اور ان رکعات میں سے جو رکعات وتر کی تھیں ان کی تفصیل بیان فرمائی کہ آٹھویں رکعت پر جو وتر کی دوسری رکعت تھی۔ قعدہ فرماتے تھے۔ مگر سلام نہیں پھیرتے تھے۔ اور نویں رکعت پر جو وتر کی تیسری رکعت تھی۔ سلام پھیرتے تھے ــــ اسی مضمون کو سعد بن ہشام کی دوسری روایات میں بیان فرمایا گیا ہے۔ جیسا کہ اوپر معلوم ہوا۔ پس صحیح مسلم کی روایت میں حضرت امّ المومنینؓ کا یہ ارشاد کہ :۔

نو رکعتیں پڑھتے تھے۔ ان میں نہیں بیٹھتے تھے مگر آٹھویں میں۔ پس ذکر و حمد اور دعا کے بعد اُٹھ جاتے تھے۔ اور سلام نہیں پھیرتے تھے۔ بلکہ نویں رکعت پڑھ کر سلام پھیرتے تھے"۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان آٹھ رکعتوں میں قعدہ ہوتا ہی نہیں تھا۔ کیونکہ یہ مضمون حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی کی احادیث کے خلاف ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ آٹھویں رکعت پر بغیر سلام کے جو قعدہ فرماتے تھے۔ پہلی رکعتوں میں ایسا قعدہ نہیں فرماتے تھے۔ بلکہ ماقبل کی رکعتوں میں ہر دوگانہ پر سلام پھیرتے تھے۔ مگر چونکہ ساتویں اور آٹھویں رکعت کو نویں رکعت کے ساتھ ملا کر تین وتر پڑھنا مقصود ہوتا تھا اسلئے آٹھویں رکعت پر قعدۂ سلام نہیں کرتے تھے۔ بلکہ قعدہ کرنے کے بعد سلام پھیرے بغیر اٹھ جاتے تھے۔ اس تقریر کے بعد سعد بن ہشام کی روایات متفق ہو جاتی ہیں۔ اور ان کے درمیان کوئی اختلاف نہیں رہتا۔ اور ایک ہی راوی کی روایت ایک ہی سند سے مختلف الفاظ میں مروی ہو تو اس کو متعدد واقعات پر محمول کر کے یہ سمجھ لینا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کبھی ایسا کرتے ہوں گے۔ اور کبھی ایسا کرتے ہوں بے صحیح طرز فکر نہیں ہے کیونکہ یہ ایک ہی واقعہ کی مختلف تعبیرات ہیں ایک ہی واقعہ کو جب نقل کرنے والے مختلف الفاظ اور مختلف انداز میں نقل کریں تو وہ متعدد واقعات نہیں بن جاتے۔

روایت عروہ عن عائشہؓ:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے وتر کی نماز نقل کرنے والوں میں ایک ان کے خواہرزادہ حضرت عروہ بن زبیرؓ ہیں حضرت عائشہؓ سے ان کی روایت بھی مختلف الفاظ سے مروی ہے۔

ایک روایت میں ہے۔

يصلّي بالليل احدى عشرة ركعة يوتر منها بواحدة فاذا فرغ منها اضطجع على شقه الأيمن حتى يأتيه المؤذن فيصلي ركعتين خفيفتين (صحیح مسلم ج۱ ص۲۵۳)	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رات میں گیارہ رکعتیں پڑھتے تھے۔ ان میں سے ایک رکعت سے وتر کیا کرتے تھے۔ اس سے فارغ ہوتے تو داہنی کروٹ پر لیٹ جاتے یہاں تک مؤذن آپؐ کے پاس آتا۔ تو دو ہلکی پھلکی رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔

دوسری روایت میں ہے :-

يصلّي فيما ان يفرغ من صلوة العشاء الى الفجر احدى عشرة ركعة يسلّم بين كل ركعتين ويوتر بواحدة فاذا اسكت المؤذن من صلوة الفجر وجاءه وتبين له الفجر وجاء المؤذن قام فركع ركعتين خفيفتين ثم اضطجع على شقه الايمن حتى يأتيه المؤذن للاقامة۔ (صحیح مسلم ص۲۵۴ ج۱)

آپ نماز عشاء سے فارغ ہونے سے لے کر فجر تک گیارہ رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔ ہر دو رکعت کے درمیان سلام پھیرتے اور ایک رکعت کے ساتھ وتر پڑھتے۔ پھر جب مؤذن اذان فجر سے فارغ ہو کر آپ کے پاس آتا۔ اور صبح روشن ہو جاتی تو دو ہلکی سی رکعتیں پڑھتے۔ پھر دائیں کروٹ پر لیٹ جاتے یہاں تک مؤذن اقامت کے لیے آپ کے پاس آتا۔

تیسری روایت میں ہے :-

كان يصلّي بالليل ثلاث عشرة ركعة ثم يصلّي اذا سمع النداء ركعتين خفيفتين۔ (طحاوی ص۱۳۸ ج۱)

رات میں تیرہ رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔ پھر جب فجر کی اذان سنتے تو دو ہلکی سی رکعتیں پڑھتے۔

چوتھی روایت میں ہے -

يصلّي من الليل ثلث عشرة ركعة يوتر من ذالك بخمس ولا يجلس في شئ الا في آخرها۔ (صحیح مسلم ص۲۵۴ ج۱)

رات میں تیرہ رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔ ان میں سے پانچ کے ساتھ وتر پڑھتے۔ اور ان پانچ میں نہیں بیٹھتے تھے مگر ان کے آخر میں۔

اور پانچویں روایت میں ہے :-

كان يصلّي ثلاث عشرة ركعة بركعتي الفجر۔ (صحیح مسلم ص۲۵۴ ج۱)

آپ سنت فجر سمیت تیرہ رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔

حضرت عروہؒ کی ان روایات میں بظاہر تعارض نظر آتا ہے۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی دوسری احادیث سے بھی متعارض نظر آتی ہیں۔ مگر ہمارے نزدیک نہ یہ روایات متعارض ہیں۔ اور نہ متعدد واقعات پر محمول ہیں۔ بلکہ ایک ہی واقعہ کی مختلف تعبیرات ہیں۔

چنانچہ جس روایت میں فرمایا گیا ہے کہ گیارہ رکعتیں پڑھتے تھے۔ اور ہر دو رکعت پر سلام پھیرتے تھے۔ اور ایک رکعت سے وتر کیا کرتے تھے۔ اس میں دو حکم الگ الگ ذکر کئے گئے ہیں۔ ایک ہر دو رکعت پر بیٹھنا۔ اور دوسرے ایک رکعت کو ماقبل کے دوگانہ کے ساتھ ملا کر وتر بنانا۔ پہلا حکم وتر سے قبل کی آٹھ رکعتوں سے متعلق ہے۔ اور دوسرا حکم وتر کی تین رکعات سے متعلق ہے۔ پس روایت کا یہ مطلب نہیں کہ وتر کی تنہا ایک رکعت پڑھتے تھے بلکہ یہ مطلب ہے کہ گیارہویں رکعت کو ماقبل کے دوگانہ سے ملا کر وتر بناتے تھے۔ اگر کسی شخص نے ایک وتر کا نظریہ پہلے سے ذہن میں نہ جما رکھا ہو تو ہم نے اس روایت کا جو مطلب بیان کیا ہے وہ روایت کے سیاق و سباق سے بالکل واضح ہے۔ جس پر دو صاف اور صریح قرینے موجود ہیں۔ ایک یہ کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی متواتر روایات میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تین وتر پڑھا کرتے تھے۔ اور خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول پہلے گزر چکا ہے کہ صرف تین رکعت وتر نہیں ہونے چاہئیں۔ بلکہ اس سے قبل دو یا چار رکعتیں ضرور پڑھنی چاہییں۔ الغرض جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے متعدد حضرات کی صحیح روایات موجود ہیں کہ آپؐ تین وتر پڑھا کرتے تھے تو حضرت عروہؒ کی روایت کو بھی اسی پر محمول کرنا لازم ہوگا۔ دوسرا قرینہ یہ ہے کہ خود حضرت عروہؒ کا فتویٰ فقہائے سبعہ کے فتویٰ میں گزر چکا ہے۔

الوتر ثلاث لا یفصل بینھنّ بسلام۔	وتر کی تین رکعتیں ہیں جن کے درمیان سلام کے ساتھ فصل نہیں کیا جاتا۔

اب اگر ان کی روایت "یوتر بواحدۃ" کا مطلب یہ ہوتا کہ تنہا ایک وتر پڑھتے تھے تو ان کا فتویٰ قطعاً یہ نہ ہوتا۔ پس ان کی روایت کا صحیح مطلب وہی ہوگا جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی باقی احادیث کے بھی مطابق ہے۔ اور خود حضرت عروہؒ کے اپنے فتویٰ کے بھی موافق ہے۔

اور جس روایت میں یہ ہے کہ "پانچ رکعت وتر پڑھتے تھے، ان کے صرف آخر میں بیٹھتے تھے"۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان پانچ رکعتوں میں نہ تو قعدہ کرتے تھے۔ اور نہ سلام پھیرتے تھے۔ کیونکہ یہ مطلب خود حضرت عروہ ہی کی گذشتہ روایت کے خلاف ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ہر دو رکعت پر سلام پھیرتے تھے۔ اور ایک ہی راوی کی ایک ہی سند سے روایت شدہ حدیث کو الگ الگ واقعات پر محمول کرنا قطعاً غیر موزوں ہے۔ بلکہ اس کا صحیح مطلب جو حضرت عائشہؓ کی احادیث اور خود حضرت عروہؓ کی روایت اور فتویٰ کے مطابق ہے ـــــ یہ ہے کہ صلوٰۃ اللیل کی کل تیرہ رکعتیں ہوتی تھیں۔ ان میں سے چھ رکعتوں کے درمیان تو وقفہ فرماتے تھے۔ لیکن پانچ رکعتیں ایک ساتھ پڑھتے تھے، پہلے دو نفل اور پھر تین وتر۔ ان کے درمیان وقفہ نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ یہ پانچ رکعتیں پڑھ کر بیٹھتے تھے۔ الغرض اس روایت میں وتر سے پہلے کی دو رکعتوں پر سلام پھیرنے کی نفی نہیں۔ نہ وتر کے پہلے قعدہ کی نفی ہے۔ بلکہ ان پانچ رکعتوں کی موالات کو بیان کرنا منظور ہے کہ ان کے درمیان وقفہ نہیں فرماتے تھے۔ بلفظ دیگر یوں کہہ لیجئے کہ اس روایت میں جلوس فی الصلوٰۃ کی نفی نہیں۔ بلکہ جلوس بعد السلام کی نفی ہے۔ اور اس کی نظیر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہر و عصر اور مغرب و عشا کے جمع کرنے کو یوں تعبیر فرمایا۔

صليت مع النبي صلى الله عليه وسلم ثمانيا جميعاً و سبعاً جميعاً۔	میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آٹھ رکعتیں اکٹھی اور سات رکعتیں اکٹھی پڑھی ہیں۔
(صحیح مسلم جلد ۱ ص ۲۴۶)	

اب اس کا مطلب کوئی عاقل یہ نہیں سمجھے گا کہ ظہر و عصر کی آٹھ رکعتیں اور مغرب و عشاء کی سات رکعتیں ایک ہی سلام اور ایک ہی قعدہ کے ساتھ پڑھی ہونگی۔ بلکہ مقصود یہ ہے کہ ظہر و عصر اور مغرب و عشاء کی نمازوں میں ایسا وقفہ نہیں فرمایا جو عام طور پر ہوتا ہے۔ اسی طرح زیر بحث روایت کا مطلب سمجھنا چاہئیے کہ یہاں پانچ رکعتوں میں وقفہ رجلوس کی نفی ہے۔ سلام یا قعدہ کی نفی نہیں۔

ابن ابی شیبہ ص ۲۹۱ ج ۲ میں عروہؓ کی روایت میں ہے:

كان يوتر بركعة وكان يتكلم بين الركعتين	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک رکعت کے ساتھ وتر پڑھتے تھے اور دو رکعتوں۔

والركعة۔ اور ایک رکعت کے درمیان کلام فرماتے تھے۔

اس روایت میں "یوتر برکعۃ" کا مطلب تو وہی ہے جو اوپر ذکر کر چکا ہوں۔ یعنی گیارہویں رکعت کو ماقبل کی دو رکعتوں کے ساتھ ملا کر تین وتر پڑھتے تھے۔ اور دو رکعتوں اور ایک رکعت کے درمیان جو کلام کرنے کا ذکر ہے اس سے مراد بعد کی دو رکعتیں ہیں۔ جیسا کہ دیگر روایات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول مروی ہے کہ وتر کے بعد دو رکعتیں پڑھتے تھے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ابوسلمہ بن عبد الرحمٰن۔ عمرۃ بنت عبد الرحمٰن۔ عبد اللہ بن ابی قیس اور عبد العزیز بن جریج بھی وتر کی حدیث نقل کرتے ہیں۔ اور ان میں تین وتر کی صراحت موجود ہے۔ اسود بن قیس مسروق بن اجدع اور یحییٰ بن جزار بھی روایت کرتے ہیں، ان کی روایات میں وتر کی اگرچہ صراحت نہیں لیکن ان روایات کو دوسری روایات کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو تین ہی وتر نکلیں گے۔ الغرض حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جو باتفاق اہل علم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وتر کی سب سے زیادہ عالم ہیں، ان کی تمام روایات کو جمع کیا جائے تو میزان تین ہی وتر نکلتی ہے۔ اور سعد بن ہشام اور عروہ بن زبیر کی جن ایک دو روایتوں سے اس کے خلاف کا وہم ہوتا ہے ان کا صحیح مطلب اوپر عرض کیا جا چکا ہے۔

یہاں اس امر پر بھی تنبیہ کرنا ضروری ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز تہجد (صلوٰۃ اللیل) کی رکعات میں تو کمی بیشی ہو جاتی تھی مگر تین وتر میں کوئی تغیر نہیں ہوتا تھا۔ اس کو بھی حضرت ام المؤمنین رضی اللہ عنہا نے واضح فرما دیا ہے۔ چنانچہ سعد بن ہشام، مسروق بن اجدع اور یحییٰ بن جزار کی روایت میں بڑی عمر سے پہلے اور بعد کی نماز کا فرق بیان فرمایا گیا ہے۔ مگر وتر دونوں جگہ تین ہیں اور عبد اللہ بن ابی قیس کی روایت میں ہے۔

باربع و ثلاث۔ وست وثلاث چار اور تین، چھ اور تین اور آٹھ اور

و ثمان و ثلاث۔ (ابوداؤد ج ۱ ص ۱۹۳ طحاوی ج ۱ ص ۱۳۹) تین۔

یعنی تہجد کی رکعتیں کبھی چار، کبھی چھ، اور کبھی آٹھ ہوتی تھیں۔ مگر وتر بہر صورت تین رہتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وتر کی رکعات میں بھی کوئی تغیر ہوتا تو ام المؤمنین رضی اللہ عنہا اسے

بھی ضرور بیان فرماتیں۔ خصوصاً جب کہ عبداللہ بن ابی قیس کا سوال وتر کے بارے میں تھا چنانچہ وہ فرماتے ہیں

سألت عائشة رضی الله عنها بكم كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يوتر۔	میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وتر کی کتنی رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔

اگر وتر کے بارے میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مختلف ہوتی تو اس موقعہ پر ام المؤمنین رضی اللہ عنہا اس کا اظہار ضرور فرماتیں۔ رکعات تہجد میں کمی بیشی کو بیان کرنا اور وتر کی رکعات کو بہر صورت تین بیان کرنا اس امر کی صاف اور واضح دلیل ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دائمی معمول تین رکعات وتر تھا۔ اور اس میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوتی تھی۔ والله يقول الحق وهو يهدى السبيل۔

حدیث ابن عباسؓ :

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ایک رات اپنی خالہ ام المؤمنین میمونہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں اسی مقصد کے لیے قیام کیا تھا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قیام لیل کا مشاہدہ کریں۔ ان کی یہ روایت بھی مختلف طرق اور مختلف الفاظ میں مروی ہے۔ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں۔

والحاصل ان قصة مبيت ابن عباس رضی الله عنهما يغلب على الظن عدم تعددها فلهذا ينبغي الاعتناء بالجمع بين مختلف الروايات فيها ولا شك ان الاخذ بما اتفق عليه الاكثر والاحفظ اولى مما خالفهم فيه من هو دونهم ولاسيما ان زاد او نقص۔ (فتح الباری ج۲ ص۳۸۸ مطبعہ بہیہ مصر)	حاصل یہ کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے کاشانۂ نبوت میں رات گذارنے کا واقعہ غالب خیال یہ ہے کہ ایک ہی بار کا ہے۔ اس لیے اس سلسلہ میں جو مختلف روایات وارد ہیں ان کو جمع کرنے کا اہتمام کرنا چاہیئے اور کوئی شک نہیں کہ جس حصہ پر اکثر اور احفظ متفق ہوں وہ اولیٰ ہوگا۔ بہ نسبت ان راویوں کے جو ان سے فروتر ہوں خصوصاً جہاں کمی زیادتی ہو

عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث کے متعدد راوی تین وتر کی تصریح کرتے ہیں مثلاً:
۔ابن عباسؓ کے صاحبزادے علی بن عبداللہ کی روایت میں ہے۔

ثم اوتر بثلاث۔ (صحیح مسلم ص۲۶۱ ج۱، نسائی ص۲۴۹ ج۱، طحاوی ص۱۴۱ ج۱) — پھر آپ نے تین وتر پڑھے۔

۔یحییٰ بن الجزار کی روایت میں ہے۔

کان یصلی من اللیل ثمان رکعات ویوتر بثلاث ویصلی رکعتین قبل صلوٰۃ الفجر (نسائی ص۲۴۹ ج۱، طحاوی ص۱۴۱) — آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رات میں آٹھ رکعتیں پڑھتے تین وتر پڑھتے تھے۔ اور دو رکعتیں نماز فجر سے پہلے پڑھتے تھے۔

۔کریب مولیٰ ابن عباسؓ کی روایت میں ہے:۔

فصلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رکعتین بعد العشاء ثم رکعتین ثم رکعتین ثم رکعتین، ثم اوتر بثلاث۔ (طحاوی ص۱۴۱ ج۱) — پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عشا کے بعد دو رکعتیں پڑھیں۔ پھر دو رکعتیں، پھر دو رکعتیں، پھر دو رکعتیں، پھر تین وتر پڑھے۔

صحیحین میں کریب کی روایت سے ہے۔

فصلی رکعتین ثم رکعتین ثم رکعتین ثم رکعتین ثم رکعتین ثم رکعتین ثم اوتر۔ (بخاری ص۱۳۵ ج۱، مسلم ص۲۶۰ ج۱) — پس آپ نے دو رکعتیں پڑھیں، پھر دو، پھر دو، پھر دو، پھر دو، پھر دو، پھر وتر پڑھے۔

کہ علی بن عبداللہ، یحییٰ بن جزار اور خود کریب کی مذکورہ روایت میں اس کی وضاحت موجود ہے کہ آپ نے تین وتر پڑھے تھے۔ اس لیے صحیحین کی روایت میں جو چھ مرتبہ دو دو رکعت کا ذکر کے بعد ثم اوتر آتا ہے اس کا یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ آپؐ نے ماقبل کے دوگانہ کے ساتھ ملا کر تین وتر پڑھے۔ جیسا کہ اوپر عروہ عن عائشہؓ کی روایت میں اس کی تقریر گذر چکی ہے۔

خود حافظؒ نے بھی فتح الباری ص۳۸۸ج۲ میں یحییٰ بن جزار کی روایت کو ناطق قرار دے کر اس کے حوالے سے صحیحین کی اس روایت میں تاویل کی ہے۔

الغرض جب ابن عباس رضی اللہ عنہما کے متعدد راوی اس پر متفق ہیں کہ آپؐ نے اس رات تین وتر پڑھے تھے۔ اور خود کریبؒ کی ایک روایت میں بھی اس کی صراحت موجود ہے تو کریبؒ کی وہ روایت جس میں دونوں احتمال نکل سکتے ہیں۔ اس کو بھی اسی پر محمول کرنا لازم ہوگا کہ آپ نے ایک رکعت ماقبل کے دوگانہ سے ملا کر تین وتر پڑھے۔ اسے ایک وتر پر محمول کرنا کسی صورت میں بھی درست نہیں۔

کریبؒ کی زیر بحث روایت کے مماثل ایک روایت صحیح مسلم ص۲۶۲ج۱، اور ابوداؤد ص۱۹۳ج۱ میں حضرت زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جس میں چھ مرتبہ دو دو رکعتوں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے۔ "ثم اوتر" جو مطلب اوپر کریبؒ کی روایت کا بیان کیا گیا ہے وہی مفہوم اس کا بھی ہے۔ یعنی تیرھویں رکعت آپؐ نے ماقبل کے دوگانہ کے ساتھ ملا کر پڑھی۔ اور اس کا قرینہ طحاوی ص۱۴۲ج۱ کی روایت ہے۔ اس میں پانچ مرتبہ دو دو رکعتوں کا ذکر کر کے فرمایا گیا ہے۔ "ثم اوتر" (پھر آپ نے وتر پڑھے) گویا طحاوی کی روایت میں آخری دو رکعتوں کو تیسری رکعت کے ساتھ ملا کر وتر میں شامل کر دیا گیا۔ اور مسلم اور ابوداؤد کی روایت میں وتر کی تین رکعتوں میں سے دو کو الگ اور ایک کو الگ ذکر کر دیا گیا، پس یہ محض تعبیر کا اختلاف ہے۔ نفس واقعہ بہرصورت ایک ہے۔ اور وہ ہے تین وتر۔

۴ــــ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سعید بن جبیر کی روایت میں ہے:۔

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يوتر بثلاث الخ	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تین رکعت وتر پڑھا کرتے تھے۔

یہ پوری حدیث اوپر احادیث کے ضمن میں ص۱۱ پر باحوالہ ذکر کر چکا ہوں۔ اور وہاں یہ بھی ذکر کر چکا ہوں کہ اس مضمون کی متواتر احادیث دس سے زائد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم سے مروی ہیں۔

اور صحیح بخاری ص۹۷ج۱ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سعید بن جبیر کی روایت ہے۔

فصلى اربع ركعات ثم نام ثم قام فجئت فقمت عن يساره۔	پس آپ نے چار رکعات پڑھیں پھر سو گئے پھر اٹھے۔ میں آکر آپ کی بائیں جانب کھڑا ہو

فجعلنی عن یمینه فصلّٰی خمس	ہو گیا۔ آپؐ نے مجھے دائیں جانب کر لیا ۔
رکعات ثم صلّٰی رکعتین ۔	پس آپ نے پانچ رکعتیں پڑھیں پھر دو رکعتیں (سنّت فجر) پڑھیں ۔

اس روایت میں کوئی شخص نہیں کہے گا کہ آپ نے پہلی چار رکعتیں ایک ہی قعدہ اور ایک ہی سلام کے ساتھ پڑھی ہوں گی ۔ اسی طرح آخری پانچ رکعات کے بارے میں نہیں کہا جائے گا کہ انہیں ایک ہی قعدہ اور ایک ہی سلام کے ساتھ ادا فرمایا تھا ۔ بلکہ سعید بن جبیر کی گذشتہ بالا روایت کے پیش نظر ہر شخص اس کا یہی مطلب سمجھے گا کہ دو رکعتیں الگ پڑھیں اور تین رکعتیں (وتر) الگ ــــــ راوی کا مقصود یہ نہیں کہ ان پانچ رکعتوں میں نہ قعدہ تھا نہ سلام بلکہ مقصود ان پانچ رکعتوں کی موالات کو بیان کرنا ہے ۔ یعنی جس طرح پہلی چار رکعتیں لگاتار پڑھی تھیں ان کے درمیان وقفہ نہیں فرمایا تھا اسی طرح یہ پانچ رکعتیں بھی لگاتار بغیر وقفہ کے پڑھی تھیں ۔

اور اسی مضمون کو ابو داؤد ج ۱ ص ۱۹۲ کی روایت میں یوں تعبیر کیا ہے ۔

ثم اوتر بخمس لم یجلس	پھر آپ نے وتر پڑھے پانچ رکعتوں کے ساتھ
بینهنّ ۔	ان کے درمیان میں نہیں بیٹھے ۔

مطلب یہ کہ پہلے دو رکعتیں پڑھیں ۔ پھر تین وتر ۔ اور ان کے درمیان وقفہ نہیں فرمایا ۔ چونکہ یہ پانچ رکعتیں بغیر وقفہ کے تھیں اس لیے مجموعہ پر وتر کا اطلاق کر دیا گیا اور وتر کے ساتھ کے نوافل پر "وتر" کا اطلاق بکثرت ہوا ہے ۔

خلاصہ یہ کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قصہ کی تمام روایات کو جمع کیا جائے تو ان میں متعدد روایات میں تین وتر کی تصریح ہے ۔ اور باقی روایات اس کے لیے محتمل ہیں ۔ اس لیے ان روایات کو بھی تین ہی وتر پر محمول کیا جائے گا ۔ ان کو الگ الگ واقعات پر محمول کر کے وتر کی مختلف صورتیں قرار دینا کسی طرح بھی صحیح نہیں ۔ بلکہ جیسا کہ حافظ کے حوالے سے نقل کر چکا ہوں یہ ایک ہی واقعہ کی مختلف تعبیرات ہیں اور ایک ہی واقعہ کو اگر راوی مختلف عنوانات اور مختلف تعبیرات سے بیان کریں تو اس سے کئی واقعات نہیں بن جایا کرتے اور نہ مختلف تعبیرات سے جواز وتر کی مختلف صورتیں پیدا ہو سکتی ہیں ۔ خصوصاً جب کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا فتویٰ اوپر نقل کر چکا ہوں کہ صرف تین وتر پر اکتفا نہیں کرنا چاہیئے بلکہ اس کے ساتھ دو چار نوافل

ضرور پڑھنے چاہئیں۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک وتر کی تین ہی رکعتیں ہیں۔ اور انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی کا مشاہدہ کیا تھا۔

حدیث ام سلمہ رضی اللہ عنہا :-

ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے یحییٰ بن جزار کی روایت ہے :-

کان یصلی من اللیل احدیٰ عشرۃ رکعۃ فلما کبر وضعف اوتر بسبع۔ (نسائی ص ۲۵۱ ج ۱، ترمذی ص ۶۱ ج ۱)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رات کو گیارہ رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔ مگر جب کبر سنی کی وجہ سے ضعف ہو گیا تو سات رکعتیں پڑھنے لگے۔

یہ حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کے مطابق ہے۔ اور یحییٰ بن جزار کی حدیث میں یہ تصریح گذر چکی ہے کہ ان میں آٹھ رکعتیں نوافل کی اور تین وتر کی ہوتی تھیں۔ مگر مجموعہ صلوٰۃ اللیل کو لفظ "وتر" سے تعبیر کر دیا گیا جیسا کہ امام ترمذیؒ نے اس حدیث کے ذیل میں اسحاق بن ابراہیم سے اسکی تصریح نقل کی ہے۔

انما معناہ انہ کان یصلی من اللیل ثلاث عشرۃ رکعۃ مع الوتر فنسبت صلوٰۃ اللیل الی الوتر۔ (ترمذی ص ۶۱ ج ۱)

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رات میں وتر سمیت تیرہ رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔ اس لیے صلوٰۃ اللیل کی نسبت وتر کی طرف بھی کر دی گئی ہے۔

اور نسائی میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی روایت مقسم سے جو مروی ہے کہ :

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوتر بخمس وسبع لا یفصل بینھما بسلام ولا کلام۔ (ص ۲۴۹ ج ۱)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پانچ اور سات رکعات کے ساتھ وتر پڑھتے تھے۔ ان کے درمیان سلام وکلام کا فصل نہیں فرماتے تھے۔

اول تو اس کی سند مضطرب ہے، جیساکہ امام نسائی نے اس کی تفصیل ذکر کی ہے کہ کبھی مقسم اسے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں۔ کبھی ابن عباسؓ کا واسطہ ذکر کرتے ہیں۔ اور کبھی حضرت عائشہ اور حضرت میمونہ رضی اللہ عنہما سے یہ قول منسوب کرتے ہیں۔

الوتر سبع فلا اقل من خمس۔ وتر سات ہونے چاہئیں ورنہ پانچ سے کم نہیں۔

ایسی مضطرب روایت متواتر روایات کے مقابلہ میں حجت نہیں ہوسکتی۔ بلکہ اگر اس کو صحیح کہنا ہو تو خود اس میں تاویل کی جائے گی کہ ان پانچ یا سات رکعتوں میں بلند آواز سے سلام نہیں کہتے تھے نہ کسی سے گفتگو فرماتے تھے۔ آخری رکعت سے فارغ ہو کر اس قدر بلند آواز سے سلام کہتے تھے کہ گویا گھر والے جاگ پڑیں گے۔ یہ مضمون حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایات میں صراحت سے آیا ہے اس لیے اسکو بھی اسی پر محمول کیا جائے گا۔

حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہما :

صحیحین میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے :

ان رجلا سأل النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن صلوٰۃ اللیل فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلوٰۃ اللیل مثنیٰ مثنیٰ فاذا خشی احدکم الصبح صلی رکعۃ واحدۃ توتر لہ ما قد صلی۔	ایک شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صلوٰۃ اللیل کے بارے میں دریافت کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ رات کی نماز دو دو رکعت ہوتی ہے۔ پھر جب تم میں سے ایک کو صبح کا اندیشہ ہو جائے تو ایک رکعت پڑھ لے وہ اس کی پڑھی ہوئی نماز کو وتر بنادے گی۔
(بخاری ص۱۳۶ ج۱، مسلم ص۲۵۷ ج۱)	

اور صحیح مسلم ص۲۵۷ ج۱ بروایت ابی مجلز حضرت ابن عباس و ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے۔

الوتر رکعۃ من آخر اللیل۔	وتر ایک رکعت ہے۔ رات کے آخری حصہ میں۔

صحیح مسلم کی یہ روایت مستقل حدیث نہیں بلکہ گذشتہ بالا حدیث ہی کا اختصار ہے۔ چنانچہ ابن ماجہ

ص۲۹ پر یہ روایت یوں ہے۔

صلوٰۃ اللیل مثنیٰ والوتر رکعۃ قبل الصبح۔ — رات کی نماز دو دو رکعت ہے۔ اور وتر ایک رکعت ہے صبح سے پہلے۔

بعض حضرات کو خیال ہوا ہے کہ یہ حدیث ایک وتر کے جواز پر نص صریح اور برہان قاطع ہے۔ مگر یہ خیال صحیح نہیں۔ حق تعالیٰ شانہٗ حافظ ابن حجرؒ کو جزائے خیر عطا فرمائیں کہ وہ فتح الباری میں ہمیں اس کے جواب سے سبکدوش کر گئے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

وتعقب بانہٗ لیس صریحاً فی الفصل۔ فیحتمل ان یرید بقولہٖ "صلی رکعۃً واحدۃً" ای مضافۃ الی رکعتین مما مضیٰ۔ (فتح الباری ص۳۸۵ ج۲) — یہ حدیث ایک رکعت کے الگ پڑھنے میں صریح نہیں۔ کیونکہ احتمال ہے کہ آپؐ کی مراد یہ ہو کہ گذشتہ دو رکعتوں کے ساتھ ایک اور رکعت ملا کر تین وتر پڑھے۔

شرح اس کی یہ ہے کہ وتر کا وتر (طاق) ہونا آخری رکعت پر موقوف ہے، جس کے ذریعہ نمازی اپنی نماز کو وتر (طاق) بنائے گا۔ اس کے بغیر خواہ ساری رات بھی نماز پڑھتا رہے، اس کی نماز وتر نہیں بن سکتی۔ اور نہ اس کے بغیر وتر کا وجود متحقق ہو سکتا ہے۔ اس حقیقت کے اظہار کے لیے فرمایا گیا۔

الوتر رکعۃ من آخر اللیل۔ — وتر ایک رکعت ہے رات کے آخری حصہ میں۔

اور یہ بالکل اسی طرح ہے جیسا کہ حج کے بارے میں فرمایا گیا۔

الحج عرفۃ۔ (جامع صغیر ص۱۵ ج۱ بحوالہ السنن الاربعہ ومسند احمد وغیرہ) — حج عرفہ کا نام ہے۔

جس کا مطلب یہ ہے کہ وقوف عرفات کے بغیر حج کی حقیقت متحقق نہیں ہوتی۔ لیکن کوئی عاقل اس کا یہ مطلب نہیں لے گا کہ حج کی پوری حقیقت بس وقوف عرفہ ہے۔ اس کیلئے نہ احرام کی ضرورت نہ دو...

مناسک کی۔

اس طرح "الوتر رکعۃ من آخر اللیل" کا مطلب یہ ہے کہ ماقبل کی نماز کے ساتھ جب تک ایک رکعت کو نہ ملایا جائے وتر کی حقیقت متحقق نہیں ہوگی۔ یہ مطلب نہیں کہ وتر کی پوری حقیقت ہی بس ایک رکعت ہے۔ اسی کو یوں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

صلوٰۃ اللیل مثنیٰ مثنیٰ فاذا خشی احدکم الصبح صلّی رکعۃ واحدۃ توتر لہ ما قد صلّی۔	رات کی نماز دو دو رکعت ہے۔ پس جب تم سے کسی کو صبح کے طلوع کا اندیشہ لاحق ہو جائے تو ایک رکعت اور پڑھ لے جو اس کی پڑھی ہوئی نماز کو وتر بنا دے گی۔

اس کا صحیح مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ دو دو رکعت پڑھتا جائے۔ جب صبح کے طلوع کا اندیشہ ہو تو آخری دوگانہ کے ساتھ ایک رکعت اور ملا لے، جس سے اس کی نماز وتر بن جائے گی۔ جہاں تک نماز وتر کی پوری حقیقت کا تعلق ہے وہ ابن عمر رضی اللہ عنہما ہی کی حدیث میں یوں بیان فرمائی گئی ہے۔

صلوٰۃ المغرب وتر النہار فاوتروا صلوٰۃ اللیل۔	مغرب کی نماز دن کے وتر ہیں۔ پس رات کی نماز کو وتر بنایا کرو۔

یہ حدیث پہلے باحوالہ گذر چکی ہے۔ اور میں وہاں بتا چکا ہوں کہ شارع علیہ السلام کے ذہن میں نماز وتر کا ٹھیک وہی تصور ہے جو نماز مغرب کا ہے۔

اور پھر اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حدیث خطبہ کے دوران برسر منبر ارشاد فرمائی تھی۔ جیسا کہ صحیح بخاری صفحہ ۶۸ "باب الحلق والجلوس فی المسجد" میں اس کی تصریح ہے۔ اس کے باوجود جمہور صحابہ تین سے کم وتر کے قائل نہیں تھے۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی کا یہ مطلب ہوتا کہ وتر کی بس ایک ہی رکعت ہوتی ہے یا یہ کہ ایک رکعت وتر بھی جائز ہے تو تمام اکابر صحابہ کو غلط فہمی نہیں ہو سکتی تھی، سامعین میں سے دو چار اگر مطلب نہ سمجھیں تو جائے تعجب نہیں، لیکن جماہیر صحابہ کے بارے میں یہ خیال کرنا کہ انہوں نے مطلب نہیں سمجھا ہوگا یا انہیں یہ حدیث نہیں پہنچی ہوگی قطعاً صحیح نہیں، اس سے اس یقین میں اضافہ ہوتا ہے کہ ارشاد نبوی کا منشا وہی ہے جو

جو اکابر صحابہؓ نے سمجھا۔

اور یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہئیے کہ خود راوی حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہما بھی تین ہی وتر کے قائل تھے۔ چنانچہ احادیث میں ص۱۲ پر ان کی حدیث نقل کرچکا ہوں۔ اور ارشادات نبویہ ص۲ پر بھی ان کی مرفوع روایت گذر چکی ہے۔ جیسے امام مالکؒ نے مؤطا (الامر بالوتر ص۴۳) میں موقوفاً نقل کیا ہے۔

ان عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما	عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے تھے
کان یقول صلوٰۃ المغرب وتر النھار۔	کہ نماز مغرب دن کے وتر ہیں۔

حدیث ابی ایوب انصاریؓ:

نسائی ص۲۴۴ ج۱، ابو داؤد ص۲۰۱ ج۱، ابن ماجہ ص۸۴ وغیرہ میں حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا
الوتر حق علی کل مسلم، فمن	وتر واجب ہے ہر مسلمان پر پس جو شخص پانچ
احب ان یوتر بخمس فلیوتر ومن احب	وتر پڑھنا چاہے پڑھے اور جو تین وتر پڑھنا
ان یوتر بثلاث فلیفعل ومن احب	چاہے پڑھے۔ اور جو ایک وتر پڑھنا چاہے
ان یوتر بواحدۃ فلیفعل۔	پڑھے۔

حضرات شافعیہ اور جو حضرات ایک وتر کے جواز کے قائل ہیں سطحی نظر میں یہ روایت ان کی صریح دلیل بن سکتی تھی۔ مگر اس میں چند وجہ سے کلام ہے۔

اوّل:۔ یہ کہ اس میں کلام ہے کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، یا حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا اپنا قول ہے۔ حافظؒ التلخیص الجبیر ص۱۳ ج۲ میں لکھتے ہیں۔

وصحح ابو حاتم والذھلی والدارقطنی	ابو حاتم، ذہلی، دارقطنی علل میں بیہقی
فی العلل والبیھقی وغیر واحد	اور بہت سے حضرات نے اسکو موقوفاً صحیح کہا
وقفہٗ وھو الصواب۔	ہے اور یہی درست ہے۔

یعنی صحیح یہ ہے کہ یہ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا اپنا قول ہے۔ حدیث مرفوع کی حیثیت سے صحیح نہیں۔

دوم :۔ یہ کہ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی یہ روایت دارقطنی نے اس طرح نقل کی ہے۔

الوتر حق واجب فمن شاء فلیوتر بثلاث۔ — وتر حق واجب ہے۔ پس جو چاہے تین ہی وتر پڑھ لیا کرے۔

حافظؒ التلخیص الجبیر صفحہ ۱۱۳ میں اس کو نقل کر کے فرماتے ہیں۔ ورجالہ ثقات۔ اس طرح حضرت ابوایوبؓ انصاری رضی اللہ عنہ کی روایت میں ایک رکعت وتر کا اضافہ محل نظر ہو جاتا ہے۔

سوم :۔ اور نسائی صفحہ ۲۴۹ ج ۱ کی ایک روایت میں سات اور پانچ کے عدد کے بعد یہ اضافہ ہے۔

ومن شاء اوتر بواحدۃ ومن شاء اومی ایماءً — اور جو چاہے ایک وتر پڑھ لیا کرے۔ اور جو چاہے اشارہ کر لیا کرے۔

اس روایت کو اس کے ظاہر پر محمول کیا جائے تو ایک وتر بھی حذف ہو جاتا ہے اور اشارہ پر کفایت کر لینے کا جواز نکل آتا ہے۔ اور اگر اس کا یہ مطلب ہے کہ جو شخص رکوع و سجود پر قادر نہ ہو وہ اشارہ کر لیا کرے۔ تو اسی قرینے سے ایک رکعت کا جواز بھی معذور کے لیے ہو گا کہ جو شخص تین رکعت پر قادر نہ ہو وہ ایک ہی وتر پڑھ لیا کرے۔ الغرض اول تو یہ حدیث مرفوع نہیں، بلکہ حضرت ابوایوب انصاری رضی عنہ کا قول ہے۔ پھر اس میں اضطراب ہے۔ بعض روایتوں میں پانچ۔ تین۔ ایک کا ذکر ہے۔ بعض میں صرف تین کا۔ اور بعض میں اشارہ تک کی گنجائش دی گئی ہے۔ ایسی صورت میں یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ ایک رکعت کے جواز کا فتویٰ دیتے تھے۔

آخری بات :

تعداد وتر کا مسئلہ، اختصار کی پوری کوشش کے باوجود طویل ہو گیا۔ آخر میں اتنی گذارش مزید سن لیجئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے محض ایک رکعت وتر پڑھنا ثابت نہیں۔ حافظؒ نے تلخیص میں امام رافعیؒ کے حوالہ سے حافظ ابن الصلاح کا قول نقل کیا ہے۔

لا نعلم فی روایات الوتر مع — وتر کی روایات کی کثرت کے باوجود ہمیں

کان تھا انہ علیہ الصلوٰۃ والسلام اوتر بواحدۃ فحسب۔ (صفحہ ۱۵۱ ج ۲)	معلوم نہیں کہ کسی روایت میں یہ آتا ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی صرف ایک رکعت وتر پڑھی ہو۔

حافظؒ نے ابن صلاح کے اس قول کی تردید میں ابن حبان کے حوالے کریب عن ابن عباسؓ کی اکلوتی روایت پیش کی ہے کہ :۔

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اوتر برکعۃ۔	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رکعت کے ساتھ وتر پڑھے۔

اپنے مذہب کی رعایت کے لیے حافظؒ کی مجبوری بلا شبہ لائق رحم ہے۔ لیکن میں اوپر کریب عن ابن عباس کی روایت کے ذیل میں بتا چکا ہوں کہ کریب، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی کاشانۂ نبوت میں شب گذاری کے راوی ہیں۔ اور کریب کی تمام روایات اسی قصہ کی حکایت ہیں اس رات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین ہی وتر پڑھے تھے۔ جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے متعدد حضرات کی صحیح روایات موجود ہیں اور خود کریب کی صحیح روایت بھی ذکر کرچکا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین ہی وتر پڑھے تھے۔ اس لئے حافظؒ کی یہ اکلوتی روایت جو انہوں نے ابن حبان کے حوالے سے نقل کی ہے اسی پر محمول ہوگی کہ آپؐ نے ایک رکعت کو نافل کے دوگانہ کے ساتھ ملاکر تین وتر پڑھے۔

الغرض پورے ذخیرہ احادیث میں اس کا ثبوت نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک رکعت وتر پر اکتفا فرمایا ہو۔ اور جس کسی روایت سے ایسا وہم ہوتا ہے دیگر متواتر روایات سے اس وہم کا ازالہ ہوجاتا ہے۔ البتہ اس سے انکار نہیں کہ بعض صحابہ و تابعین (رضوان اللہ علیہم) ایک رکعت وتر کے بھی قائل تھے۔ بلا شبہ یہ حضرات اپنے اجتہاد کی بنا پر ماجور ہیں۔ جس طرح قریب قریب ہر فقہی باب میں بعض شاذ آراء بھی ہوتی ہیں۔ اسی طرح اس مسئلہ میں یہ رائے بھی شاذ ہے۔ جادۂ مستقیمہ وہی ہے جس پر صحابہ و تابعین (علیہم الرضوان) کی اکثریت گامزن تھی کہ وتر کی تین رکعتیں ہیں! اس کی تفصیل گذر چکی ہے۔ تاہم مناسب ہے کہ اس سلسلہ میں مزید ایک بات عرض کردی جائے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم سے تراویح کی باقاعدہ جماعت کا اہتمام شروع ہوا (موطا امام مالک صفحہ ۴۰)

میں اس سلسلہ میں دو روائتیں نقل کی ہیں۔ ایک گیارہ رکعت کی اور دوسری تیئیس رکعت کی۔ علامہ قسطلانی شرح بخاری میں لکھتے ہیں۔

وجمع البیھقی بینھما بانھم کانوا یقومون باحدی عشرۃ ثم قاموا بعشرین واوتروا بثلاث وقد عدوا ما وقع فی زمن عمر رضی اللہ عنہ کالاجماع (ارشاد الساری ص۲۲۶ ج۳)	امام بیہقیؒ نے ان کے درمیان اس طرح تطبیق دی ہے کہ پہلے گیارہ رکعتوں کے ساتھ قیام کرتے تھے۔ پھر ——— بیس تراویح اور تین وتر کے ساتھ۔۔۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں صحابہؓ کا جو تعامل رہا اس کو علماء نے بمنزلہ اجماع کے شمار کیا ہے۔

اور حافظ موفق ابن قدامہ المغنی ص۱۶۷ ج۲ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ان آثار کو نقل کر کے لکھتے ہیں۔

ومن علی انہ امر رجلاً یصلی فی رمضان عشرین رکعۃ۔ وھذا کالاجماع	اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک شخص کو رمضان میں بیس تراویح پڑھانے کا حکم فرمایا، اور یہ بمنزلہ اجماع کے ہے۔

چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے تعامل کو "کالاجماع" تصور کرتے ہوئے ائمہ اربعہ تراویح کی بیس رکعت پر متفق ہیں (اور ائمہ اربعہ کا کسی مسئلہ پر اتفاق بجائے خود اجماع کی دلیل ہے۔ جیسا کہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے "الانصاف" میں تحریر فرمایا ہے) ہماری گذارش یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جہاں تراویح کی بیس رکعت پر "کالاجماع ہوا" وہاں وتر کی تین رکعت پر بھی یہی "کالاجماع" ہوا۔ اور جو حضرات نہ صحابہ رضوان اللہ علیہم کے اجماعی تعامل کو لائق التفات سمجھتے ہیں نہ ائمہ اربعہ کے اتفاق کی قدر و قیمت کو سمجھتے ہیں۔ بلکہ تراویح کی آٹھ ہی رکعتوں کے قائل ہیں، وہ صحاح کی اس حدیث پر اعتماد کرتے ہیں جسے پہلے نقل کر چکا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دائمی معمول رمضان

وغیر رمضان میں گیارہ رکعات کا تھا۔ آٹھ تراویح اور تین وتر ـــــ گویا وتر یہاں بھی بطور دائمی معمول کے تین ہی نکلے۔ اور یہ حضرات بھی کم از کم وتر کے مسئلہ میں تو ہمارے ساتھ متفق ہو گئے۔ فنعم الوفاق وحبذا الاتفاق ـــ وللہ الحمد۔

دوسرا مسئلہ وتر کی دو رکعتوں پر قعدہ:

وتر کی دو رکعتوں پر تشہد پڑھنے کے لئے بیٹھنا ضروری ہے۔ اور اس کی چند وجوہ ہیں۔

اوّل: شریعت نے ہر نماز میں دو دو رکعت پر قعدہ لازم قرار دیا ہے۔ چنانچہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

وکان یقول فی کل رکعتین التحیۃ۔ (صحیح مسلم ص۱۹۴ ج۱)	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ ہر دو رکعت پر التحیات ہے۔

اور ترمذی ص۵ ج۱ میں حضرت فضل بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الصلوٰۃ مثنیٰ مثنیٰ تشہد فی کل رکعتین الحدیث۔	نماز دو دو رکعت ہوتی ہے، ہر دو رکعتوں میں تشہد ہے۔

اس مضمون کی اور بھی متعدد احادیث ہیں۔ اختصار کے پیش نظر ان کو ذکر نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ نماز میں ہر دو رکعت پر قعدہ امام احمدؒ کے نزدیک فرض، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک واجب اور امام مالکؒ وشافعیؒ کے نزدیک سنت ہے۔ مذاہب کی اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ہر دو رکعت پر قعدہ کا واجب ہونا معتدل قول ہے۔

الغرض جب شریعت نے نماز کے لئے ایک اصول اور ضابطہ مقرر کر دیا کہ اس کی ہر دو رکعت پر قعدہ ہے۔ خواہ نماز فرض ہو یا نفل۔ سنت ہو یا واجب، تو نماز وتر کو بھی اسی قاعدہ کے تحت رکھا جائے گا۔

دوم: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث:

صلوٰۃ اللیل مثنیٰ مثنیٰ۔	رات کی نماز دو دو رکعت ہوتی ہے۔

خاص صلوٰۃ اللیل اور وتر ہی کے بارے میں ارشاد فرمائی گئی ہے۔ جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا ہے۔ ارشاد نبوی "رات کی نماز دو دو رکعت ہے" میں دو مسئلوں پر تنبیہ فرمائی گئی ہے ایک یہ نماز کا کم سے کم نصاب دو رکعت ہے اس سے کم نماز نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فرائض ونوافل میں ہمیں کوئی نماز ایسی نہیں ملتی جس میں

شریعت نے ایک رکعت کو جائز رکھا ہو۔ اور اسے نماز قرار دیا ہو۔ ظاہر ہے کہ وتر کی نماز بھی اسی ضابطے کے تحت آئے گی، اور محض ایک رکعت وتر نماز نہیں کہلائے گی۔ دوسرا مسئلہ یہ کہ نماز کی ہر دو رکعت پر التحیات بیٹھنا ضروری ہے۔ ورنہ اس کے بغیر دوگانہ کا وجود ہی متحقق نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ صحیح مسلم ص ۲۵۷ ج ۱ میں اس روایت میں یہ اضافہ ہے :

قیل لابن عمر ما مثنیٰ مثنیٰ؟ قال ان تسلم فی کل رکعتین	ابن عمر رضی اللہ عنہما سے دریافت کیا گیا کہ دو دو رکعت کا کیا مطلب؟ فرمایا یہ کہ تم ہر دو رکعت پہ سلام کہو۔

یہاں سلام کہنے سے مراد التحیات ہے جیسا کہ حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گذر چکا ہے کہ "ہر دو رکعت پر التحیات ہے" نیز طبرانی کی معجم کبیر میں حضرت ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے :

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال فی کل رکعتین تشہد وتسلیم علی المرسلین وعلیٰ من تبعھم من عباد اللہ الصالحین (وفیہ علی بن زید واختلف فی الاحتجاج بہ۔ وقد وثق۔ مجمع الزوائد ص ۱۳۹ ج ۲)	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر دو رکعت پر تشہد ہے۔ اور رسولوں پر اور ان کی پیروی کرنے والے اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں پر سلام ہے۔

الغرض متعدد احادیث میں یہ اصول بیان فرمایا گیا ہے کہ نماز کی ہر دو رکعت پر تشہد کیا جائے۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث جو صلوٰۃ اللیل اور وتر ہی کے بارے میں ہے۔ اس میں بھی اسی ضابطہ کی نشاندہی کی گئی ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ نماز وتر میں دو رکعت پر تشہد کو واجب نہ کہا جائے۔

سوم: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور دیگر حضرات کی جن روایات میں یہ آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پانچ، سات یا نو وتر پڑھا کرتے تھے۔ ان کی تشریح پہلے گذر چکی ہے کہ ان میں صلوٰۃ اللیل اور وتر کے مجموعہ پر "وتر" کا اطلاق کر دیا گیا۔ ورنہ متواتر احادیث سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وتر تین رکعت ہوتے تھے۔ اور جیسا کہ سعد بن ہشام کی روایت میں گذر چکا ہے انکی دو رکعتوں پہ تشہد بھی پڑھا کرتے

تے مگر سلام نہیں پھیرتے تھے۔ بعینہٖ یہی حنفیہ کا مذہب ہے۔

چہارم : شریعت میں ایسی کوئی نماز نہیں جس میں صرف ایک رکعت کو جائز رکھا گیا ہو۔ یا جس میں کئی دوگانوں کو بغیر تشہد کے جمع کیا گیا ہو۔ جو حضرات نماز وتر میں شریعت کے اس قاعدے کو توڑتے ہیں اور راویوں کی تعبیرات سے غلط فہمی میں مبتلا ہو کر یہ فتویٰ دیتے ہیں کہ وتر کی پانچ، سات یا نو رکعتیں ایک ہی سلام اور ایک ہی قعدے سے جائز ہیں کیا یہ صحیح ہوگا کہ وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث۔

صلیت مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم	میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ
ثمانیا جمیعاً وسبعاً	(ظہر وعصر کی) آٹھ رکعتیں اور (مغرب وعشاء)
جمیعاً۔	کی سات رکعتیں اکٹھی پڑھی ہیں۔

کے پیش نظر یہ فتویٰ بھی دے ڈالیں کہ ظہر وعصر کی آٹھ اور مغرب وعشا کی سات رکعتیں ایک ہی قعدہ اور ایک ہی سلام کے ساتھ جائز ہیں، اور جو بزرگ حدیث "الوتر رکعة من اللیل" کو دیکھ کر یہ فتویٰ دیتے ہیں کہ وتر کی ایک رکعت بھی جائز ہے۔ کیا یہ صحیح ہوگا کہ وہ "الحج عرفہ" کی حدیث سے یہ فتویٰ بھی دیا کریں کہ صرف وقوف عرفہ سے حج ہو جاتا ہے۔ اس کے لئے اور ارکان ومناسک کی ضرورت نہیں۔ لیکن اگر ان تعبیرات سے کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہوتی۔ کیونکہ ظہر وعصر اور مغرب وعشا کی نمازوں کا ضابطہ معلوم ہے۔ اسی طرح حج کے ارکان ومناسک بھی معلوم ہیں تو اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ متواتر احادیث سے نماز وتر کا ضابطہ بھی معلوم ہے کہ اس کی تین رکعتیں ہیں۔ راویوں کی باقی تعبیرات کو اسی ضابطہ پر منطبق کیا جائے گا۔ یہ نہیں کہ ایک راوی کی تعبیر کو ایک مستقل اصول بنا کر اس کے لیے متواتر ضابطہ کو توڑ دیا جائے۔

تیسرا مسئلہ : قنوت وتر کے لئے تکبیر اور رفع یدین :

اس مسئلہ میں چند امور قابل ذکر ہیں۔

اول : اس میں اختلاف ہوا ہے کہ قنوت صرف وتر میں پڑھی جائے یا نماز فجر میں بھی اور رکوع سے پہلے پڑھی جائے یا رکوع کے بعد؟ حنفیہ اس کے قائل ہیں کہ قنوت وتر ہمیشہ ہے اور وہ رکوع سے پہلے ہے، اور قنوت نازلہ، جو نماز فجر میں خاص حوادث کے موقع پر پڑھی جاتی ہے۔ رکوع کے بعد ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے رکوع سے قبل اور بعد قنوت پڑھنے کی جو روایات مروی ہیں، حنفیہ کے نزدیک ان کے درمیان یہی تطبیق ہے

چنانچہ صحیح بخاری ص۱۳۶ ج۱ "باب القنوت قبل الرکوع وبعدہٗ" میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

حدثنا عاصم قال سألت انس بن مالک رضی اللہ عنہ عن القنوت فقال کانت القنوت. قلت قبل الرکوع او بعدہٗ، قال قبلہٗ۔ قلت فان فلاناً اخبرنی عنک انک قلت بعد الرکوع۔ فقال کذب. انما قنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعد الرکوع شہراً الحدیث۔

عاصم احول کہتے ہیں میں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے قنوت کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے فرمایا۔ قنوت ہوتی تھی۔ میں نے کہا رکوع سے پہلے یا بعد میں؟ فرمایا رکوع سے پہلے، میں نے کہا کہ فلاں شخص نے مجھے بتایا ہے کہ آپ فرماتے ہیں کہ رکوع کے بعد قنوت ہے۔ فرمایا، اس نے غلط کہا ہے۔ رکوع کے بعد تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک مہینہ قنوت پڑھی تھی۔

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی کی دوسری روایت میں ہے۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قنت حتیٰ مات۔ وابوبکر رضی اللہ عنہ حتیٰ مات وعمر رضی اللہ عنہ حتیٰ مات (رواہ البزار ورجالہ موثقون مجمع الزوائد ص۱۳۹ ج۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قنوت پڑھی یہاں تک کہ آپؐ کا وصال ہوگیا۔ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے قنوت پڑھی یہانتک کہ ان کا وصال ہوگیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قنوت پڑھی یہانتک کہ ان کا وصال ہوگیا۔

بظاہر اس روایت میں قنوت سے قنوت وتر مراد ہے، کیونکہ قنوت فجر پر دوام ثابت نہیں جیسا کہ صحیح بخاری کی مذکورہ بالا روایت کے علاوہ متعدد احادیث میں اس کی تصریح ہے۔ اس لئے مسند احمد در بزار کی روایت کے یہ الفاظ کہ:۔

مازال رسول اللہ صلی اللہ علیہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ فجر میں

وسلم یقنت فی الفجر حتیٰ	قنوت پڑھتے رہے، یہاں تک کہ دنیا سے
فارق الدنیا۔	تشریف لے گئے۔

اس میں "اگر" فی الفجر" کے الفاظ راوی کا سہو نہیں تو قنوت نازلہ پر محمول ہے۔ بہرحال متعدد احادیث کی بنا پر حنفیہ کی تحقیق یہ ہے کہ ۔قنوت نازلہ جو فجر کی نماز میں (اور بعض اوقات دوسری نمازوں میں بھی) پڑھی جاتی تھی ۔ وہ رکوع کے بعد ہوتی تھی اور خاص حوادث کے موقع پر پڑھی جاتی تھی ۔لیکن وتر میں قنوت ہمیشہ تھی اور وہ رکوع سے پہلے ہوتی تھی ۔

دوم : جو حضرات رکوع سے قبل قنوت کے قائل ہیں ان کے نزدیک قرأت اور قنوت کے درمیان فصل کرنے کے لئے قنوت کے لئے تکبیر کہنا سنت ہے ۔ امام طحاویؒ فرماتے ہیں ۔

واما التکبیر فی القنوت فی الوتر	لیکن قنوت وتر کی تکبیر، اس نماز میں ایک زائد
فانها تکبیرۃ زائدۃ فی تلک الصلوٰۃ	تکبیر ہے ۔اور جو حضرات قنوت قبل الرکوع کے
وقد اجمع الذین یقنتون قبل	قائل ہیں ان کا اس پر اجماع ہے کہ اس تکبیر
الرکوع علی الرفع معها ۔(طحاوی ج ۱ ص ۳۳۲)	کے ساتھ رفع یدین بھی ہوگا ۔

سوم : قنوت وتر قبل الرکوع متعدد احادیث سے ثابت ہے ۔

۱ــــ عن ابی بن کعب رضی اللہ عنہ	حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت
ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تین رکعت
کان یوتر بثلاث رکعات ... ویقنت قبل	وتر پڑھتے تھے ...... اور رکوع سے
الرکوع (نسائی ج ۱ ص ۲۴۸)	قبل قنوت پڑھتے تھے ۔

ابن ماجہ ص ۸۴ کی روایت میں ہے ۔

کان یوتر فیقنت قبل الرکوع	آپ وتر پڑھتے تھے تو رکوع سے قبل پڑھتے تھے ۔
۲ــــ عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ	حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے
ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قنت	روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
فی الوتر قبل	وتر کی نماز میں رکوع سے قبل قنوت پڑھی

الركوع۔	کرتے تھے۔

(قال الدارقطني: ابان بن ابي عياش متروك۔ قلت ورواه الخطيب في "كتاب القنوت" (من غير طريق ابان بن ابي عياش) وذكره ابن الجوزي في "التحقيق" من جهة الخطيب وسكت عنه۔ الا انه قال احاديثنا مقدمة۔ كما في نصب الراية ص۱۲۴ ج۲، وقال الترمذي في العلل ط۳۳۶ ج۲، وقد روى غير واحد عن ابراهيم النخعي عن علقمة عن عبد الله بن مسعود ان النبي صلى الله عليه وسلم كان يقنت في وتره قبل الركوع)

۳ ـــــ عن ابن عمر رضي الله عنهما ان	حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے
النبي صلى الله عليه وسلم كان يوتر بثلاث	کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تین وتر پڑھا کرتے
ركعات ويجعل القنوت قبل الركوع۔	تھے اور رکوع سے پہلے قنوت پڑھتے تھے۔

(قال الطبراني لم يروه عن عبيد الله الا سعيد بن سالم۔ نصب الراية ص۱۲۴ ج۲)

۴ ـــــ عن ابن عباس رضي الله عنهما	حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت
قال بت عند النبي صلى الله عليه وسلم	ہے کہ میں ایک رات آنحضرت صلی اللہ علیہ
فقام من الليل فصلى ركعتين[1] ثم	وسلم کے پاس رہا۔ پس آپ رات کو اٹھے
قام فاوتر، فقرأ بفاتحة الكتاب	پس دو رکعتیں پڑھیں پھر اٹھ کر وتر پڑھے
وسبح اسم ربك الاعلى ثم	پہلی رکعت میں سورۃ فاتحہ کے بعد سبح اسم
ركع وسجد ثم قام فقرأ	ربک الاعلیٰ پڑھی۔ پھر رکوع اور سجدہ
بفاتحة الكتاب وقل يا ايها	کیا۔ پھر دوسری رکعت میں سورۃ فاتحہ اور
الكافرون ثم ركع وسجد	قل یا ایہا الکافرون پڑھی۔ پھر رکوع کیا اور
وقام فقرأ بفاتحة الكتاب	سجدہ کیا۔ اور تیسری رکعت میں سورۃ فاتحہ

---

[1] قال في التعليق: كذا في الاصل۔ ولعل الصواب ركعتين ركعتين بالتكرار ـــ قلت لعله اختصار من الراوي، فذكر صفة الوتر والركعتين اللتين قبلها۔ والله اعلم۔

و قل هو الله احد ثم قنت ودعا قبل الركوع ۔

اور قل ھو اللہ پڑھی ۔ پھر قنوت پڑھی پھر رکوع کیا ۔

(رواہ الامام محمدؒ فی کتاب الحجہ صـ۲۰۱ جـ۱ واللفظ لہٗ ، ورواہ ابو نعیم فی الحلیہ کما فی نصب الرایہ صـ۱۲۴ جـ۲)

۵ ـــــ عن الاسود قال صحبت عمر بن الخطاب رضی الله عنه ستة اشهر فكان يقنت فی الوتر قبل الركوع ـ (كتاب الحجة صـ۲۰۱ جـ۱)

حضرت اسود فرماتے ہیں کہ میں چھ مہینے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی صحبت میں رہا ۔ وہ وتر کی نماز میں رکوع سے پہلے قنوت پڑھا کرتے تھے ۔

۶ ـــــ عن الاسود ان عبد الله بن مسعود رضی الله عنه كان لا يقنت فی شئی من الصلوات الا فی الوتر قبل الركوع ـ

حضرت اسود فرماتے ہیں کہ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ وتر کے سوا کسی نماز میں قنوت نہیں پڑھتے تھے ۔ وتر میں رکوع سے پہلے پڑھتے تھے ۔

(ابن ابی شیبہ صـ۳۰۲ جـ۲ ، کتاب الحجۃ امام محمدؒ صـ۲۰۱ جـ۱ ، مجمع الزوائد صـ۲۴۴ جـ۲)

۷ ـ عن علقمة ان ابن مسعود واصحاب النبی صلی الله علیه وسلم رضی الله عنهم كانوا يقنتون فی الوتر قبل الركوع ـ (ابن ابی شیبہ صـ۳۰۲ جـ۲)

حضرت علقمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم وتر میں رکوع سے پہلے قنوت پڑھا کرتے تھے ۔

ابن ابی شیبہؒ فرماتے ہیں : "ہذا الامر عندنا" (صـ۳۰۶ جـ۲) یعنی ہمارے نزدیک وتر میں رکوع سے قبل ہی قنوت صحیح ہے ۔

چہارم : جہاں تک قنوت وتر کے لئے تکبیر اور رفع یدین کا تعلق ہے ، اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل روایات ہیں ۔

۱ ـــــ عن عبد الله بن مسعود رضی الله عنه ان النبی صلی الله علیه وسلم

عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وتر میں رکوع

كان يقنت فى الوتر قبل الركوع —
قال ثم ارسلت امى ام عبد
فباتت عند نسائه، فاخبرتنى
انه قنت فى الوتر
قبل الركوع۔
(ابن ابی شیبہ صفحہ ۳۰۲ ج ۲)

سے قبل قنوت پڑھا کرتے تھے۔ حضرت
عبداللہؓ فرماتے ہیں کہ پھر میں نے اپنی والدہ ام
عبد کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر
بھیجا، وہ امہات المؤمنین کے پاس رات
رہیں، پھر انہوں نے مجھے بتایا کہ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم نے رکوع سے پہلے
قنوت پڑھی تھی۔

و فى الاستيعاب لابن عبد البر
ام عبد الله بن مسعود روى عنها
ابنها عبد الله بن مسعود انها
قالت رأيت رسول الله صلى
عليه وسلم قنت فى الوتر
قبل الركوع ويعرف ايضا
بها حديث ام ابن مسعود يرويه
حفص بن سليمان عن ابان بن
عياش عن ابراهيم النخعى عن
علقمة عن عبد الله قال ارسلت
امى ليلة لتبيت عند النبى
صلى الله عليه وسلم فتنظر
كيف يوتر فباتت عند
النبى صلى الله عليه وسلم
فصلى ماشاء الله ان يصلى

حافظ ابن عبد البرؒ الاستیعاب میں لکھتے ہیں۔
ام عبدؓ: عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی
والدہ ہیں۔ ان سے ان کے صاحبزادے حضرت
عبداللہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رکوع سے
پہلے قنوت پڑھتے دیکھا ہے، اور انہی
کی نسبت وہ حدیث معروف ہے جسے
حفص بن سلیمان ابان بن ابی عیاش سے
وہ ابراہیم نخعی سے وہ علقمہ سے وہ عبداللہ
بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے
ہیں کہ میں نے اپنی والدہ کو بھیجا کہ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر بھی رات رہیں
اور دیکھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
وتر کس طرح پڑھتے ہیں چنانچہ وہ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں رات رہیں۔

حتی اذا کان آخر اللیل واراد الوتر قرأ بسبح اسم ربک الاعلی فی الرکعۃ الاولی وقرأ فی الثانیۃ قل یا ایھا الکافرون ثم قعد ثم قام ولم یفصل بینھما بالسلام ثم قرأ بقل ھو اللہ احد اللہ الصمد لم یلد ولم یولد ولم یکن لہ کفوا احد حتی اذا فرغ کبر ثم قنت فدعا بما شاء اللہ ان یدعوہ ثم کبر ورکع۔

پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رات میں۔ جتنا اللہ تعالیٰ کو منظور تھا۔ نماز پڑھی۔ جب رات کا آخری حصہ ہوا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وتر پڑھنے کا ارادہ فرمایا تو پہلی رکعت میں سبح اسم ربک الاعلیٰ اور دوسری رکعت میں قل یا ایہا الکفرون پڑھی۔ پھر قعدہ کیا۔ پھر سلام پھیرے بغیر کھڑے ہو گئے۔ پھر آپ نے تیسری رکعت میں قل ہو اللہ احد پڑھی۔ یہاں تک کہ جب اس سے فارغ ہوئے تو تکبیر کہی پھر دعائے قنوت پڑھی۔ اور جو اللہ تعالیٰ کو منظور تھا دعائیں کیں۔ پھر تکبیر کہی اور رکوع کیا۔

(استیعاب ج۴ ص۲۵۱ برحاشیہ اصابہ)

۲ ــــ عن الاسود قال عن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کان یرفع یدیہ اذا قنت فی الوتر۔ (ابن ابی شیبہ ج۲ ص۲۷/۲۹)

حضرت اسود فرماتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود قنوت وتر کے لئے رفع یدین کیا کرتے تھے۔

۳ ــــ وفی جزء رفع الدین انہ کان یقرأ فی آخر رکعۃ من الوتر قل ھو اللہ احد ثم رفع یدیہ فیقنت قبل الرکعۃ۔

امام بخاریؒ کے رسالہ رفع الیدین ص۲۴ میں ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ وتر کی آخری رکعت میں قل ہو اللہ احد پڑھا کرتے تھے پھر رفع یدین کرتے۔ پس رکوع سے قبل قنوت پڑھتے۔

۴ــــ عن ابی عثمان کان عمر رضی اللہ عنہ یرفع یدیہ فی القنوت ؛

(جزء رفع الیدین ص ۲۸)

ابو عثمان فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ قنوت میں رفع یدین کیا کرتے تھے ۔

۵ ــــ محمد قال اخبرنا ابو حنیفہ عن حماد عن ابراھیم ان القنوت فی الوتر واجب فی شھر رمضان وغیرہ قبل الرکوع ۔ واذا اردت ان تقنت فکبر واذا اردت ان ترکع فکبر ایضاً ۔

(کتاب الآثار ص ۵۹ ، کتاب الحجۃ ص ۲۰۰ ج ۱)

امام محمدؒ کتاب الآثار اور کتاب الحجۃ میں امام ابو حنیفہؒ سے وہ حمادؒ سے وہ حضرت ابراہیم نخعیؒ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ وتر میں قنوت واجب ہے ۔ رمضان مبارک میں بھی اور غیر رمضان میں بھی ، اور جب تم قنوت پڑھنا چاہو تو تکبیر کہو ۔ اور جب قنوت کے بعد رکوع کرنا چاہو تب بھی تکبیر کہو ۔

امام محمدؒ کتاب الآثار میں اس روایت کو نقل کر کے فرماتے ہیں ۔

قال محمد وبہ ناخذ ویرفع یدیہ فی التکبیرۃ الاولی قبل القنوت کما یرفع یدیہ فی افتتاح الصلوٰۃ ثم یضعھما ویدعو ۔ وھو قول ابی حنیفۃ رضی اللہ عنہ (ص ۵۹ ج ۱۲)

ہمارا عمل اسی کے مطابق ہے کہ قنوت سے پہلے کی تکبیر میں رفع یدین کرے جیسا کہ نماز کے شروع میں کیا جاتا ہے ۔ پھر ہاتھوں کو رکھ لے ۔ اور دعائے قنوت پڑھے یہی امام ابو حنیفہؒ کا قول ہے ۔

چوتھا مسئلہ : دعائے قنوت میں ہاتھ باندھنا :

قنوت وتر میں عقلاً تین صورتیں ممکن ہیں ۔ ایک یہ کہ قنوت کے دوران ہاتھ اٹھائے رکھیں جیسا دعا میں اٹھائے جاتے ہیں ، دوسری یہ کہ ہاتھوں کو چھوڑ دیا جائے جیسا کہ قومہ کی حالت میں ہوتا ہے ۔ تیسری یہ کہ رفع یدین کے بعد ہاتھوں کو دوبارہ باندھ لیا جائے ۔ جیسا کہ قیام کی حالت میں ہوتا ہے ۔ پہلی صورت احناف کے نزدیک پسندیدہ نہیں اس لئے کہ شریعت نے نماز میں جتنی دعائیں رکھی ہیں کہیں ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کا حکم نہیں فرمایا ۔

باوجودیکہ ہاتھ اٹھانا دعا کے آداب میں سے ہے۔ مگر عین نماز میں ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کا حکم نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اس کو بدعت فرماتے تھے۔

عن ابن عمر رضی اللہ عنہما قال ارأیتم قیامکم عند فراغ الامام من السورۃ۔ ھذا القنوت۔ واللہ انہ لبدعۃ۔ ما فعلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غیر شھر ثم ترکہ ــــ ارأیتم رفعکم فی الصلوٰۃ واللہ انہ لبدعۃ۔ ما زاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی ھذا قط۔ فرفع یدیہ حیال منکبیہ (رواہ الطبرانی فی الکبیر وفیہ شھر بن حوشب، ضعفہ احمد وابن معین وابو زرعۃ وابو حاتم والنسائی۔ ووثقہ ایوب وابن عدی۔ مجمع الزوائد ص ۱۳۷ ج ۲)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا۔ دیکھو! یہ جو تم نماز فجر میں امام کے سورۃ سے فارغ ہونے کے بعد قنوت کے لئے کھڑے ہو جاتے ہو، اللہ تعالیٰ کی قسم یہ بدعت ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ایک مہینہ سے زیادہ نہیں کیا پھر اسے ترک کر دیا ــــ اور دیکھو یہ جو تم نماز میں ہاتھ اٹھا کر قنوت پڑھتے ہو۔ اللہ کی قسم یہ بدعت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صرف کندھوں تک رفع یدین کرتے تھے۔

بظاہر اس کا مطلب یہی ہے کہ قنوت کے لئے رفع یدین تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے مگر نماز کے دوران اس طرح ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا جس طرح نماز سے باہر دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے جاتے ہیں یہ معمول نہیں تھا ــــ

رہی دوسری اور تیسری صورت، قنوت اگر رکوع سے پہلے پڑھی جائے جیسا کہ وتر میں پڑھی جاتی ہے تو قبل رکوع کی حالت چونکہ قیام کی حالت ہے۔ اور قیام میں ہاتھ باندھنا سنّت ہے اس لئے نماز وتر میں اس کو اختیار کیا جائے گا۔ اور قنوت نازلہ چونکہ رکوع کے بعد قومہ کی حالت میں پڑھی جاتی ہے اور قومہ میں ہاتھ باندھنا سنّت نہیں اس لئے قنوت نازلہ ہاتھ چھوڑ کر پڑھی جائے گی۔ یہ وجہ ہے کہ احناف کے نزدیک قنوت وتر معمول قیام کے مطابق ہاتھ باندھ کر پڑھی جاتی ہے۔

سوال نہم: نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ:

س: ۹ ـــــ نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ حدیث نبوی سے ثابت ہے یا کہ نہیں۔ اگر نہیں تو دلیل تحریر فرماویں جبکہ حدیث مبارک کا مفہوم ہے کہ سورہ فاتحہ کے بغیر کوئی نماز نہیں۔

ج ۹: یہاں چند امور قابل ذکر ہیں:۔

اوّل، نماز جنازہ کو نماز کہنا مجازاً ہے۔ کیونکہ اس میں نماز کے شرائط ستر عورۃ اور استقبال قبلہ وغیرہ کو ضروری قرار دیا گیا ہے، ورنہ اپنی اصل کے اعتبار سے نماز نہیں بلکہ ایک مخصوص طریقہ سے میت کے لئے دعا و استغفار ہے۔ حافظ ابن قیمؒ زاد المعاد میں لکھتے ہیں۔

ومقصود الصلوٰة على الجنازة هو الدعاء للميت. وكذالك حفظ عن النبي صلى الله عليه وسلم ونقل عنه مالم ينقل من قراءة الفاتحة والصلوٰة عليه صلى الله عليه وسلم (ص ۱۴۱ ج ۱)	نماز جنازہ سے مقصود میت کے لئے دعا کرنا ہے۔ اور اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جنازہ کی دعائیں اس کثرت کے ساتھ نقل کی گئیں ہیں کہ فاتحہ یا درود شریف کا پڑھنا اس طرح نقل نہیں کیا گیا۔

دوم، چونکہ نماز جنازہ اپنی اصل کے اعتبار سے دعا ہے۔ اور دعا کے آداب میں سے ہے کہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی جائے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف پڑھا جائے۔ اس لئے نماز جنازہ میں بھی یہی ترتیب رکھی گئی ہے کہ اس میں پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا ہوتی ہے۔ پھر درود شریف ہوتا ہے۔ اور پھر میت کے لئے دعا ہوتی ہے۔

سوم۔ کسی صحیح روایت سے یہ ثابت نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ پڑھنے کا حکم دیا ہو، حافظ ابن قیمؒ لکھتے ہیں۔

ويذكر عن النبي صلى الله عليه وسلم انه امر ان يقرأ على الجنازة بفاتحة الكتاب ولا يصح اسناده (ص ۱۴۱ ج ۱)	اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا جاتا ہے کہ آپؐ نے نماز جنازہ میں قرأت فاتحہ کا حکم فرمایا۔ مگر اسکی سند صحیح نہیں۔

چہارم، نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ پڑھنے کی سب سے صحیح حدیث وہ ہے جسے امام بخاریؒ نے باب

قرأت الفاتحة على الجنازة" صہ۲۸ ج ۱ ابن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے۔

عن طلحة بن عبد الله بن عوف قال صليت خلف ابن عباس على جنازة فقرأ فاتحة الكتاب وقال لتعلموا انها سنة.	طلحہ بن مصرف سے روایت ہے کہ میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اقتدا میں جنازہ کی نماز پڑھی۔ توانہوں نے بلند آواز سے سورۃ فاتحہ پڑھی۔ اور فرمایا کہ میں نے اس لئے کیا ہے تاکہ تم جان لو کہ یہ سنّت ہے۔

اور نسائی صہ۲۸۱ ج ۱ میں بسند صحیح اسی روایت میں یہ الفاظ ہیں۔

فقرأ فاتحة الكتاب وسورة وجهر حتى اسمعنا. فلما فرغ اخذت بيده فسألته فقال سنةٌ وحق۔	انہوں نے سورۃ فاتحہ اور ایک سورۃ ایسی بلند آواز سے پڑھی کہ ہمیں سنائی دی۔ پس جب وہ فارغ ہوئے تو میں نے انکا ہاتھ پکڑ کر ان سے سوال کیا۔ توانہوں نے فرمایا کہ یہ سنّت اور حق ہے۔

اس روایت میں ایک امر تو قابل غور یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سوال سورۃ فاتحہ پڑھنے کے بارے میں کیا گیا تھا۔ یا بلند آواز سے پڑھنے کے بارے میں؟ اگر بلند آواز سے پڑھنے کے بارے میں سوال تھا تو جواب میں سنت اور حق بھی جہر ہی کو فرمایا گیا ہوگا۔ مگر جہر (یعنی بلند آواز سے پڑھنا) عام علماء کے نزدیک سنت نہیں۔

اگر آپ یہ سوال سورۃ فاتحہ پڑھنے کے بارے میں تھا تو اس سوال سے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ عام طور پر عادت نماز جنازہ میں سورۃ فاتحہ پڑھنے کی نہیں تھی۔ چونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے خلافِ معمول کیا اس لئے ان سے سوال کیا گیا۔ اور جواب میں جو اس کو سنت فرمایا گیا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ سورۃ فاتحہ کا بنیت ثنا پڑھنا بھی جائز ہے۔ اور یہ بعینہٖ حنفیہ کا مذہب ہے۔

دوسرا امر یہ بھی قابل غور ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے صرف سورۃ فاتحہ نہیں پڑھی بلکہ اس کے ساتھ ایک اور سورۃ بھی پڑھی ہے مگر نماز جنازہ میں سورۃ فاتحہ کے ساتھ کوئی اور سورۃ پڑھنے کا کوئی بھی قائل نہیں۔

اگر اس حدیث سے حنفیہ پر ترک سنت کا الزام عائد کیا جائے تو یہی الزام اسی حدیث سے دوسروں پر عائد ہوگا ۔۔۔۔ حالانکہ یہ حدیث حنفیہ کے خلاف نہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک حمد و ثنا کے طور پر سورۂ فاتحہ اور دیگر ایسی آیات جو حمد و ثنا پر مشتمل ہوں پڑھنا جائز ہے۔

پنجم :۔ یہ غلط ہے کہ حنفیہ سورۂ فاتحہ کے قائل نہیں ان کا موقف یہ ہے کہ چونکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے بعض حضرات سورۂ فاتحہ پڑھتے تھے۔ اور بعض نہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ فرض و واجب نہیں، البتہ حق تعالیٰ شانہٗ کی حمد و ثنا کے طور پر سورۂ فاتحہ پڑھ لینا بھی درست ہے۔ مگر جس طرح نماز میں قرأت ہوا کرتی ہے نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ یا کوئی اور سورۃ قرأت کی نیت سے نہیں پڑھی جاتی۔ اس لئے کوئی روایت بھی حنفیہ کے خلاف نہیں۔ چنانچہ امام محمدؒ نے مؤطا میں یہ روایت نقل کی ہے۔

اخبرنا مالک حدثنا سعید المقبری عن ابیہ انہ سأل اباھریرۃ رضی اللہ عنہ کیف یصلی علی الجنازۃ فقال انا لعمر اللہ اخبرک اتبعھا من اھلھا فاذا وضعت کبرت فحمدت اللہ وصلیت علی نبیہ صلی اللہ علیہ وسلم ثم قلت اللھم الخ (مؤطا امام مالکؒ)	امام مالکؒ سعید مقبری سے اور وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ جنازہ کی نماز کیسے پڑھی جاتی ہے۔ انہوں نے فرمایا، بخدا! میں تمہیں اس کی خبر دوں گا۔ میں جنازہ کے گھر سے اس کے ساتھ ہو لیتا ہوں جب جنازہ نماز کے لئے رکھا جائے تو میں تکبیر کہہ کر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرتا ہوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف پڑھتا ہوں۔ پھر یہ دعا پڑھتا ہوں۔
قال محمد وبھذا ناخذ۔ لا قرأۃ علی الجنازۃ وھو قول ابی حنیفۃ رحمہ اللہ۔	امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ہمارا اس پر عمل ہے۔ جنازہ میں قرأت نہیں۔ اور یہی امام ابوحنیفہؒ

(مؤطا امام محمد ص۱۶۸)

کا قول ہے۔

مدونہ کبریٰ ص۱۵۹ ج۱ میں ہے۔

قلت لابن القاسم ای شیٔ یقال علی المیت فی قول مالک۔ قال الدعاء للمیت۔ قلت۔ فهل یقرأ علی الجنازة فی قول مالک۔ قال لا۔

قال ابن وهب عن رجال من اهل العلم عن عمر بن الخطاب۔ وعلی بن ابی طالب۔ وعبد الله بن عمر وفضالة بن عبید وابی هریرة وجابر بن عبد الله وواثلة بن الاسقع والقاسم بن محمد وسالم بن عبد الله وابن المسیب وعطا بن ابی رباح ویحیی بن سعید انهم لم یکونوا یقرأون فی الصلاة علی المیت۔

قال ابن وهب وقال مالک لیس ذالك بمعمول به فی بلدنا۔ انما هو الدعاء۔ ادرکت اهل بلدنا علی ذالك۔

میں نے ابن قاسمؒ سے کہا امام مالکؒ کے قول میں میت پر کیا پڑھنا چاہیئے؟ فرمایا، میت کے لئے دعا، میں نے کہا کیا امام مالکؒ کے نزدیک نماز جنازہ میں قرأت ہوتی ہے؟ فرمایا، نہیں۔

ابن وہب کہتے ہیں کہ بہت سے اہل علم مثلاً (صحابہ کرامؓ میں سے) حضرت عمر بن خطاب۔ علی بن ابی طالب عبداللہ بن عمر۔ فضالہ بن عبید۔ ابوہریرہ۔ جابر بن عبداللہ اور واثلہ بن اسقع۔ اور تابعین میں سے) قاسم بن محمد، سالم بن عبداللہ۔ سعید بن مسیب۔ عطا بن ابی رباح۔ یحییٰ بن سعید (رضی اللہ عنہم) نماز جنازہ میں قرأت نہیں کیا کرتے تھے۔

ابن وہب کہتے ہیں کہ امام مالکؒ نے فرمایا ہمارے شہر میں اس پر عمل نہیں نماز جنازہ صرف دعا ہے۔ میں نے اپنے شہر کے اہل علم کو اسی پر پایا ہے۔

ششم ۔ "لا صلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب" سے نماز جنازہ میں سورۃ فاتحہ کے ضروری ہونے پر استدلال صحیح نہیں کیونکہ جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں ۔ نماز جنازہ حقیقۃً نماز ہی نہیں ۔ بلکہ دعا و استغفار ہے ۔
دہم فاتحہ خلف الامام کی بحث میں یہ ذکر کر چکا ہوں کہ صحیح احادیث میں سورۃ فاتحہ کے ساتھ مزید سورہ پڑھنے کو بھی احادیث میں ضروری قرار دیا گیا ہے ۔ جس کا نماز جنازہ میں کوئی بھی قائل نہیں ۔
خلاصہ یہ کہ ہمیں اس سے انکار نہیں کہ احادیث سے سورۃ فاتحہ کا پڑھنا بھی ثابت ہے ۔ مگر حمد و ثنا کے طور پر ہے ۔ قرأت کے طور پر نہیں ۔ اور اس کے ہم بھی قائل ہیں ۔

سوال دہم تکبیرات عیدین ؛

س ۱۰ :۔ عیدین کی نماز میں چھ تکبیریں زائد ہیں یا بارہ ؟ اگر دونوں ثابت ہیں تو راویوں کی کثرت کس طرف استدلال کرتی ہے ۔ اور یہ تکبیریں اول رکعت میں فاتحہ اور سورہ پڑھنے سے قبل یا بعد ہیں ؟ اسی طرح دوسری رکعت میں سورہ پڑھنے کے بعد ہیں یا قبل ؟

ج ۱۰ :۔ یہاں چند امور قابل ذکر ہیں ۔
اول :۔ امام مالکؒ ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک عیدین میں بارہ تکبیریں ہیں ۔ پہلی رکعت میں سات اور دوسری میں پانچ ۔ اور دونوں میں قرأت سے پہلے ۔ البتہ امام مالکؒ کے نزدیک پہلی رکعت میں سات تکبیریں تکبیر تحریمہ سمیت ہیں ۔ اور دوسرے حضرات کے نزدیک تکبیر تحریمہ سے زائد ۔ امام ابو حنیفہؒ ، امام سفیانؒ ثوری اور صاحبینؒ کے نزدیک دونوں رکعتوں میں تین تین تکبیریں زائد ہیں ۔ پہلی رکعت میں قرأت سے پہلے ۔ اور دوسری رکعت میں قرأت کے بعد ۔
دوم :۔ بارہ تکبیرات کی احادیث متعدد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مروی ہیں ۔ لیکن محدثین کی رائے یہ ہے کہ اس مسئلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی روایت بھی صحت کے ساتھ ثابت نہیں ۔
امام ترمذیؒ نے بارہ تکبیرات کی حدیث کثیر بن عبداللہ بن عمرو بن عوف عن ابیہ عن جدہٖ کی سند سے روایت کی ہے ۔

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کبّر — نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عیدین میں پہلی

فی العیدین فی الاولیٰ سبعاً قبل	رکعت میں سات تکبیریں قرأت سے پہلے
القرأۃ . و فی الثانیۃ خمساً قبل	اور دوسری میں پانچ تکبیریں قرأت سے
القرأۃ ۔	پہلے کہیں۔

امام ترمذیؒ اس کو نقل کر کے کہتے ہیں ۔

حدیث حسن و ھو احسن شیئ روی	یہ حدیث حسن ہے ۔ اور اس باب میں جتنی
فی ھذا الباب (ترمذی شریف ص ج ۱)	روایات مروی ہیں ان سب سے اچھی ہے ۔

یہ حدیث ، جو بقول امام ترمذیؒ اس باب کی روایات میں سب سے احسن ہے ۔ اس کا مدار کثیر بن عبداللہ پر ہے ۔ اور اس کے بارے میں محدثین کی آراء یہ ہیں ۔

امام احمدؒ فرماتے ہیں "لا یساوی شیئاً" (یہ کسی چیز کے برابر نہیں) ابن معینؒ فرماتے ہیں "حدیثہ لیس بشیئ" (اس کی حدیث کوئی چیز نہیں) امام النسائیؒ اور دارقطنیؒ فرماتے ہیں "متروک الحدیث" امام ابوزرعہؒ فرماتے ہیں "واہ الحدیث" امام شافعیؒ فرماتے ہیں "رکن من ارکان الکذب" (جھوٹ کے ستونوں میں سے ایک ستون ہے) امام ابن حبانؒ فرماتے ہیں ۔

روی عن ابیہ عن جدہ	اس نے اپنے باپ دادے کی سند سے ایک موضوع
نسخۃ موضوعۃ لا یحل ذکرھا	اور منگھڑت نسخہ روایت کیا ہے جس کا ذکر
فی الکتب الا علی سبیل التعجب ۔	کرنا بھی جائز نہیں ۔ الا یہ کہ اظہار تعجب کے
(نصب الرایہ ص ۲۱۷ ج ۲)	طور پر ہو ۔

جب اس روایت کا جو "احسن شیئ فی ھذا الباب" سمجھی گئی ہے ، یہ حال ہے تو انصاف کیا جائے کہ باقی روایات کا کیا حال ہو گا ۔ امام ترمذیؒ نے اس حدیث کی جو تحسین کی ہے محدثین اس سے بھی متفق نہیں شاید اس سے بہتر عبداللہ بن عبدالرحمٰن الطائفی کی روایت ہے ۔ (عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ) جسے امام ابوداؤدؒ نے روایت کیا ہے (ص ۱٦۳) اگرچہ اس میں بھی متعدد وجوہ سے کلام ہے ۔

سوم :۔ دونوں رکعتوں میں تین تکبیرات کی احادیث اگرچہ تعداد میں کم تر ہیں ۔ لیکن شاید قوت و ثقاہت اور تعامل صحابہؓ میں اول الذکر روایات سے فائق ہیں چنانچہ ۔

۱ ـــــ امام طحاویؒ نے ابوعبدالرحمٰن قاسم کی روایت نقل کی ہے ۔

حدثنی بعض اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، قال صلی بنا النبی صلی اللہ علیہ وسلم یوم عید ۔ فکبر اربعاً اربعاً ثم اقبل علینا بوجہہ حین انصرف فقال لاتنسوا کتکبیر الجنازۃ واشار باصبعہ وقبض ابھامہ (ص ۲/۳۴۴)	مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض صحابہ نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کی نماز پڑھائی تو چار چار تکبیریں کہیں، نماز سے فارغ ہو کر ہماری طرف متوجہ ہو کر فرمایا بھول نہ جانا عید کی تکبیریں جنازہ کی طرح چار ہیں ۔ ہاتھ کی انگلیوں سے اشارہ فرمایا اور انگوٹھا بند کر لیا ۔

امام طحاوی اس حدیث کو روایت کرنے کے بعد فرماتے ہیں :

ھذا حدیث حسن الاسناد، وعبد اللہ بن یوسف ویحیی بن حمزۃ والوضین بن عطا والقاسم کلھم اھل روایۃ ۔ معروفون بصحۃ الروایۃ ۔	اس حدیث کی سند حسن ہے ۔ اس کے تمام راوی عبداللہ بن یوسف یحیی بن حمزہ وضین بن عطاء اور قاسم سب کے سب اہل روایت ہیں ۔ اور صحت روایت کے ساتھ معروف ہیں ۔

اس کے تمام راوی معروف ہیں وضین بن عطاء کو بعض حضرات نے کمزور کہا ہے مگر اکثر حضرات نے ثقہ کہا ہے ۔ اور حافظؒ نے فتح الباری ص ۲/۴۱۴ میں مسئلہ وتر میں اس کی ایک روایت کو "نا دقوی" کہا ہے ۔ اس لئے اس کی سند جیسا کہ امام طحاویؒ نے فرمایا حسن ہے ۔

۲ ـــــ عن عبدالرحمٰن بن ثابت بن ثوبان عن ابیہ عن مکحول قال اخبرنی ابوعائشہ جلیس لابی ھریرۃ ان سعید بن العاص سأل اباموسیٰ الاشعری وحذیفۃ	عبدالرحمٰن ابن ثابت ابن ثوبان اپنے والد ثابت بن ثوبان سے روایت کرتے ہیں، وہ مکحول سے، انہوں نے کہا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے ہمنشین ابوعائشہ نے مجھے بتایا کہ حضرت سعید بن عاص رضی اللہ

بن الیمان، کیف کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یکبر فی الاضحی والفطر. فقال ابو موسی کان یکبر اربعاً تکبیرہ علی الجنازۃ فقال حذیفۃ صدق. فقال ابو موسی کذالک کنت اکبر فی البصرۃ حیث کنت علیھم قال ابو عائشۃ وانا حاضر سعید بن العاص (ابوداؤد ص۱۶۳ ج۱، طحاوی ص۳۰۰ ج۲، مسند احمد ص۴۱۶ ج۴)

عنہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری اور حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہما سے دریافت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عید میں کتنی تکبیریں کہا کرتے تھے۔ ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا چار چار تکبیریں کہا کرتے تھے جیسا کہ جنازہ پر تکبیریں کہتے تھے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ٹھیک کہتے ہیں۔ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے فرمایا، کہ جب میں بصرہ کا حاکم تھا تو اسی طرح تکبیریں کہا کرتا تھا۔ ابوعائشہ کہتے ہیں کہ میں سعید بن عاص کے سوال کے وقت خود موجود تھا۔

حافظؒ نے تقریب میں عبدالرحمٰن بن ثابت ابن ثوبان کو "صدوق یخطئ ورمی بالقدر" اور ابو عائشہ کو "مقبول" لکھا ہے اور سعید بن عاص رضی اللہ عنہ کے سوال کا قصہ امام طحاویؒ نے ایک اور سند سے اس طرح نقل کیا ہے۔

عن مکحول قال حدثنی رسول حذیفۃ وابی موسی رضی اللہ عنہما ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یکبر فی العیدین اربعاً اربعاً سوی تکبیرۃ الافتتاح (ص۳۰۰ ج۲)

مکحولؒ کہتے ہیں کہ مجھے حضرت حذیفہ اور حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہما کے قاصد نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عیدین میں (بشمول تکبیر رکوع کے) چار چار تکبیریں کہا کرتے تھے۔ سوائے تکبیر تحریمہ کے۔

چہارم:۔ دراصل اس باب میں ائمہ اجتہاد کا اعتماد مرفوع احادیث کے بجائے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے تعامل پر ہے، جیسا کہ ابن رشدؒ نے بدایۃ المجتہد ص۲۱۷ ج۱ میں لکھا ہے، چنانچہ امام مالک مؤطا ص۶۳ میں حضرت ابوہریرہؓ کے عمل سے سات اور پانچ کی روایت نقل کرکے فرماتے ہیں "وھو الامر عندنا"

(ہمارے ہاں اسی پر عمل ہے)

اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا عمل بھی اس باب میں مختلف ہے۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا عمل مؤطا کے حوالہ سے ابھی گذرا۔ اور حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس سلسلہ میں مختلف روایات مروی ہیں۔

ان سے ایک روایت یہ ہے کہ وہ دونوں رکعتوں میں قرأت سے پہلے بارہ تکبیریں کہا کرتے تھے پہلی میں سات اور دوسری میں پانچ ۔۔۔ چونکہ اس روایت کو خلفائے بنو عباس نے معمول بہا بنایا۔ اس لئے اس کو زیادہ شہرت ہوئی۔ اور امام شافعیؒ و امام احمدؒ نے اسی روایت کو لیا۔

ان سے دوسری روایت حنفیہ کے مطابق ہے (طحاوی ص ج ، عبد الرزاق ص ۲۹۶ ج ۳)

تیسری روایت یہ ہے کہ وہ تیرہ تکبیریں کہتے تھے۔ پہلی میں سات قرأت سے پہلے۔ اور دوسری میں چھ قرأت کے بعد۔ (طحاوی ص ۴۰۱ ج ۱)

چوتھی روایت یہ ہے کہ انہوں نے فرمایا جو چاہے سات تکبیریں کہے، اور جو چاہے نو، گیارہ یا تیرہ تکبیریں کہے (طحاوی ص ۴۰۱ ج ۱) حنفیہ کا عمل حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث پر ہے۔ چنانچہ ان سے مختلف طرق اسانید سے مروی ہے۔ کہ تکبیر تحریمہ کے بعد تین تکبیریں کہے۔ پھر قرأت کرے۔ اور دوسری رکعت میں قرأت کے بعد تین تکبیریں کہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی احادیث نصب الرایہ ص ۲۱۳ ج ۲، ص ۲۱۱ ج ۲، عبد الرزاق ص ۲۹۳ ج ۳، طحاوی ص ۴۰۱ ج ۲، کتاب الحجۃ علی اہل المدینہ ص ۳۰۲ ج ۱، کتاب الآثار ص ۵۳، مجمع الزوائد ص ۲۰۵ ج ۲، تفسیر ابن کثیر ص ۵۱۲ ج ۲ میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

متعدد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم سے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی تصدیق و تصویب یا موافقت منقول ہے چنانچہ:

۱ ــــ امام طحاویؒ نے "باب التکبیر علی الجنائز" میں حضرت ابراہیم نخعیؒ کی روایت سے ایک طویل حدیث نقل کی ہے۔ کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا تکبیرات جنازہ میں اختلاف تھا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں کسی ایک صورت پر متفق کرنے کے لئے مشورہ فرمایا۔

فاجمعوا امرھم علی ان یجعلوا ۔۔۔ پس ان سب کا اس پر اتفاق ہوا کہ جنازہ کی

التکبیر علی الجنائز مثل التکبیر فی الاضحیٰ والفطر اربع تکبیرات۔ (طحاوی ص۲۲۹ ج۱)

تکبیریں اتنی ہوں جتنی عیدین کی نماز میں ہیں یعنی چار۔

عیدین کی پہلی رکعت میں تکبیر تحریمہ کے ساتھ اور دوسری رکعت میں تکبیر رکوع کے ساتھ چار تکبیریں ہوتی ہیں ــــ اس روایت سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ان کے اہل مشورہ کا عیدین کی تکبیروں پہ اتفاق ثابت ہوتا ہے۔

۲ ــــ عن عامر ان عمر و عبداللہ رضی اللہ عنہما اجتمع رأیہما فی تکبیرات العیدین علی تسع تکبیرات، خمس فی الاول واربع فی الاخرۃ ویوال بین القراءتین۔ (طحاوی ص۴۰۰ ج۲)

عامر شعبی سے روایت ہے کہ حضرت عمر اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کی رائے اس پر متفق ہوئی کہ عیدین کی تکبیرات نو ہیں۔ پانچ پہلی رکعت میں اور چار دوسری میں۔ اور دونوں رکعتوں میں قرأت پے در پے ہو۔

پہلی میں بشمول تکبیر تحریمہ اور تکبیر رکوع کے پانچ اور دوسری میں بشمول تکبیر رکوع کے چار اور قرأت کے پے در پے ہونے کا مطلب یہ کہ پہلی رکعت میں قرأت سے پہلے تکبیریں کہی جائیں۔ اور دوسری میں قرأت کے بعد۔

۳ ــــ طحاوی شریف ص۴۰۰ ج۲، عبدالرزاق ص۲۹۳ ج۳، کتاب الحجۃ امام محمد ص۳۰۳ ج۱، مجمع الزوائد ص۲۰۵ ج۲، تفسیر ابن کثیر ص۵۱۳ ج۳ میں حضرت حذیفہ بن الیمان اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے فتویٰ کی تصدیق فرمانا صحیح اسانید سے منقول ہے۔

۴ ــــ اور عبدالرزاق ص۲۹۳ میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے بھی اس کے موافق منقول ہے۔

۵ ــــ اور عبدالرزاق ص۲۹۵ ج۳ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے بھی یہی منقول ہے۔

۶ ــــ ابن ابی شیبہ میں حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے بھی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی

تصدیق منقول ہے۔

۷ــــ طحاوی (صـ۲۰۱ جـ۱) ــــــــــــــــ نے حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہما کا بھی یہی عمل نقل کیا ہے۔

۸ــــ امام طحاوی (صـ۲۰۱ جـ۱) نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے بھی یہی نقل کیا ہے۔

۹ــــ اس کے موافق حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا عمل پہلے گذر چکا ہے۔

یعنی ــــ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا تعامل دونوں طرح ہے اس لئے ہمارے نزدیک دونوں صورتیں جائز اور حسن ہیں لیکن ہر رکعت میں تین تین تکبیروں کی صورت احسن اور راجح ہے۔ امام محمدؒ موطا میں فرماتے ہیں۔

قد اختلف الناس فی التکبیر فی العیدین فما اخذت به فهو حسنٌ۔ وافضل ذالک عندنا ما روی عن ابن مسعود رضی الله عنه انه کان یکبّر فی کل عید تسعاً خمساً واربعاً، فیهن تکبیر الافتتاح وتکبیرتا الرکوع، ویوالی بین القرائتین۔ ویؤخرها فی الاولیٰ۔ ویقدمها فی الثانیه۔ وهو قول ابی حنیفة رحمه الله (صـ۱۴۱)	تکبیرات عیدین میں لوگوں کا اختلاف ہے جس صورت پر بھی عمل کر لو بہتر ہے۔ اور ہمارے نزدیک افضل صورت وہ ہے جو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ وہ ہر عید میں نو تکبیریں کہتے تھے۔ پہلی میں بشمول تکبیر تحریمہ اور تکبیر رکوع کے پانچ۔ اور دوسری میں بشمول تکبیر رکوع کے چار۔ اور دونوں رکعتوں کی قرأت میں موالات کرتے تھے۔ پہلی رکعت میں تکبیروں کے بعد قرأت کرتے تھے۔ اور دوسری میں تکبیروں سے پہلے۔ یہی امام ابوحنیفہؒ کا قول ہے۔

اور ہر رکعت میں تین تکبیرات کے ــــ افضل اور راجح ہونے کے دلائل حسب ذیل ہیں۔

ــــ حدیث نمبر۱ میں گذر چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چار چار تکبیر (بشمول تکبیر رکوع)

کہیں اور نماز سے فارغ ہو کر فرمایا بھول نہ جانا. چار چار تکبیریں ہیں. نماز جنازہ کی طرح، اور آپ نے انگلیوں سے اشارہ فرمایا، پس یہ عمل، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل، اشارہ و استدلال اور تاکید سے ثابت ہے.

۲۔۔۔ پہلے گذر چکا ہے کہ تین تین تکبیرات کی احادیث صحت و قوت میں فائق ہیں۔

۳۔۔۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور اکابر صحابہ رضوان اللہ علیہم کا اس پر تعامل رہا ہے. جب کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا تعامل مختلف رہا ہے. کبھی بارہ پر کبھی چھ پر۔۔۔

۴۔۔۔ یہ تو ظاہر ہے کہ عیدین کی زائد تکبیر عام نمازوں کے طرز کے خلاف مشروع کی گئی اور یہ بھی ظاہر ہے کہ چھ تکبیروں پر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا اتفاق ہے اور زائد میں اختلاف ہے. متیقن اور متفق علیہ کو لے لینا اور مختلف فیہ کو ترک کر دینا اولیٰ ہوگا۔ واللہ اعلم ۔

سوال یازدہم : سنّت فجر :

س ۱۱ ! نماز کے لئے اقامت ہو چکی ہو تو قریب کوئی نماز نہیں ہوتی ہے. پھر کیوں لوگ فجر کی سنت اس وقت پڑھنے لگتے ہیں. جب کہ فرض نماز شروع ہو رہی ہے. حدیث نبوی کی رو سے نماز نہیں ہوتی ؟ رہا یہ کہ مسجد کے کسی گوشے میں پڑھ لینا تو کیا امام کی قرأت کی آواز کانوں سے نہیں ٹکراتی ؟

ج ۱۱ اس مسئلہ میں دو جہتیں متعارض ہیں، جن کی وجہ سے کسی ایک جانب کے اختیار کرنے میں اشکال پیدا ہوتا ہے ۔ ایک یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد احادیث میں فجر کی پہلی سنتوں کی بہت ہی تاکید فرمائی ہے یہی وجہ ہے کہ فرض اور وتر نماز کے بعد باجماع امت سب سے زیادہ مؤکد ہے ۔ دوم یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز جماعت میں شرکت کی بھی بہت تاکید فرمائی اب جو شخص ایسے وقت آئے کہ نماز کھڑی ہو چکی ہو، اور اس نے سنت فجر نہ پڑھی ہو، اگر وہ سنت کو ترک کرتا ہے تو ان احادیث کی مخالفت لازم آتی ہے جو سنتِ فجر کی تاکید میں وارد ہوئی ہیں. سنتِ فجر کے ادا کرنے میں مشغول ہوتا ہے تو شرکت جماعت کی تاکید سے متعلقہ احادیث کی مخالفت آتی ہے. ائمہ احناف نے ان دونوں تاکیدوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اگر اس شخص کو

کی ایک رکعت مل جانے کا اطمینان ہو تب بھی دونوں فضیلتوں کو جمع کرے۔ پہلے مسجد کے دروازے پر سنتیں ادا کرے۔ اور پھر جماعت میں شریک ہو جائے۔ اور اگر خیال ہو کہ سنتوں میں مشغول ہوا تو جماعت کی دونوں رکعتیں نکل جائیں گی تو جماعت میں شریک ہو جائے اور سنتیں طلوع آفتاب کے بعد پڑھے۔ کیونکہ نماز فجر کے بعد نفل پڑھنے کی احادیث متواترہ میں ممانعت آئی ہے۔ سلف کا عمل بھی اس بارے میں مختلف رہا۔ حنفیہ کی تائید میں مندرجہ ذیل آثار ہیں۔

۱۔ ـــــ عن عبد الله بن ابی موسیٰ قال جاءنا ابن مسعود والامام يصلى الفجر، فصلى ركعتين الى سارية۔ ولم يكن صلى ركعتي الفجر۔

(عبد الرزاق ص ۴۴۴ ج ۲)

عبداللہ بن ابو موسیٰ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما ہمارے پاس آئے جب کہ امام نماز پڑھا رہا تھا پس انہوں نے ستون کی اوٹ میں دو رکعتیں پڑھیں۔ انہوں نے فجر کی سنتیں نہیں پڑھی تھیں۔

۲ ـــــ عن حارثة بن مضرب ان ابن مسعود وابا موسیٰ خرجا من عند سعيد بن العاص، فاقيمت الصلوٰة فركع عبد الله ركعتين، ثم دخل مع القوم في الصلوٰة واما ابو موسیٰ فدخل في الصف۔

(ابن ابی شیبہ ص ۲۵۱ ج ۲)

حارثہ بن مضربؒ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت ابو موسیٰ اشعری، حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہم کے پاس سے نکلے، اتنے میں جماعت کھڑی ہو گئی۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے دو رکعتیں پڑھیں پھر جماعت میں شریک ہوئے۔ اور حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ آتے ہی صف میں داخل ہو گئے۔

۳ ـــــ عن ابی الدرداء رضی الله عنه انه كان يقول، نعم

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے، کہ ہاں! اللہ کی

الصلوٰۃ لا عمدن الی ساریۃ من سواری المسجد ثم لارکعنهما ثم لا کملنهما ثم لا اعجل[1] عن اکمالهما ثم امشی الی الناس فاصلی مع الناس الصبح۔ (عبد الرزاق ص۴۴۳ ج۲)

ہوں جب کہ لوگ جماعت میں ہوں تو میں مسجد کے ستونوں میں سے کسی ستون کے پیچھے جاکر سنت فجر کی دو رکعتیں ادا کروں گا۔ اور ان کو کامل طریقہ سے ادا کروں گا۔ اور ان کو کامل کرنے میں جلد بازی سے کام نہیں لوں گا۔ پھر جاکر لوگوں کے ساتھ نماز میں شریک ہوں گا۔

۴ ــــ عن ابی الدرداء قال انی لاجئی الی القوم وهم صفوف فی صلوٰۃ الفجر فاصلی الرکعتین ثم انضم الیهم۔ (ابن ابی شیبہ ص۲۵۱ ج۲)

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ میں لوگوں کے پاس جاتا ہوں جب کہ وہ نماز فجر میں صفیں باندھے کھڑے ہوں تو میں پہلے سنت فجر کی دو رکعتیں پڑھتا ہوں۔ پھر جماعت میں شریک ہوتا ہوں۔

۵ ــــ عن ابن عمر رضی اللہ عنهما انہ کان یدخل فی الصلوٰۃ تارۃ واخری یصلیها فی جانب المسجد۔ (ابن ابی شیبہ ص۲۵۱ ج۲)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کبھی آتے ہی جماعت میں داخل ہوجاتے۔ اور کبھی مسجد کے ایک گوشے میں سنتیں پڑھ لیتے۔

۶ ــــ عن الشعبی عن مسروق انہ دخل المسجد والقوم فی صلاۃ الغداۃ ولم یکن صلی الرکعتین فصلاهما

امام شعبیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت مسروقؒ مسجد میں داخل ہوئے جب کہ لوگ صبح کی نماز میں تھے۔ انہوں نے فجر کی سنتیں نہیں پڑھی تھیں

---

[1] یہاں دو نسخے ہیں۔ ایک "لا اعجل" اور دوسرا "لا اعجل"، میرے خیال میں یہی راجح ہے۔ گو پہلے نسخہ کے

فی ناحیۃ ثم دخل مع القوم فی صلاتھم (ابن ابی شیبۃ صفحہ ۲۵۴ ج ۲ واللفظ لہٗ۔ عبد الرزاق صفحہ ۴۴۳ ج ۲)

پس ایک گوشے میں سنتیں پڑھیں پھر جماعت میں شریک ہوئے۔

۷ ـــــ عن الحسن قال اذا دخلت المسجد والامام فی الصلوٰۃ ولم تکن رکعت رکعتی الفجر، فصلھما ثم ادخل مع الامام (عبد الرزاق صفحہ ۴۴۵ ج ۲)

حضرت حسن بصریؒ کا ارشاد ہے کہ جب تم مسجد میں ایسے وقت میں داخل ہو کہ امام نماز میں ہو۔ اور تم نے فجر کی سنتیں نہ پڑھی ہوں تو پہلے سنتیں پڑھو پھر امام کے ساتھ شریک ہو۔

۸ عن نافع عن ابن عمر رضی اللہ عنھما دخل فی المسجد والقوم فی الصلوٰۃ ولم یکن صلی رکعتی الفجر۔ فدخل مع القوم فی صلوٰتھم حتیٰ اذا اشرقت لہٗ الشمس قضاھا۔ قال وکان اذا اقیمت الصلوٰۃ وھو فی الطریق صلاھما فی الطریق (عبد الرزاق صفحہ ۴۴۳ ج ۲)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ مسجد میں داخل ہوئے جب کہ نماز کھڑی ہو چکی تھی۔ اور انہوں نے سنت فجر نہیں پڑھی تھیں پس وہ جماعت میں شریک ہو گئے۔ یہاں تک کہ سورج خوب نکل آیا۔ تو سنتیں قضا کیں۔ نافعؒ کہتے ہیں کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کا معمول تھا کہ اگر راستہ میں اقامت ہو جاتی تو وہ راستہ ہی میں سنتیں پڑھ لیتے۔

ان آثار سے معلوم ہوا کہ ائمہ احناف نے وہی مسلک اختیار کیا ہے۔ جس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں صحابہ کرامؓ کا عمل تھا۔ اور جسے فقیہ الامت حضرت عبد اللہ بن مسعود، حکیم الامت حضرت ابو درداءؓ اور شیخ المدینہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہم نے اختیار کیا۔ ظاہر ہے کہ یہ حضرات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے بے خبر نہیں تھے۔

سوال دوازدھم : تاخیر واجب پر سجدۂ سہو :-

س ۱۲: احناف کے نزدیک نماز کے دوران سورۃ فاتحہ اور دوسری سورۃ کے درمیان اتنا وقفہ ہو

جائے کہ تین مرتبہ سبحان اللہ کہا جاسکے تو سجدہ سہو لازم آجاتا ہے۔ اس کی کیا دلیل ہے؟

ج ۱۲: اس ضمن میں چند امور قابل توجہ ہیں:

اوّل: سجدۂ سہو کی بحث میں اس طرف اشارہ کرچکا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے چند موقعوں پر سجدۂ سہو ثابت ہے۔ مثلاً

۱ —— آپ پانچویں رکعت کے لئے کھڑے ہوگئے۔ اور سجدہ سہو کیا۔

۲ —— دو رکعت پر قعدہ کئے بغیر کھڑے ہوگئے۔ اور سجدۂ سہو کیا۔

۳ —— دو رکعت پر سلام پھیر دیا اور سجدۂ سہو کیا۔

۴ —— تین رکعتوں پر سلام پھیر دیا اور سجدۂ سہو کیا۔

۵ —— شک کی صورت میں غلبۂ ظن پر عمل کرکے سجدۂ سہو کرنے کا حکم فرمایا۔

یہ دو چار صورتیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سجدۂ سہو کی منقول ہیں، سوال یہ ہے کہ آیا سجدۂ سہو کا حکم صرف انہیں صورتوں میں ہے؟ یا ان کے علاوہ بھی سجدۂ سہو کسی صورت میں لازم آتا ہے —— سجدۂ سہو کی بحث میں اس طرف بھی اشارہ کرچکا ہوں کہ ائمہ اربعہ اور جمہور اُمت کے نزدیک سجدۂ سہو کا حکم صرف انہیں صورتوں کے ساتھ خاص نہیں۔ بلکہ جہاں بھی سجدۂ سہو کی موجب کوئی چیز پائی جائے گی وہاں سجدۂ سہو واجب ہوگا۔ کسی کے نزدیک سلام سے پہلے۔ اور کسی کے نزدیک بعد۔

دوم: جب یہ بات طے ہوئی کہ سجدۂ سہو اور صورتوں میں بھی واجب ہے۔ تو اب یہ سوال ہوگا کہ سجدۂ سہو کا اصول کیا ہے۔ کن چیزوں کے ترک سے سجدۂ سہو لازم ہوگا۔ اور کن چیزوں کے ترک سے نہیں؟ یہاں مجھے دوسرے آئمہ اجتہاد کے اصول سے بحث نہیں۔ صرف ائمہ احناف کے اصول کی وضاحت پر اکتفا کروں گا۔

ائمہ احناف نے تکبیر تحریمہ سے لے کر سلام تک نماز کے تمام افعال پر غور کرکے ان کے چار درجے مقرر کئے۔ بعض افعال کو "فرض" قرار دیا، جن کے فوت ہونے سے نماز فاسد ہوجاتی ہے۔ اور بغیر اعادہ کے اس کی تلافی نہیں ہوسکتی جیسے قیام، قرأت، رکوع و سجود، آخری قعدہ وغیرہ —— بعض چیزوں کو "واجب" قرار دیا یہ اگر سہواً فوت ہوجائیں تو سجدہ سہو سے انکی تلافی ہوجاتی ہے۔ اور بعض امور کو سنت قرار دیا۔

جس کے ترک کر دینے سے نماز خلاف سنت ہوگی۔ اس سے سجدہ سہو لازم نہیں آئے گا۔ بعض امور کو "مستحب اور مندوب" قرار دیا کہ ان کا کرنا موجب ثواب ہے۔ مگر ترک موجب عتاب نہیں۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا ہوگا کہ ائمہ احناف کے نزدیک سجدہ سہو کا اصول ترک واجب ہے۔ اور نماز کے ارکان و واجبات میں موالات بھی واجب ہے۔ اس لئے اس کے ترک سے سجدۂ سہو واجب ہوگا۔

سوم: اوپر احادیث طیبہ میں سجدہ سہو کی جو صورتیں مذکور ہوئی ہیں ان پر غور کرو تو ان میں یہی اصول کار فرما نظر آئے گا۔ چنانچہ قعدۂ اولیٰ کے ترک کی صورت میں سجدۂ سہو فرمایا۔ کیونکہ قعدۂ اولیٰ واجب تھا۔ چار رکعتوں کے بعد پانچویں رکعت کے لئے کھڑے ہوگئے تو سلام میں تاخیر ہوگئی۔ اور موالات، جو واجب تھی، فوت ہوگئی، اس لئے سجدۂ سہو واجب ہوا۔ اسی طرح دو رکعت یا تین رکعت پر سلام پھیر دینے کی صورت میں بقیہ ارکان کی ادائیگی میں تاخیر ہوگئی۔ اور ارکان کے درمیان موالات نہ رہی۔ اس لئے سجدۂ سہو واجب ہوا۔ شک کی صورت میں اس احتمال پر کہ شاید ایک رکعت زیادہ پڑھی گئی ہو۔ اور فراغ عن الصلوٰۃ میں تاخیر ہوگئی ہو، سجدۂ سہو واجب ہوا۔

پس احادیث طیبہ ہی سے یہ اصول منقح ہوگیا کہ ترک واجب یا تاخیر رکن یا تاخیر واجب سے سجدہ سہو واجب ہوجاتا ہے۔

چہارم: اب صرف ایک سوال باقی رہا کہ تاخیر کا معیار کیا ہے جس سے موالات فوت ہوجاتی ہے۔ اور سجدۂ سہو واجب ہوجاتا ہے۔ ائمہ احناف نے اس پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ رکوع و سجدہ نسبتاً مختصر رکن ہیں جن میں تین مرتبہ تسبیح پڑھی جاتی ہے۔ پس ادنیٰ رکن کی ادائیگی کے بقدر اگر کسی رکن یا واجب کے ادا کرنے میں تاخیر ہوجائے تو سجدۂ سہو واجب ہوجاتا ہے۔ اور وہ ہے تین تسبیح کی مقدار۔

یہ مقدمات اگر ذہن نشین ہوگئے تو آپ کے سوال کا جواب واضح ہوجائے گا۔ چونکہ سورۂ فاتحہ کے بعد سورۃ کا پڑھنا نماز میں واجب ہے۔ اور تین تسبیح کی مقدار اس میں تاخیر سے موالات فوت ہوجاتی ہے۔ اس لئے ائمہ احناف اس پر سجدۂ سہو کا حکم کرتے ہیں۔ اور جیسا کہ اوپر عرض کرچکا ہوں یہ اصول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث طیبہ ہی سے لیا گیا ہے۔

سوال سیزدھم : ران ستر ہے :

س ۱۳ : مرد کے لئے ستر عورت ناف سے گھٹنے تک بتلایا جاتا ہے اس کے لئے کن احادیث سے استدلال کیا گیا ہے جبکہ بخاری میں حضرت انسؓ نے روایت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (جنگ خیبر میں) اپنی ران کھولی۔ زید بن ثابت نے کہا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر پر (قرآن) اتارا اور آپ کی ران میری ران پر تھی۔ وہ اتنی بھاری ہوگئی میں ڈرا کہیں میری ران ٹوٹ جاتی ہے۔ امام بخاریؒ نے استدلال کیا اگر ران عورت ہوتی تو آپؐ زیدؓ کی ران پر اپنی ران نہ رکھتے۔ بخاری شریف میں انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر پر جہاد کیا۔ ہم لوگوں نے صبح کی نماز اندھیرے میں خیبر کے قریب پہنچ کر پڑھی پھر آنحضرتؐ سوار ہوئے اور میں ابو طلحہؓ کے پیچھے ایک ہی سواری پر بیٹھا تھا۔ آنحضرتؐ نے خیبر کی گلیوں میں اپنا جانور دوڑایا اور (دوڑنے میں) میرا گھٹنا آنحضرتؐ کی ران سے چھو جاتا تھا۔ پھر آپ نے اپنی ران سے تہبند ہٹادی (ران کھول دی) یہاں تک کہ آپ کی سفیدی (اور چمک) دیکھنے لگا۔

ج ۱۳ : یہاں چند امور قابل ذکر ہیں۔

اوّل : بہت سی احادیث سے ثابت ہے کہ ران ستر میں داخل ہے۔

۱۔ عن عبد الله بن عمرو بن العاص رضی الله عنہما قال قال رسول الله صلی الله علیہ وسلم اذا زوج احدکم امتہ عبدہٗ او اجیرہٗ۔ فلا ینظر الی مادون السرۃ وفوق الرکبۃ، فان ماتحت السرۃ الی الرکبۃ عورۃ۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کوئی اپنی لونڈی کا نکاح اپنے غلام یا نوکر سے کر دے تو ناف سے نیچے اور گھٹنے سے اوپر کے حصہ کو نہ دیکھے۔ کیونکہ ناف کے نیچے سے گھٹنے تک کا حصہ ستر ہے۔

(دارقطنی ص ۸۵ ج ۱، واللفظ لہٗ۔ وابوداؤد ص ۱۷۰، مسند احمد ص ۱۸۷ ج ۲ ولفظہٗ : فان ما اسفل من سرتہ الی رکبتہٖ عورۃ)

۲ ـــــ عن زرعة بن عبد الرحمن بن جرهد عن ابيه قال كان جرهد هذا من اصحاب النبي صلى الله عليه وسلم من اصحاب الصفة، قال جلس رسول الله صلى الله عليه وسلم عندنا وفخذي منكشفة. فقال خمر عليك. اما علمت ان الفخذ عورة (ابو داؤد صـ۵۵ ج۱، سنن دارمی صـ۱۹۲ ج۲، عبد الرزاق صـ۲ ج۱۱، صحیح بخاری تعلیقاً صـ۵۳ ج۱، ترمذی صـ۱۰۳ ج۲)

زرعہ بن عبد الرحمٰن بن جرہد اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ ــــ حضرت جرہد رضی اللہ عنہ نے جو اصحاب صفہ میں سے تھے. فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس بیٹھے اور میری ران کھلی تھی، آپ نے فرمایا اپنا ستر ڈھکو. تجھے معلوم نہیں کہ ران ستر ہے۔

۳ ـــــ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال الفخذ عورۃ (بخاری تعلیقاً صـ۵۳ ج۱، ترمذی صـ۱۰۳ ج۲)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ران ستر ہے۔

۴ ـــــ عن ابی ایوب الانصاری رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسفل السرۃ وفوق الرکبتین من العورۃ۔ (نصب الرایہ صـ۲۹۷ ج۱، مغنی ابن قدامہ صـ۵۷۸ ج۱)

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ناف سے نیچے اور گھٹنوں سے اوپر کا حصہ ستر ہے۔

۵ ـــــ عن علی رضی اللہ عنہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لا تبرز فخذك ولا تنظر الی فخذ حي ولا ميت (ابوداؤد صـ۴۴۳ ج۱ وسکت علیہ فی باب ستر المیت عند غسلہ من کتاب الجنائز. ثم اخرجہ فی کتاب الحمام باب النہی عن التعری صـ۵۵۷ ج۲ وقال: ہذا الحدیث فیہ نکارۃ۔)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنی ران نہ کھولو۔ اور نہ کسی زندہ یا مردہ کی ران کی طرف نظر کرو۔

۶ ـــــــ عن محمد بن (عبد الله بن) جحش رضی الله عنه قال مر النبی صلی الله علیه وسلم وانا معهٗ علی معمر و فخذاه مکشوفتان، فقال یا معمر اغط علیک فخذیک قال الفخذ عورة (ذکره البخاری ج۱ ص۵۳)

حضرت عبد اللہ بن جحش رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم معمر کے پاس سے گذرے میں آپ کے ساتھ تھا معمر کی رانیں کھلی تھیں آپ نے فرمایا، معمر! اپنی رانیں ڈھکو۔ کیونکہ رانیں ستر ہیں۔

تعلیقاً و قال الحافظ، وصلهٗ احمد والمصنف فی التاریخ والحاکم فی المستدرک کلهم من طریق اسماعیل بن جعفر عن العلاء بن عبد الرحمٰن عن ابی کثیر مولیٰ محمد بن جحش عنه، ورجاله رجال الصحیح غیر ابی کثیر، فقد رویٰ عنه جماعة، لکن لم اجد فیه تصریحاً بتعدیل. وقد وقع لی حدیث محمد بن جحش مسلسلاً بالمحمدیین من ابتدائه الی انتهائه. وقد املیته فی الاربعین المتباینة فتح الباری ج۱ ص۴۰۳

۷ ـــــــ قال الحافظ ومعمر المشار الیه هو معمر بن عبد الله بن نضلة القرشی العدوی وقد اخرج ابن قانع هذا الحدیث من طریقه ایضاً (فتح الباری ج۱ ص۴۰۳)

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں حضرت معمر رضی اللہ عنہ جن کا ذکر اوپر کی حدیث میں آیا ہے یہ معمر بن عبد اللہ القرشی العدوی ہیں۔ ابن قانع نے یہ حدیث خود ان سے بھی روایت کی ہے۔

۸ ـــــــ عن علی رضی الله عنه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم الرکبة من العورة (اخرجه الدارقطنی وسندهٗ ضعیف کما فی نصب الرایه ج۱ ص۲۹۷)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ گھٹنا ستر میں داخل ہے۔

دوم: ان احادیث میں سے بعض صحیح ہیں، بعض حسن اور مقبول۔ اور بعض ضعیف۔ لیکن ایک ہی مضمون جب متعدد احادیث میں متعدد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مروی ہو تو اس کے صحیح ہونے میں کوئی تردد نہیں رہ جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ ائمہ اربعہ اور جمہور سلف و خلف رانوں کو ستر میں شمار کرتے ہیں۔ چنانچہ ابن قدامہ حنبلی مغنی ص ۵۷۸ ج ۱ میں لکھتے ہیں۔

والصالح فی المذھب انھا (ای العورة) من الرجل مابین السرة والركبة۔ نص علیه احمد فی روایة جماعة۔ وھو قول مالك والشافعی وابی حنیفة واکثر الفقهاء۔	صالح روایت ہمارے مذہب میں یہ ہے کہ مرد کا ستر ناف اور گھٹنے کے مابین ہے۔ ایک جماعت کی روایت میں امام احمدؒ نے اس کی تصریح کی ہے۔ اور یہی امام مالکؒ امام شافعیؒ امام ابوحنیفہؒ اور اکثر فقہاء کا قول ہے۔

ابن قدامہ نے امام احمدؒ کی دو روایتیں ذکر کی ہیں اور "صالح فی المذھب" اسی روایت کو کہا ہے جو جمہور کے مطابق ہے۔ اسی طرح امام مالکؒ سے بھی دو روایتیں ہیں۔ لیکن معتمد علیہ روایت وہی ہے جو جمہور کے مطابق ہے۔

سوم: سوال میں جس حدیث کا حوالہ دیا گیا ہے اس کی صحت میں کلام نہیں مگر یہاں چند اصول کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

ایک یہ کہ جب ایک حدیث سے کسی شے کی حرمت ثابت ہوتی ہو اور دوسری سے اس کی اباحت مفہوم ہوتی ہے تو اہل علم کے نزدیک حرمت کو ترجیح ہوتی ہے۔ اور یہ اصول بھی خود ارشاد نبویؐ سے ثابت ہے۔

عن النعمان بن بشیر رضی اللہ عنه قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم الحلال بین والحرام بین وبینهما متشبهات لا یعلمهن کثیر من الناس فمن اتقی الشبهات	نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے۔ اور حلال و حرام کے درمیان بعض امور مشتبہ ہیں جنکو بہت سے لوگ نہیں جانتے۔ پس جو شخص

استبرأ لدينه وعرضه ومن وقع في الشبهات وقع فيه ۔ كالراعي يرعى حول الحمى يوشك ان يرتع فيه الحديث (متفق عليه۔ كما في المشكوٰة صا۲۴۱)	شبہات سے بچا اس نے اپنے دین کو اور اپنی عزت کو بچا لیا اور جو شخص شبہ کی چیزوں میں جا پڑا وہ حرام میں مبتلا ہو جائے گا ۔ جیسے کوئی چرواہا ممنوع چراگاہ کے گرد و پیش چرائے تو قریب ہے کہ چراگاہ میں بھی چرانے لگے گا ۔

اس اصول کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو جن احادیث سے ران کا ستر ہونا ثابت ہوتا ہے ۔ وہ مقدم ہونگی ان روایات پر جن سے اس کے خلاف کا وہم ہوتا ہے ۔ غالباً امام بخاریؒ نے بھی "حدیث انس اسند و حدیث جرہد احوط" (صحیح ج۱ ص۵۳) کہہ کر اسی اصول کی طرف اشارہ فرمایا ہے ۔

دوسرا اصول یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل میں بظاہر تعارض نظر آئے تو قول کو ترجیح ہوگی کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات ۔ ۔ ۔ پوری امت کے لئے قانون عام ہیں اور افعال میں خصوصیت یا عذر کا احتمال ہے ۔ چونکہ متعدد احادیث میں آپؐ نے ران کو ستر فرمایا ہے ۔ جو امت کے لئے تشریع ہے ۔ اس کے مقابلہ میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل سے استدلال کرنا صحیح نہیں ہوگا ۔

تیسرا اصول یہ کہ اگر شارع علیہ السلام کے ارشاد فرمودہ کسی اصول اور قاعدہ سے کوئی خاص جزئی واقعہ بظاہر ٹکراتا ہو تو اصول اور قاعدہ کلیہ کو ترجیح ہوگی ۔ اور خاص واقعہ میں کوئی تاویل کی جائے گی ۔ یہ نہیں ہوگا کہ اس خاص واقعہ کو تو اصول اور قاعدہ بنا لیا جائے ۔ اور شارع علیہ السلام کے ارشاد فرمودہ اصول اور قاعدہ میں ترمیم کر ڈالی جائے ۔ چونکہ آپؐ نے ایک اصول عام کے طور پر فرما دیا ہے کہ "الفخذ عورۃ" (ران ستر میں داخل ہے) اس لئے اس اصول کو تو محکم رکھا جائے گا ۔ اور حضرت انسؓ کی حدیث میں جو ایک خاص واقعہ ذکر کیا گیا ہے اس کی کوئی توجیہ کی جائے گی ۔ مثلاً ایک یہ توجیہ ہو سکتی ہے کہ آپؐ نے قصداً ران کا کپڑا نہیں ہٹایا ہوگا ۔ بلکہ کپڑا اوپر کرتے ہوئے اتفاقاً ران کھل گئی ہوگی ۔ چنانچہ صحیح مسلم اور مسند احمد کی روایت میں "فانحسر" کا لفظ ہے ۔ یعنی ران کھل گئی ۔ یہ بھی احتمال ہے کہ ران کے ستر ہونے

کی تشریع بعد میں ہوئی ہو۔ اس وقت تک یہ حکم نازل نہ ہوا ہو۔

ران کا ستر ہونا چونکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے ثابت ہے اور کسی موقع پر ران کھل جانے کی روایت راوی کی اپنی تعبیر ہے ۔۔۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہیں اور ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد، راوی کی کسی جزئی واقعہ سے متعلق تعبیر پر مقدم ہے۔

چہارم:۔ ران کے ستر ہونے پر تو، جیسا کہ اوپر معلوم ہوا، ائمہ اربعہ اور اکثر فقہاء کا اتفاق ہے۔ لیکن حنفیہ گھٹنے کو بھی ستر میں شمار کرتے ہیں، کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں (جو اگرچہ ضعیف ہے) اس کو ستر فرمایا گیا ہے۔ نیز عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما کی حدیث "الی الرکبۃ" کے لفظ سے اس کا شبہ ہوتا ہے۔ اس لئے حنفیہ کے نزدیک گھٹنوں کا ستر میں شمار کیا جانا مقتضائے احتیاط ہے تاہم ائمہ احناف نے اختلاف روایات کے پیش نظر ستر کے تین درجے قرار دیئے ہیں۔ چنانچہ ہدایہ (کتاب الکراہیۃ فصل فی الوطء والنظر واللمس) میں ہے:

و حکم العورۃ فی الرکبۃ	ستر کا حکم گھٹنے میں اخف ہے بہ نسبت
اخف منہ فی الفخذ وفی	ران کے۔ اور ران میں اخف ہے بہ نسبت
الفخذ اخف منہ فی السوءۃ	اعضائے مستورہ کے۔ چنانچہ اگر کوئی گھٹنے
حتی ان کاشف	ننگے کرے تو اس کو نرمی سے ٹوکا جائے گا۔
الرکبۃ ینکر علیہ	(اور اگر وہ اصرار کرے تو خاموشی اختیار کی
برفق وکاشف	جائے گی) اور اگر کوئی شخص ران ننگی کرے
الفخذ یعنف علیہ	تو اس کو سختی سے روکا جائے گا، لیکن اگر
وکاشف السوءۃ	وہ اصرار کرے تو اس پر دست درازی نہیں
یؤدب ان لج	کی جائے گی) اور اگر کوئی شخص اعضائے
	مستورہ کو برہنہ کرے اور سمجھانے پر بھی
	باز نہ آئے تو اس کی گوشمالی کی جائے گی۔

اس سے ائمہ احناف کی دقیقہ رسی واضح ہو جاتی ہے کہ ایک طرف تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کی ذات گرامی سے انکے عشق و محبت کا یہ عالم ہے کہ آپؐ کے کسی ارشاد کو بھی خواہ ضعیف سند سے ہی منقول ہو وہ مہمل چھوڑنا نہیں چاہتے۔ اور دوسری طرف ان کی حقیقت پسندی و مرتبہ شناسی کا یہ حال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو چیز جس درجہ میں منقول ہو اسے وہی مقام و مرتبہ دیتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ احادیث نبویہ کی جمع و تطبیق اور ان کی درجہ بندی کا جو کام ائمہ احناف نے کیا ہے اس کی مثال نہیں۔ کتاب و سنت کے سمندر کی اسی غواصی کا نام تفقّہ فی الدین ہے جس کے بارے میں امام شافعیؒ فرمایا کرتے تھے۔

من اراد الفقہ فھو عیال	جو شخص تفقہ فی الدین کا ارادہ رکھتا ہو
علی ابی حنیفۃ رحمہ اللہ	وہ امام ابوحنیفہؒ کا دست نگر ہے۔

○

نوٹ: دو سوال اسی نوعیت کے جناب محمد صادق صاحب میٹھادر کراچی کے وصول ہوئے۔ بعض احباب کی رائے ہوئی کہ ان کا جواب بھی انہی تیرہ سوالو کے ساتھ ملحق کر دیا جائے۔ لہذا سوال ۱۴ اور ۱۵ میں یہ دونوں سوال و جواب درج کئے جاتے ہیں۔

سوال چہاردہم: خطبہ کے دوران تحیۃ المسجد کا حکم:

س ۱۴: ہمارے ہاں خطبہ کے احکام میں بتلایا جاتا ہے کہ جب امام خطبہ کے لئے ممبر پر بیٹھ جائے تو اس وقت نہ ہی نماز پڑھی جائے اور نہ ہی کلام کیا جائے حتیٰ کہ زبان سے کسی کو منع بھی نہ کیا جائے بلکہ دعا و درود بھی دل میں ہی کہہ لیا جائے زبان نہ ہلے لیکن احادیث کے حوالہ سے یہ بات ثابت کی جاتی ہے کہ اگر کوئی ایسے موقع پر مسجد میں حاضر ہو کہ امام خطبہ پڑھ رہا ہو تو ہلکی دو رکعتیں پڑھ کر بیٹھنا چاہئے اور اس سلسلہ میں مسلم ابن ماجہ ابوداؤد کے حوالہ سے سلیک الغطفانیؓ کا واقعہ نقل کیا جاتا ہے کہ

خطبہ کے دوران جب مسجد میں آئے اور بغیر دو رکعت پڑھے بیٹھ گئے تو آپ نے دریافت فرمایا کہ دو رکعت پڑھ کر بیٹھے ہو تو ان کے نفی کے جواب پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اٹھو اور دو رکعت ادا کر کے بیٹھو پھر لوگوں سے فرمایا کہ جو بھی ایسے وقت حاضر ہو وہ ہلکی دو رکعتیں پڑھ کر بیٹھے ۔ مزید اس کی تفصیل میں کہا جاتا ہے کہ مروان بن حکم کے زمانہ میں فرمان شاہی تھا کہ جب بادشاہ خطبہ پڑھ رہے ہوں تو کوئی دو رکعت نماز نہ پڑھے اور علت شان شاہی کی تحقیر بتلائی گئی لیکن حضرت ابوسعید خدری ؓ ایسے موقع پر پہنچتے ہیں اور دو رکعت ادا فرماتے ہیں اور جبراً ان کی یہ نماز تڑوانے کی بھی پرواہ نہیں فرماتے ہیں کہ سنت رسول ؐ کسی بادشاہ کے قانون پر قربان نہیں کی جا سکتی بلکہ تمام قوانین سلطنت ایک سنت پر پائیں پاؤں تلے روندے جا سکتے ہیں اس واقعہ کے لئے حوالہ ترمذی شریف کا دیا جاتا ہے ۔ اور خطبہ کے دوران آنے والا دو رکعت نہ پڑھے اسے مروانی بدعت کہا جاتا ہے ۔ مروان کے متعلق یہ بھی بتلایا جاتا ہے کہ اس بادشاہ نے عید کے خطبہ کو بھی نماز سے پہلے کر دیا تھا۔

مندرجہ بالا تفصیل کے پیش نظر حدیث سے تطابق کی صورۃ کیا ہوگی ۔ ہمارے ہاں تو جیسے اور افعال خطبہ کے دوران منع ہیں ایسے ہی نماز کو بھی منع کیا جاتا ہے ۔ یہاں نماز کا حکم دیا جا رہا ہے ۔ اس حدیث کی روشنی میں نماز کی اجازت ہمارے ہاں بھی ہے یا نہیں ؟ نفی کی صورت میں ہمارے دلائل اور اس حدیث کا جواب کیا ہے ؟ اس حدیث میں جن دو رکعتوں کا ذکر ہے اس سے تو تحیۃ المسجد سمجھ میں آتی ہے جو کہ شاید وجوب کا درجہ نہیں رکھتی یہاں تاکید سے سنت مؤکدہ سمجھ میں آتی ہے ۔ اگر تحیۃ المسجد (ان دو رکعتوں کی) حیثیت سنت مؤکدہ کی ہے تو چار سنت قبل الجمعہ کی اجازت ہونی چاہیئے جو کہ سنت مؤکدہ ہی ہے ۔ اس ضمن میں ایک سوال ذہن میں یہ بھی اٹھتا ہے کہ جو شخص عین خطبہ کے دوران آئے اسے وضو بھی کرنا ہوتا ہے اس کے وضو کے عمل سے ثواب لغو ہو جائے گا یا نہیں ؟

ج : ۱۴ ــ حضرات خلفائے راشدین ؓ اور جمہور صحابہ ؓ و تابعین ؒ کے نزدیک خطبہ کے دوران صلوٰۃ و کلام ممنوع ہے ۔ امام اعظم ابوحنیفہ ؒ امام مالک ؒ اور اکثر فقہائے امت اسی کے قائل ہیں ۔ اور قرآن و سنت کی روشنی میں یہی مسلک راجح اور صواب ہے ۔ اس کے برعکس بعض صحابہ ؓ و تابعین ؒ خطبہ کی حالت میں

بھی تحیۃ المسجد کے قائل تھے۔ امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور مابعد کے بیشتر محدثینؒ نے اسی مسلک کو اختیار کیا ہے۔ تاہم ان حضرات کے نزدیک بھی تحیۃ المسجد کے استحسان یا جواز کی شرط یہ ہے کہ خطبہ آخری مراحل میں نہ ہو۔ کہ تحیۃ المسجد میں مشغول ہونے کی صورت میں جماعت شروع ہو جانے کا اندیشہ ہو، ایسی حالت میں ان کے نزدیک بھی تحیۃ المسجد میں مشغول ہونا ممنوع ہے۔

جو حضرات خطبہ کے دوران تحیۃ المسجد کے جواز یا استحسان کے قائل ہیں ان کا استدلال حضرت سلیک غطفانی رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ہے، جو سوال میں ذکر کی گئی ہے، اس پر گفتگو کرنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ جمہور امت نے جو مسلک اختیار کیا ہے کہ خطبہ کے دوران نماز اور کلام ممنوع ہے اس کے دلائل معلوم کرائے جائیں۔

قرآن کریم:

حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے:

وإذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا لعلكم ترحمون (الاعراف: ۲۰۴)	اور جب قرآن پڑھا جایا کرے تو اس کی طرف کان لگا دیا کرو اور خاموش رہا کرو، امید ہے کہ تم پر رحمت ہو (بیان القرآن)

فاتحہ خلف الامام کی بحث میں شیخ ابن تیمیہؒ کے حوالے سے عرض کر چکا ہوں کہ یہ آیت نماز اور خطبہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ چنانچہ وہ اپنے فتاویٰ میں لکھتے ہیں:

"اور سلف سے استفاضہ و شہرت کے ساتھ منقول ہے کہ یہ آیت قراءۃ فی الصلوٰۃ کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور بعض کا قول ہے کہ خطبہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور امام احمدؒ نے اس پر اجماع ذکر کیا ہے کہ یہ نماز اور خطبہ کے بارے میں نازل ہوئی۔"

(طبع قدیم ص ۱۴۳ ج ۲، جدید ص ۲۶۹ ج ۲۳)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"امام احمدؒ نے اس پر لوگوں کا اجماع ذکر کیا ہے کہ یہ آیت نماز اور خطبہ کے بارے میں نازل ہوئی۔"

(ص ۲۱۲ ج ۲، ص ۳۱۲ ج ۲۳)

پس جب یہ آیت کریمہ نماز اور خطبہ دونوں سے متعلق ہے۔ اور امام احمدؒ اس پر لوگوں کا اجماع نقل کرتے ہیں تو قرآن کی نص قطعی سے خطبہ کا استماع اور اس کے لئے خاموش رہنا واجب ہوا، اور ہر ایسا قول و فعل ممنوع ٹھہرا جو استماع و انصات کے منافی ہو۔ راز اس کا یہ ہے کہ خطبہ چونکہ قرآنی آیات پر مشتمل ہوتا ہے اس لئے پورے خطبہ کو "الذکر" فرما کر اس کے استماع کو واجب فرمایا گیا ہے۔ اور پھر خطیب کی حیثیت چونکہ خدائی نمائندہ کی ہوتی ہے جو لوگوں کو احکام خداوندی سنا رہا ہے۔ اس لئے حاضرین کو گوش بر آواز رہنے کا حکم دے کر ہر ایسی حرکت کو ممنوع قرار دیا گیا جو خطبہ کی سماعت میں مخل ہو۔ اور جو شخص اس موقع پر استماع کے منافی حرکت کرے اس کو لغو کا مرتکب اور جمعہ میں اس کی حاضری کو باطل و بے کار اور ثواب سے محروم فرمایا کیونکہ خطبہ میں دو طرفہ عمل ہے۔ خطیب کی طرف سے اسماع یعنی احکام خداوندی کا سنانا، اور حاضرین کی طرف سے استماع یعنی سننا اور خاموش رہنا۔ پس حاضرین میں سے جو شخص فریضہ استماع سے سرتابی کرتا ہے وہ گویا خطیب اور خطبہ کا استخفاف کرتا ہے کہ خطیب اس کو احکام خداوندی سنا رہا ہے۔ مگر یہ آمادہ سماعت نہیں۔ بلکہ کسی دوسرے شغل میں مصروف ہے شاید اسی بنا پر حدیث ابن عباسؓ میں ایسے شخص کو گدھے کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ (مشکوٰۃ ص۱۲۳ ج۱)

اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ خطبہ جمعہ کی حیثیت محض وعظ و تذکیر کی نہیں بلکہ اس میں ایک گونہ نماز کی شان پائی جاتی ہے۔ شاید یہی حکمت ہے کہ خطبہ کو صحت جمعہ کے لئے شرط قرار دیا گیا ہے اور شاید اسی سے بعض سلف نے یہ سمجھا ہے کہ جس شخص سے خطبہ فوت ہو جائے اس کا جمعہ نہیں ہوتا۔ بلکہ اسے ظہر کی چار رکعتیں پڑھنی ہوں گی، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے:

الخطبة موضع الركعتين من — جمعہ کا خطبہ دو رکعت کے قائم مقام ہے۔

فاتته الخطبة صلى اربعاً — جس سے خطبہ فوت ہو جائے وہ چار رکعتیں پڑھے۔

(مصنف عبدالرزاق ص۲۳۷ ج۳، ابن ابی شیبہ ص۱۲۸ ج۲)

اور طاؤسؒ، مجاہدؒ، اور عطاءؒ (تابعینؒ) سے نقل کیا ہے:

فمن لم يدرك الخطبة صلى — جس نے خطبہ نہیں پایا وہ چار رکعتیں پڑھے۔

اربعاً (عبدالرزاق ص۲۲۵، ابن ابی شیبہ ص۱۲۵)

اگرچہ جمہور اُمت کے نزدیک ایسے شخص کو جمعہ کی دو ہی رکعتیں پڑھنی ہوں گی۔ لیکن ان آثار سے خطبۂ جمعہ کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔

الغرض آیت موصوفہ میں خطبۂ جمعہ کے استماع کو لازم قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا خطبہ کے دوران صلوٰۃ و کلام، جو استماع کے منافی ہیں۔ اس آیت کریمہ کی رُو سے ممنوع ہوں گے۔

احادیث نبویہ | اور یہی مضمون آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی متواتر احادیث میں مذکور ہے، چنانچہ:

۱۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی روایت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے:

لا یغتسل رجل یوم الجمعة	جو شخص جمعہ کے دن غسل کرے اور خوب
ویتطهر ما استطاع من	صفائی کرے تیل لگائے اور گھر میں
طهر ویدهن من دهنه ویمس	خوشبو ہو تو وہ لگائے پھر جمعہ کے لئے
من طیب بیته ثم یخرج فلا	نکلے تو دو آدمیوں کے درمیان نہ بیٹھے،
یفرق بین اثنین ثم یصلی	پھر جتنی نماز اس کے لئے مقدر ہے پڑھے۔
ما کتب له، ثم ینصت	پھر جب امام خطبہ شروع کرے تو خاموش
اذا تکلم الامام الا غفر له	رہے، تو ایسے شخص کے اس جمعہ سے
ما بینه وبین الجمعة	دوسرے جمعہ تک کے تمام گناہ معاف
الاخریٰ (صحیح بخاری ج۱ ص۱۲۱، ۱۲۵)	ہو جاتے ہیں۔

۲۔ اور صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے یہ الفاظ مروی ہیں۔

فصلی ما قدر له ثم انصت	پھر جتنی نماز اس کے لئے مقدر تھی پڑھی،
حتی یفرغ من خطبته۔	پھر خاموش رہا یہاں تک کہ امام خطبہ
(ص ۲۸۳)	سے فارغ ہو لیا۔ الخ

۳۔ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے اسی مضمون کی حدیث مروی ہے اس کے

الفاظ یہ ہیں :

ثم خرج الی المسجد فیرکع	پھر مسجد کی طرف نکلا، پس نماز پڑھتا
ما بدا لہ. ولم یوذ احداً،	رہا جس قدر بھی چاہا۔ اور کسی کو ایذا نہیں
ثم انصت حتیٰ یصلی (رواہ احمد	دی پھر نماز جمعہ ختم ہونے تک خاموش رہا۔
والطبرانی فی الکبیر، رجالہ ثقات مجمع الزوائد ص۱۷۱ ج۲)	خاموش رہا۔

۴۔ اور حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے :

ویرکع ماقضی لہ ثم انتظر	اور جس قدر مقدر تھی پڑھی، پھر امام کے
حتی ینصرف الامام (رواہ	فارغ ہونے تک خاموش رہا۔

احمد والطبرانی فی الکبیر من حرب بن قیس عن ابی الدرداء۔ و حرب لم یسمع من ابی الدرداء۔ زوائد ص۱۷۱ ج۲)

۵۔ اور حضرت ابوسعید خدری اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے :

ثم صلی ما کتب اللہ لہ ثم	پھر نماز پڑھی جو اللہ تعالیٰ نے اس کے
انصت اذا خرج الامام (ابوداؤد	لئے مقدر فرمائی تھی پھر خاموش رہا.
ص۵۰ ج۱ واللفظ لہ طحاوی ص۲۱۲ ج۱)	جب امام خطبہ کے لئے نکل آیا۔

ان احادیث طیبہ میں دو باتیں قابل غور ہیں۔ ایک یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھنے کی حد خطبہ سے پہلے تک ارشاد فرمائی ہے۔ جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ جو شخص خطبہ شروع ہونے کے بعد نماز پڑھتا ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مقرر کردہ حد سے تجاوز کرتا ہے۔

دوم یہ کہ ان احادیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز اور سکوت کو متقابل ذکر فرمایا ہے، خطبہ سے پہلے نماز اور خطبہ کے دوران انصات یعنی خاموش رہنا۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ خطبہ کے دوران نماز پڑھنا سکوت کے منافی ہے، چونکہ اس حالت میں سکوت واجب ہے لہٰذا نماز اور کلام دونوں ممنوع ہوں گے۔

۱۰۔ صحاح ستہ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مشہور حدیث ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی، دوسری، تیسری، چوتھی، پانچویں اور چھٹی گھڑی میں آنے والوں کے درجات کو

علی الترتیب بیان کرتے ہوئے فرمایا :

فاذا خرج الامام طووا صحفہم ویستمعون الذکر۔ (صحیح بخاری ج۱ ص۱۲۷، صحیح مسلم ج۱ ص۲۸۳، نسائی ج۱ ص۲۰۴، ترمذی ج۱ ص۶۶)

پھر جب امام خطبہ کے لئے نکل آتا ہے تو فرشتے اپنے صحیفے لپیٹ کر رکھ دیتے ہیں۔ اور ذکر کے سننے میں مشغول ہوجاتے ہیں۔

اسی مضمون کی حدیث حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں :

حتیٰ اذا خرج الامام رفعت الصحف (رواہ احمد والطبرانی فی الکبیر نحوہ ورجال احمد ثقات مجمع الزوائد ج۲ ص۱۷۷)

یہاں تک کہ جب امام نکل آئے تو صحیفے اٹھالئے جاتے ہیں۔

۷ ۔ نیز اسی مضمون کی حدیث حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں :

فاذا اذن المؤذنون وجلس الامام علی المنبر طویت الصحف ودخلوا المسجد یستمعون الذکر (رواہ احمد ورجالہ ثقات۔ زوائد ج۲ ص۱۷۷)

پس جب اذان شروع ہوتی ہے۔ اور امام منبر پر بیٹھ جاتا ہے تو صحیفے لپیٹ دئے جاتے ہیں اور فرشتے مسجد میں آکر ذکر سننے میں مشغول ہوجاتے ہیں۔

امام کے نکل آنے کے بعد فرشتوں کا نامۂ اعمال لپیٹ کر ذکر سننے میں مشغول ہوجانا اس امر کی دلیل ہے کہ خطبہ کی حالت، ذکر سننے کے سوا، تمام اعمال کی بندش کا وقت ہے۔ اس وقت استماع کے سوا کسی عمل خیر کی گنجائش نہیں، نہ نماز کی، نہ کلام کی۔ اور یہ مضمون متعدد احادیث میں صاف صاف آیا ہے، چنانچہ :

۸ ۔ مسند احمد (ج ۵ ص ۷۵) میں حضرت نبیشہ ہذلی رضی اللہ عنہ کی روایت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مروی ہے :

ان المسلم اذا اغتسل یوم الجمعۃ ثم اقبل الی المسجد لا یؤذی احداً،

مسلمان جب جمعہ کے دن غسل کر کے مسجد کی طرف چلے، کسی کو ایذا نہ دے۔

فان لم یجد الامام خرج صلی ما بدا له۔ وان وجد الامام قد خرج جلس فاستمع وانصت حتی یقضی الامام جمعته و کلامه الخ

پھر اگر دیکھے کہ امام ابھی نکلا نہیں تو جتنی چاہے نماز پڑھتا ہے۔ اور اگر دیکھے کہ امام نکل آیا ہے تو بیٹھ جائے سننے لگے۔ اور خاموش رہے یہاں تک کہ امام خطبہ و نماز سے فارغ ہو جائے۔

(رواہ احمد۔ و رجاله رجال الصحیح، خلا شیخ احمد، وهو ثقة۔ زوائد ص ۱۷۱ ج ۲)

۱۰۔ اور طبرانی کی معجم کبیر میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مروی ہے:

اذا دخل احدکم المسجد والامام علی المنبر فلا صلوٰة ولا کلام حتی یفرغ الامام۔

جب تم سے کوئی شخص مسجد میں اس وقت داخل ہو جب کہ امام منبر پر ہو تو نماز کلام نہیں جب تک امام فارغ نہ ہو جائے۔

(وفیه ایوب نهیك، وهو متروك ضعفه جماعة۔ وذکره ابن حبان فی الثقات وقال یخطئ (زوائد ص ۱۸۴ ج ۲)

اس روایت کا ایک راوی اگرچہ مختلف فیہ ہے۔ جیسا کہ علامہ ہیثمیؒ نے ابن حبانؒ سے اس کی توثیق بھی نقل کی ہے۔ لیکن اس میں ٹھیک وہی مضمون ہے جو قرآن کریم اور صحیح احادیث میں اوپر آ چکا ہے۔

علاوہ ازیں متعدد بلکہ متواتر احادیث میں یہ مضمون وارد ہے کہ خطبہ کی حالت میں کلام کی اجازت نہیں، اور یہ کہ جو شخص خطبہ کے دوران کسی کو خاموش کرنے کیلئے "انصت" یا "صَهْ" (خاموش!) کا لفظ کہہ دے اس کا بھی جمعہ باطل ہو جاتا ہے۔ حالانکہ امر بالمعروف بشرط قدرت واجب ہے۔ پس جب کسی ایسے واجب میں مشغول ہونا، جو استماع و انصات کے منافی ہو، اس وقت جائز نہیں تو تحیۃ المسجد میں مشغول ہونا، بدرجہ اولیٰ ناجائز ہوگا، کیونکہ اس کا درجہ ایک تو مستحب کا ہے۔ دوسرے یہ "خاموش!" کہنے سے بڑھ کر مخلِ استماع ہے ــــــ اس کی مثال ایسی ہے کہ قرآن کریم نے والدین

کو "اُف" کہنے سے منع کیا ہے اس سے اہل عقل نے بدلالت النص یہ سمجھا کہ جب "اُف" کہنا جائز نہیں تو مار پیٹ جو قباحت میں اس سے بڑھ کر ہے بدرجۂ اولیٰ ناجائز ہو گی۔ ٹھیک اسی طرح جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ کے دوران "صہ" کہنے کی اجازت نہیں دی۔ بلکہ اس دو حرفی لفظ کو بھی لغو اور جمعہ کا باطل کنندہ فرمایا ہے تو لامحالہ جو اس سے بڑھ کر مخل استماع ہے وہ بدلالۃ النص اس سے بڑھ کر ناجائز ہو گی۔

سلف صالحین کا تعامل: قرآن و حدیث کے نصوص کے بعد اس مسئلہ میں حضرات صحابہؓ و تابعینؒ کے تعامل پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔

۱۔ مؤطا امام مالک میں بروایت زہری حضرت ثعلبہ بن ابی مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

انہم کانوا فی زمن عمر بن الخطاب یصلّون یوم الجمعۃ حتّی یخرج عمر بن الخطابؓ فاذا خرج عمرؓ وجلس علی المنبر۔ واذّن المؤذنون قال ثعلبۃ جلسنا نتحدّث۔ فاذا سکت المؤذنون وقام عمر یخطب انصتنا۔ فلم یتکلم منا احد۔ قال ابن شہاب فخروج الامام یقطع الصلوٰۃ وکلامہ یقطع الکلام۔	حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں لوگ جمعہ کے دن نماز پڑھتے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تشریف لاتے۔ پس جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ تشریف لا کر منبر پر بیٹھ جاتے اور مؤذن اذان کہتے تو ہم بیٹھے بیٹھے بات کر لیا کرتے تھے۔ پھر جب مؤذن خاموش ہو جاتے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ خطبہ کے لئے کھڑے ہو جاتے تو ہم خاموش ہو جاتے۔ پس ہم سے کوئی شخص کلام نہ کرتا، ابن شہابؒ فرماتے ہیں پس امام کا نکلنا نماز کو اور اس کا کلام کرنا گفتگو کو بند کر دیتا ہے۔

(مؤطا امام مالک صـ۱۰۳، مؤطا امام محمد صـ۱۳۵)

مصنف ابن ابی شیبہ میں ثعلبہ بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں:

ادرکت عمر و عثمان فکان الامام اذا خرج یوم الجمعۃ ترکنا الصلوٰۃ (ص۱۱۱ ج۲)	میں نے حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کا زمانہ پایا پس جب امام جمعہ کے دن خطبہ کے لئے نکل آتا تو ہم نماز چھوڑ دیتے تھے۔

۲۔ نصب الرایہ (۲-۲۰۴) میں مسند اسحاق بن راہویہ سے حضرت سائب بن یزید رضی اللہ عنہ کا ارشاد نقل کیا ہے:

کنا نصلی فی زمن عمر یوم الجمعۃ فاذا خرج عمر وجلس علی المنبر قطعنا الصلوٰۃ۔ وکنا نتحدث ویحدثونا، وربما نسأل الرجل الذی یلیہ عن سوقہ ومعاشہ فاذا سکت المؤذن خطب ولم یتکلم احد حتی یفرغ من خطبتہ۔	ہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جمعہ کے دن نماز پڑھتے تھے۔ پھر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ تشریف لاکر منبر پر رونق افروز ہوتے تو ہم نماز بند کردیتے تھے۔ اور لوگ آپس میں بات چیت کرلیا کرتے تھے۔ اور کبھی ایک شخص اپنے قریب کے شخص سے اس کے بازار اور معاش کا حال احوال بھی پوچھ لیتا پھر جب مؤذن خاموش ہوجاتا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ خطبہ شروع کرتے۔ اور ان کے خطبہ سے فارغ ہونے تک ہم میں سے کوئی شخص بات نہ کرتا۔

حافظؒ "درایہ" میں فرماتے ہیں: اسنادہٗ جید۔" (حاشیہ نصب الرایہ ص۲۰۱ ج۲)

۳۔ نیز مؤطا میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ وہ عموماً اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا کرتے تھے:

اذا قام الامام فاستمعوا وانصتوا فان المنصت الذی لا یسمع من الخطبۃ مثل ما للسامع المنصت۔	جب امام کھڑا ہو جائے تو اس کی طرف کان لگاؤ۔ اور خاموش رہا کرو کیونکہ جو شخص خاموش رہے خواہ اسے خطبہ نہ سنتا ہو اس کو بھی اتنا ہی اجر ملتا ہے جتنا کہ خاموش رہ کر سننے والے کو۔
(مؤطا امام محمد ص ۱۳۸)	

۴ ۔ مصنف عبدالرزاق میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد نقل کیا ہے کہ جمعہ میں تین قسم کے لوگ شریک ہوتے ہیں ایک وہ شخص جو جمعہ میں سکون. وقار اور خاموشی کے ساتھ حاضر ہوا، یہ تو ایسا شخص ہے کہ اس کے جمعہ سے جمعہ تک کے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں (راوی کہتا ہے کہ میرا خیال ہے کہ آپ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ اور تین دن مزید ـــــ دوسرا وہ شخص جو جمعہ میں شریک ہو کر لغو کا مرتکب ہو اس کا حصہ بس یہی لغو ہے، (مطلب یہ کہ نیکی برباد گناہ لازم کا مصداق ہے)

ورجل صلّی بعد خروج الامام فلیست بسنۃ ۔ ان شاء اعطاہ وان شاء منعہ۔	اور تیسرا وہ شخص جس نے امام کے نکلنے کے بعد نماز پڑھی، پس اس کی یہ نماز سنت کے مطابق نہیں، اب اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو اس کو (ثواب) دے۔ اور چاہے تو نہ دے۔
(ص ۲۱۰ / ج ۳)	

۵ ـــــ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا گیا کہ خطبہ کے دوران آدمی نماز پڑھ سکتا ہے؟ فرمایا، اگر سبھی پڑھنے لگیں تو کیا یہ ٹھیک ہوگا؟ (ایضاً ص ۲۴۵ ج ۲)

۶ ـ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ وہ امام کے آنے سے پہلے نماز پڑھتے تھے۔ امام کے آنے کا وقت ہوتا تو نماز نہیں پڑھتے تھے بلکہ بیٹھ جاتے تھے (ایضاً ص ۲۱۱)

۷ ـ مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت علی. حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے نقل کیا ہے:

انھم کانوا یکرھون الصلوٰۃ والکلام بعد خروج الامام۔ (ص ۱۱۱ ج ۲)	یہ حضرات امام کے نکلنے کے بعد صلوٰۃ وکلام کو مکروہ سمجھتے تھے۔

۸۔ امام طحاوی نے حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کا ارشاد نقل کیا ہے:

الصلوٰۃ والامام علی المنبر معصیۃ۔ (فتاوی ص ۲۱۷ ج ۱)	جب امام منبر پر ہو اس وقت نماز پڑھنا گناہ ہے۔

۹۔ اور حضرت ثعلبہ بن ابی مالک رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے:

جلوس الامام علی المنبر یقطع الصلوٰۃ وکلامہ یقطع الکلام۔	امام کا منبر پر بیٹھنا نماز کو اور اس کا کلام کرنا گفتگو کو بند کر دیتا ہے۔

(حوالہ مذکور)

۱۰۔ معارف السنن ص ۳۶۶ ج ۴ میں قاضی عیاض کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خطبہ کے دوران نماز پڑھنے سے منع فرمایا کرتے تھے۔

۱۱۔ مصنف عبدالرزاق میں سید التابعین حضرت سعید بن مسیّب رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے:

خروج الامام یقطع الصلوٰۃ وکلامہ یقطع الکلام (عبدالرزاق ص ۲۰۸ ج ۳)	امام کا نکلنا نماز کو اور اس کا کلام کرنا گفتگو کو بند کر دیتا ہے۔

۱۲۔ مصنف عبدالرزاق ص ۲۴۵ ج ۳، اور ابن ابی شیبہ ص ۱۱۱ ج ۲ میں قاضی شریح سے نقل کیا ہے کہ وہ خطبہ کے دوران نماز کے قائل نہیں تھے۔

۱۳۔ مصنف عبدالرزاق (ص ۲۴۵ ج ۳، ص ۲۲۶) قتادہ اور عطاء سے یہی نقل ہے۔

۱۴۔ مصنف ابن ابی شیبہ میں ابن سیرین، عروہ بن زبیر اور زہری سے ممانعت نقل کی ہے۔

سلیک غطفانی کا واقعہ: سوال میں حضرت سلیک غطفانی رضی اللہ عنہ کے جس واقعہ کا حوالہ دیا گیا ہے اس کے بارے میں چند امور پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

۱۔ یہ تو اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ قرآن کریم نے خطبہ کے استماع و انصات کو فرض قرار دیا ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متواتر ارشادات میں بھی اس کی تاکید فرمائی گئی ہے۔ خلفائے راشدین اور

جمہور صحابہ و تابعین (رضوان اللہ علیہم اجمعین) قرآن و سنت کے انہی نصوص کے پیش نظر خطبہ کے دوران صلوٰۃ و کلام کے قائل نہیں تھے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ سلیک غطفانیؓ کا واقعہ ان کے علم میں تھا۔ کیونکہ ہمیں تو اس واقعہ کا علم روایات کے ذریعہ ہوا۔ مگر یہ اکابر اس واقعہ کے عینی شاہد تھے۔ یہ واقعہ جمعہ کے اجتماع عام میں پیش آیا تھا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلیکؓ سے جو کچھ ارشاد فرمایا، برسر ممبر ارشاد فرمایا تھا۔ اس لئے یہ تاویل تو ممکن نہیں کہ ان حضرات کو اس واقعہ کا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا علم نہیں ہوگا۔

اور یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ یہ حضرات دیدہ و دانستہ بغیر کسی معقول وجہ کے حدیث نبویؐ کو ترک کر دیں۔ اور نص نبویؐ کے خلاف کے قائل ہو جائیں۔ کیونکہ اگر اس احتمال کو تسلیم کر لیا جائے تو حضرات خلفائے راشدینؓ اور جمہور صحابہؓ و تابعینؒ کے دین و دیانت پر ہی سے اعتماد اٹھ جاتا ہے۔ یہ احتمال کسی رافضی ذہن میں تو آ سکتا ہے، مگر صحیح العقیدہ مسلمان اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

اور یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ اکابر ہم لوگوں سے بڑھ کر متبع سنت اور حسنات کے حریص تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلیکؓ کو جو حکم فرمایا اگر یہ سب کے لئے عام ہوتا تو ناممکن تھا کہ تمام صحابہ کرام خصوصاً حضرات خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین اس حکم پر عمل پیرا نہ ہوتے۔ اور اس کار ثواب سے نہ صرف خود محروم رہا کرتے۔ بلکہ دوسروں کو بھی منع کیا کرتے۔

۲ ۔ مندرجہ بالا حقائق بالکل صاف اور بدیہی ہیں۔ جن سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ان اکابر نے جو اس حدیث پر عمل نہیں فرمایا تو اس کی کوئی معقول اور صحیح وجہ ہوگی ۔۔۔۔ رہا یہ سوال کہ وہ وجہ کیا ہے؟ اس کا جواب صرف ہمارے ذمہ نہیں بلکہ ان تمام لوگوں کے ذمہ ہے جو صحابہ کرام اور خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کو حق و صداقت کے علمبردار سمجھتے ہیں۔ اور جن کا ذہن رفض کے شائبہ سے پاک ہے۔ اگر کسی حدیث کی مخالفت کا الزام امام اعظم ابو حنیفہؒ پر ہو تو اس کی جواب دہی تو مان لیجئے کہ صرف حنفیہ ہی کا فرض ہے۔ لیکن خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم تو صرف حنفیوں کے نہیں، اگر کسی حدیث کی مخالفت کا الزام خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم پر آتا ہے تو اس کی جواب دہی ہر مسلمان کا فرض ہے۔

اور یہیں سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جانی چاہئے کہ خبر واحد کی اہمیت زیادہ ہے یا خلفائے راشدینؓ

اور حضرات صحابہؓ کے تعامل کی؟ یعنی جب خلفائے راشدینؓ اور عام صحابہؓ کا تعامل کسی خبر واحد کے خلاف ہو (جیسا کہ ہمارے زیر بحث مسئلہ میں) تو خبر واحد کو واجب العمل قرار دے کر ان اکابر کو مورد الزام ٹھہرایا جائے گا؟ یا یہ کہ ان اکابر کے تعامل کی روشنی میں خود خبر واحد کو لائق تاویل تصور کیا جائے گا۔ پہلا راستہ رفض و بدعت کی طرف جاتا ہے۔ اور دوسرا "ما انا علیہ واصحابی" کی طرف۔ اب ہر شخص کو اختیار ہے کہ ان دونوں میں سے جونسا راستہ چاہے اختیار کرلے۔

۳ ـــ ان اکابر نے سلیک غطفانیؓ کی روایت کو جو معمول بہا نہیں سمجھا ہمارے نزدیک اس کی بلا تکلف دو وجہیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ یہ حضرات جانتے تھے کہ سلیکؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دو رکعتیں پڑھنے کا جو حکم فرمایا ہے، یہ عام حکم نہیں بلکہ یہ صرف انہی کے لئے ایک خصوصی واستثنائی حکم ہے،

دوم یہ کہ ان حضرات کو معلوم تھا کہ اس واقعہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ کے دوران صلوٰۃ و کلام سے ممانعت فرمائی ہے، اس لئے اب اس کا جواز باقی نہیں رہا۔

۴ ـــ پہلی توجیہہ، یعنی یہ کہ اس واقعہ کو خصوصیت پر محمول کیا جائے۔ اس کے قرائن مندرجہ ذیل ہیں۔

الف: خصوصیت کی ایک دلیل یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ کو متعدد ایسے واقعات پیش آئے کہ ان کی حاضری خطبہ کے دوران ہوئی مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دوگانہ ادا کرنے کا حکم نہیں فرمایا:

مثلاً:

۱ ـ صحیح بخاری ج۱ ص۱۳۷ (باب الاستسقاء فی المسجد الجامع) میں ان صاحب کا واقعہ مذکور ہے جنہوں نے خطبہ کے دوران آتے ہی بارش کی دعا کی درخواست کی تھی، آپؐ نے اسے دو رکعتیں پڑھنے کا حکم نہیں فرمایا۔

۲ ـ پھر اسی روایت میں اس شخص کے آئندہ جمعہ آنے کا ذکر ہے، اس موقعہ پر بھی آپؐ نے یہ حکم نہیں فرمایا۔

۳ ـ ابوداؤد ج۱ ص۱۵۶ (باب الامام یکلم الرجل فی خطبتہ) میں مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ کے دوران فرمایا: "بیٹھ جاؤ" حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ابھی مسجد کے دروازے سے باہر

تھے کہ ارشادِ گرامی سُن کر وہیں بیٹھ گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر مبارک ان پر پڑی تو ان سے فرمایا: "ابن مسعودؓ! اندر آجاؤ"۔ مگر ان کو دو رکعتیں پڑھنے کا حکم نہیں فرمایا۔

۴۔ ابوداؤد صـ۱۵۹ اور نسائی جـ۱ میں اس شخص کا واقعہ مذکور ہے جو خطبہ کے دوران لوگوں کی گردنیں پھلانگتا ہوا آرہا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا: "اجلس فقد اذیت"۔ "بیٹھ جا! تو نے ایذا دی ہے"۔ اور اسے دو رکعتوں کا حکم نہیں فرمایا۔

ب: روایات اس پر متفق ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلیکؓ کے بیٹھ جانے کے بعد انہیں دو رکعتیں پڑھنے کا حکم فرمایا تھا۔ حالانکہ بیٹھ جانے کے بعد تحیۃ المسجد ساقط ہو جاتا ہے۔ اور جو شخص مسجد میں بیٹھا ہو اس کے لیے خطبہ کے دوران نوافل پڑھنا کسی کے نزدیک بھی جائز نہیں ہے۔ پس اگر یہ خصوصی و استثنائی حکم نہ ہوتا تو اس کے بیٹھ جانے کے بعد (اور وہ بھی خطبہ کے دوران) اسے نوافل پڑھنے کا حکم نہ دیا جاتا۔

ج: بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابھی ممبر پر تشریف فرما ہوئے تھے کہ سلیکؓ آکر بیٹھ گئے، گویا ان سے گفتگو خطبہ کے دوران نہیں، بلکہ خطبہ شروع ہونے سے پہلے ہوئی۔ چنانچہ صحیح مسلم جـ۱ صـ۲۸۷ میں ہے:

جاء سليك الغطفاني يوم الجمعة	سلیک غطفانیؓ جمعہ کے دن اس وقت
ورسول الله صلى الله عليه وسلم	آئے جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
قاعدٌ على المنبر فقعد سليك	ممبر پر بیٹھے تھے، پس سلیکؓ نماز پڑھنے
قبل ان يصلي ـ الخ۔	سے پہلے بیٹھ گئے

امام نسائیؒ نے سنن کبریٰ میں اس روایت پر یہ باب باندھا ہے: "باب الصلوٰۃ قبل الخطبۃ" (خطبہ سے پہلے نماز کا بیان) نصب الرایہ جـ۲ صـ۲۰۱)

نیز یہ بھی آتا ہے کہ سلیکؓ جب تک دوگانہ سے فارغ نہیں ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ شروع نہیں فرمایا۔ چنانچہ دارقطنی صـ۱۶۹ کی روایت میں ہے:

فقال النبي صلى الله عليه وسلم	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

ثم فاركع ركعتين. وامسك	اٹھو! دو رکعتیں پڑھو۔ اور آنحضرت
عن خطبته حتی فرغ	صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ سے رُکے رہے۔
من صلوته	یہاں تک کہ وہ اپنی نماز سے فارغ ہو لئے

امام دارقطنیؒ اس روایت کو مسند اور مرسل دونوں طرح روایت کر کے لکھتے ہیں کہ مرسل صحیح ہے۔ مرسل روایت جب صحیح ہو تو عام اہل علم کے نزدیک حجت ہے۔ اور اگر اس کے طرق متعدد ہوں یا اسکی مؤید کوئی اور روایت موجود ہو تو تمام اہل علم کے نزدیک حجت ہے۔ یہاں یہی آخری صورت ہے۔ چنانچہ امام دارقطنیؒ نے ایک اور روایت بھی (بطریق ابو معشر عن محمد بن قیس) اس کی مؤید نقل کی ہے۔ یہ روایت مصنف ابن ابی شیبہ میں بھی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم	نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب سلیکؓ
حیث امرہ ان یصلی رکعتین	کو دو رکعتیں پڑھنے کا حکم فرمایا تو خطبہ سے
امسک عن الخطبة حتی	رُک گئے۔ یہاں تک کہ جب وہ اپنی دو
فرغ من رکعتیه۔ ثم	رکعتوں سے فارغ ہوئے، تب آپ نے
عاد الی خطبته	خطبہ کی طرف رجوع فرمایا۔

(ابن ابی شیبہ ص۲۱ ، دارقطنی ص۱۶۹)

اس روایت کے راوی کو دارقطنیؒ نے ضعیف کہا۔ مگر یہ روایت اوپر کی مرسل صحیح کو مزید تائید فراہم کرتی ہے۔

نیز یہ بھی آتا ہے کہ حضرت سلیکؓ چونکہ بہت ہی خستہ اور قابل رحم حالت میں آئے تھے۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو انہیں صدقہ دینے کی ترغیب دلائی۔ چنانچہ حاضرین نے اپنے کپڑے اتار کر پیش کئے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں سے دو کپڑے ان کو مرحمت فرمائے۔

(نسائی ص۲۰۹ ج۱)

غالباً اس سے فارغ ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ شروع فرمایا ہوگا جس کا تذکرہ اوپر دارقطنی اور ابن ابی شیبہ کی روایت میں آیا ہے۔

پس یہ تمام امور جو اس واقعہ میں پیش آئے۔ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سلیک رضی اللہ عنہ کے دوگانہ ادا کرنے تک خطبہ روک دینا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو چندے کی ترغیب دینا۔ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا کپڑے اُتار اُتار کر پیش کرنا، یہ خطبہ کے عام معمول کے خلاف ہیں۔ اور انہیں خصوصیت ہی پر محمول کیا جا سکتا ہے۔

لیکن اگر اس کے باوجود کسی کو اصرار ہو کہ یہ سلیک رضی اللہ عنہ کی خصوصیت نہیں! بلکہ خطبہ کے دوران تحیۃ المسجد پڑھنا ہر شخص کے لئے عام سُنّت ہے تو ہمیں یہ کہنے کی اجازت دیجئے اگر خطبہ کے دوران دو رکعتیں پڑھنا حضرت سلیک رضی اللہ عنہ کی سُنّت ہے تو ایسے شخص کے لئے خطیب کا خطبہ کو روک دینا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت ہے ——— لہٰذا خطیب کا فرض ہے کہ تحیۃ المسجد پڑھنے والوں کی رعایت فرماتے ہوئے خطبہ روک کر سُنّت نبوی پر عمل کیا کریں، یہ تو نہیں ہونا چاہیئے کہ مقتدی تو سُنّت سلیک رضی اللہ عنہ پر عمل کریں۔ اور خطیب صاحب پر سُنّتِ نبویؐ کی پابندی لازم نہ ہو۔ اور ہاں! حضرت سلیک رضی اللہ عنہ کی سُنّت پر بھی جب ہی عمل ہوگا کہ پہلے مسجد میں آکر بیٹھ جایا کریں، پھر خطیب صاحب ان کو دوگانہ ادا کرنے کا حکم کریں۔ پھر ان کے دوگانہ ادا کرنے کے دوران خطبہ روکے رکھیں۔ پھر حاضرین سے ان کے لئے چندہ بھی کیا کریں تب دوبارہ خطبہ شروع ہوا کرے۔

اس تحقیق سے معلوم ہوا کہ حضرت سلیک رضی اللہ عنہ نے بھی دوگانہ عین خطبہ کے دوران ادا نہیں فرمایا تھا۔ کیونکہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی خاطر خطبہ روک دیا۔ تو یہ دورانِ خطبہ کی حالت نہ رہی۔ علاوہ ازیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی پر دوسرے کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بلانے پر عین نماز کی حالت میں لبیک کہنا واجب ہے۔ پس جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی مصلحت کی بنا پر حضرت سلیک رضی اللہ عنہ کو دو رکعتیں پڑھنے کا حکم فرمایا تو عین حالت خطبہ میں بھی انہیں تعمیلِ ارشاد لازم تھی۔ اور اس وقت ان سے استماع کی فرضیت ساقط تھی۔ لیکن دوسروں کے لئے جائز نہ ہوگا کہ فرض استماع کو چھوڑ کر نفل میں مشغول ہو جائیں۔

۵: خصوصیت کی ایک دلیل یہ ہے کہ صحیح ابن حبان کی روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلیک رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

ارکع رکعتین ولا تعودن لمثل ھذا (موارد الظمآن ص۱۵۸ نصب الرایہ ج۲ ص۱۴)
دو رکعتیں پڑھو۔ اور آئندہ ایسا ہرگز نہ کرنا۔

اور دارقطنی کی ایک روایت میں ہے:

ولا تعد لمثل ھذا۔ اور آئندہ ایسا نہ کرنا۔

جو حضرات خطبہ کے دوران تحیۃ المسجد کو جائز کہتے ہیں وہ اس ارشاد کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ اس میں آئندہ تاخیر سے آنے کی ممانعت فرمائی گئی تھی۔ کیونکہ آئندہ جمعہ وہ پھر دوگانہ پڑھے بغیر بیٹھ گئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دوسرے جمعہ بھی دوگانہ پڑھنے کا حکم فرمایا تھا

لیکن حضرات خلفائے راشدینؓ اور جمہور صحابہؓ نے اس کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ آئندہ دوگانہ پڑھنے کی ممانعت فرمائی گئی ہے۔ جس کا ایک قرینہ تو یہی کہ یہ ممانعت دوگانہ کے ساتھ مربوط ہے، لہٰذا اسی کی ممانعت اقرب الی الفہم ہے۔ دوسرا قرینہ یہ ہے کہ حضرت سلیکؓ نے آئندہ جمعہ جو دوگانہ نہیں پڑھا وہ اسی ارشاد کی تعمیل تھی ورنہ یہ قطعاً بعید ہے کہ وہ گذشتہ جمعہ کی تنبیہ کو بھول جاتے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ان سے دوبارہ دو رکعتیں پڑھوانا بھی کسی خصوصی مصلحت کی بنا پر ہوگا۔ ورنہ جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے آپؐ دیگر صحابہؓ سے نہیں پڑھواتے تھے۔

خلاصہ یہ کہ حضرات خلفائے راشدینؓ اور جمہور صحابہؓ و تابعینؒ نے جو سلیکؓ کی روایت کو تشریع عام نہیں سمجھا اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ متعدد قرائن اس کی خصوصیت کے موجود ہیں۔

۵۔ اور دوسری توجیہ ان اکابرؒ کی اس روایت کو معمول بہا نہ سمجھنے کی یہ ہو سکتی ہے کہ خطبہ کے دوران نماز و کلام کی ممانعت بعد میں ہوئی ہوگی۔ ہمارے سامنے تو قرآن کریم اور حدیث نبویؐ کا ذخیرہ یک وقت پورے کا پورا موجود ہے اس لئے ہمیں تو یہ معلوم کرنے کے لئے کہ کونسی آیت پہلے اتری اور کونسی بعد میں؟ کونسا ارشاد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے فرمایا تھا۔ اور کونسا بعد میں؟ نقل و روایت کی ضرورت ہے، لیکن حضرات خلفائے راشدین اور اکابر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے لئے آیات قرآن کے نزول اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی ترتیب مشاہدہ کی چیز تھی۔ وہ جانتے تھے کہ کونسی آیت کب اور کہاں نازل ہوئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

نے کونسا ارشاد کس موقعہ پر فرمایا تھا ؟ کونسا حکم پہلے تھا کونسا بعد میں ؟ الاتقان (النوع الثمانون) میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ کہ انہوں نے خطبہ میں ارشاد فرمایا تھا۔

سلونی۔ فواللہ لا تسألون من شیٔ الا اخبرتکم۔ وسلونی عن کتاب اللہ۔ فواللہ ما من اٰیۃ الا وانا اعلم ابلیل نزلت ام بنہار۔ ام فی سہل ام فی جبل۔ (ص ۱۸۷/۲ج)	مجھ سے پوچھ لو! پس اللہ کی قسم تم مجھ سے کوئی چیز نہیں پوچھو گے۔ مگر میں تم کو اس کے بارے میں خبر دوں گا۔ اور مجھ سے کتاب اللہ کے بارے میں سوال کرو۔ پس اللہ کی قسم! قرآن کریم کی کوئی آیت ایسی نہیں جس کے بارے میں میں یہ نہ جانتا ہوں کہ رات میں اتری یا دن میں، میدان میں اتری یا پہاڑ پر۔

اور حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ارشاد نقل کیا ہے:

واللہ الذی لا الٰہ غیرہ مانزلت من اٰیۃ من کتاب اللہ الا وانا اعلم فیمن نزلت واین نزلت۔ (ایضاً)	اس اللہ کی قسم! جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ کتاب اللہ کی کوئی ایت ایسی نہیں ہوتی جس کے بارے میں مجھے معلوم نہ ہو کہ وہ کس کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور کہاں نازل ہوئی۔

پس جب یہ اکابرؓ ایک روایت کے مقابلہ میں ان نصوص پر عمل فرماتے ہیں جن میں خطبہ کے دوران کلام و نماز کی ممانعت کی گئی ہے تو یہ روایت اگر خصوصیت پر محمول نہیں تو لامحالہ متروک العمل ہوگی۔

۶ ـــ جو حضرات حدیث سلیکؓ سے استدلال کرتے ہوئے خطبہ کے دوران تحیۃ المسجد پڑھنے پر زور دیتے ہیں انہیں اس پر غور کرنا چاہیئے کہ تحیۃ المسجد عام حالات میں بھی مستحب ہے۔ اور خطبہ کا سننا فرض ہے، کیا مستحب کی خاطر فرض کو ترک کرنا جائز ہے ؟ اور پھر اگر تحیۃ المسجد نہ پڑھنے کی صورت میں ایک حدیث پر عمل کرنے سے محرومی لازم آتی ہے تو فرض استماع و انصات کو چھوڑنے

سے قرآن کریم ۔ احادیث متواترہ اور خلفائے راشدینؓ کے متفق علیہ مسئلہ کی مخالفت لازم آتی ہے،
کیا ایک حدیث کی خاطر قرآن کریم، احادیث متواترہ اور خلفائے راشدینؓ کے حکم سے انحراف
جائز ہے؟

حضرت ابوسعید خدریؓ کا واقعہ: سوال میں ترمذی کے حوالے سے حضرت ابوسعید
خدری رضی اللہ عنہ کا واقعہ رنگ آمیزی کے ساتھ ذکر کرکے دوران خطبہ نماز کی ممانعت کو "مروانی
بدعت" کہا گیا ہے۔ یہ تو اوپر معلوم ہو چکا کہ یہ مروانی حکم نہیں بلکہ قرآنی حکم ہے۔ اور مروانی
بدعت نہیں۔ بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اور حضرات خلفائے راشدینؓ کی سُنّت ہے۔
جو بات قرآن کریم، سُنّتِ متواترہ اور خلفائے راشدینؓ کے تعامل سے ثابت ہو اُسے محض اس بنا
پر "مروانی بدعت" کہنا کہ مروان بھی اس کا قائل تھا، کیونکر صحیح ہوگا۔ شاید یہ حضرات کل خطبہ جمعہ کو
بھی "مروانی بدعت" فرمادیں۔

۔ا حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کا دوگانہ پڑھنے پر اصرار کرنا تو اس کی دلیل میں انہوں نے
بھی حضرت سلیکؓ کا واقعہ پیش کیا ہے اور اس سے دوگانہ کا جواز استنباط فرمایا ہے جب کہ
خلفائے راشدینؓ اور اکابر صحابہؓ اس کے خلاف کا فتویٰ دیتے ہیں۔ اب اہل فہم انصاف فرمائیں کہ
ہمیں کونسا مسلک اختیار کرنا چاہیئے۔

اور اس ناکارہ کے خیال میں تو حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کا اس موقعہ پر اصرار کسی
اور ہی بات کی غمازی کرتا ہے۔ شرح اس کی یہ ہے کہ اُمراء جور کے زمانے میں سلف میں یہ مسئلہ
زیر بحث آیا تھا کہ اگر امام خطبہ میں ذکر کو چھوڑ کر غیر متعلق قسم کی باتیں کرنے لگے تو کیا اسکا استماع
بھی لازم ہے؟ بعض اکابر کی رائے تھی کہ امام چونکہ ذکر سے خارج ہوگیا۔ اور استماع صرف
ذکر کا لازم ہے نہ کہ اس کی غیر متعلق باتوں کا۔ اس لئے اس وقت اس کے خطبہ کی حرمت باقی
نہیں رہتی۔ چنانچہ مصنف عبدالرزاق ص۲۲۶ ج۳ میں ہے کہ حجاج بن یوسف خطبہ دے رہا تھا۔ اور
امام شعبیؒ اور ابو بردہؓ باتیں کر رہے تھے۔ ان سے عرض کیا گیا کہ آپ خطبہ کے دوران باتیں کر رہے
تھے۔ تو فرمایا ہمیں ایسی باتوں کے لئے خاموشی کا حکم نہیں دیا گیا۔ اور مصنف ابن ابی شیبہ ص۱۲۶ ج۲

میں اسی نوعیت کا واقعہ حضرت ابراہیم نخعی اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہما کا نقل کیا گیا ہے۔ پس کیا بعید ہے کہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کو بھی ایسی صورت پیش آئی ہو اور انہوں نے اس وقت نماز شروع کر دی ہو۔ اس صورت میں ان کا حدیث سلیک کا حوالہ دینا بھی برمحل ہے کہ جیسے ان کے دوگانہ ادا کرتے وقت خطبہ منقطع ہوگیا تھا۔ اسی طرح میں نے بھی انقطاع خطبہ کی حالت میں دوگانہ ادا کیا۔ هذا، واللہ اعلم بالصواب۔

سوال پانزدہم: گاؤں میں جمعہ:

س ۱۵: ہمارے ہاں جمعہ کی شرائط میں شہر کا ہونا بھی ہے گاؤں دیہات میں جمعہ نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے مقابلے میں احادیث کے ذریعے مطلق حکم ثابت کیا جاتا ہے اور ہمیں جمعہ کی فرضیت کا منکر بتلایا جاتا ہے اس ضمن میں جو احادیث پیش کی جاتی ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

ابوداؤد کے حوالے سے یہ الفاظ نقل کئے جاتے ہیں" الجمعة حق واجب على كل مسلم في جماعة

دارقطنی کی حدیث میں ہے:" من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فعليه الجمعة يوم الجمعة

آیت قرآنی سے بھی عموم ثابت کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ پہلا جمعہ جو حضرت اسعد بن زرارہؓ نے پڑھایا وہ نقیع نامی ایک گاؤں ہی میں پڑھایا تھا جو مدینہ شریف کے پاس ہے۔ اور اس وقت مسلمانوں کی تعداد اس گاؤں میں صرف چالیس بیان کی جاتی ہے حوالہ کے لئے ابن ماجہ کو پیش کیا جاتا ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خود مدینہ شریف اس زمانے میں ایک گاؤں ہی تھا۔ اس صورت میں گاؤں کے جمعہ کے احکامات کیا ہوں گے۔ اور ان کی احادیث کے ساتھ کیا تطبیق ہوگی؟

ج ۱۵: اس سلسلہ میں چند امور پیش نظر رکھنا ضروری ہے:

۱ — جمعہ کی نماز سب کے نزدیک فرض عین ہے۔ علامہ شوکانیؒ نے نیل الاوطار (ص۲۲۲ ج۳) میں ائمہ اربعہ کے مذاہب کا اتفاق نقل کیا ہے۔ اور شیخ ابن ہمامؒ فتح القدیر میں لکھتے ہیں:

واعلم اولاً ان الجمعة فريضة	سب سے پہلے یہ بات لینا ضروری ہے،
محكمة بالكتاب والسنة والاجماع،	کہ جمعہ، کتاب و سنت اور اجماع امت
يكفر جاحدها۔	کی رو سے محکم فریضہ ہے۔ اور اس کی

فرضیت کا منکر کافر ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جمعہ کی فرضیت کا انکار کفر ہے۔ اگر کچھ لوگ حنفیہ کو "فرضیت جمعہ کا منکر" کہتے ہیں، جیسا کہ سوال میں ذکر کیا گیا ہے۔ تو اس کے سوا کیا عرض کیا جائے کہ وہ اپنی کم علمی کی وجہ سے ایک گناہ کبیرہ کے مرتکب ہیں۔ کیونکہ کسی مسلمان کو "کفر" کی طرف منسوب کرنا وبال عظیم ہے۔ جیسا کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے۔ کہ کفر کہنے والے کی طرف لوٹتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس وبال سے محفوظ فرمائیں۔

۲۔ ائمہ کا جہاں اس پر اتفاق ہے کہ جمعہ فرض عین ہے وہاں اس پر بھی اتفاق ہے کہ جمعہ کی نماز عام نمازوں کی طرح نہیں بلکہ اس کی ایک خاص شان ہے اور اس کے لئے خاص شرائط ہیں ایک شرط جماعت ہے۔ اور دوسری شرط ایک خاص نوعیت کی آبادی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آبادی سے دور جنگل میں جمعہ کسی کے نزدیک بھی جائز نہیں۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی "حجۃ اللہ البالغہ" (۲ — ۳۰) میں لکھتے ہیں:

وقد تلقت الامة تلقيا معنويا من غير تلق لفظ انه يشترط في الجمعة الجماعة ونوع من التمدن.	امت نے تواتر معنوی سے جو چیز پائی ہے (اگرچہ لفظی تواتر نہ ہو) کہ جمعہ کے لئے جماعت اور ایک خاص نوعیت کی شہریت کا ہونا شرط ہے۔
وكان النبي صلى الله عليه وسلم وخلفاؤه رضي الله عنهم والائمة المجتهدون رحمهم الله تعالى يجمعون في البلدان ولا يؤاخذون اهل البدو بل ولا يقام في عهدهم في البدو فهموا من ذلك قرنا بعد قرن وعصرا بعد عصر انه يشترط لها	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کے خلفاء رضی اللہ عنہم اور ائمہ مجتہدین رحمہم اللہ تعالیٰ شہروں میں جمعہ قائم فرماتے تھے۔ بادیہ نشینوں کو اس کا مکلف نہیں کرتے تھے۔ بلکہ ان کے دور میں دیہات میں جمعہ ادا نہیں کیا جاتا تھا۔ پس امت نے اس سے قرناً بعد قرنٍ اور نسلاً بعد نسل یہی سمجھا کہ جمعہ کے لئے جماعت اور

الجماعة والتمدّن ۔ شہریت شرط ہے ۔

یہ خاص نوعیت کی شہریت" جو صحت جمعہ کے لئے شرط ہے ۔ اس کی تشریح میں اختلاف و اجتہاد کی گنجائش ہے ۔ لیکن شاہ صاحبؒ کے بقول یہ اصول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم سے ثابت اور ائمہ مجتہدینؒ کے درمیان متفق علیہ ہے کہ جمعہ ہر جگہ نہیں ہوتا ۔ اور نہ ہر جگہ کے لوگوں کے ذمہ فرض ہے ۔

۳ ۔ یہاں دو مسئلے الگ الگ ہیں ۔ ایک یہ کہ وجوب جمعہ کے کیا شرائط ہیں ؟ یعنی جمعہ کس شخص پر فرض ہے اور کس پر فرض نہیں ؟ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ جمعہ کے صحیح ہونے کے کیا شرائط ہیں ؟

ان دونوں مسئلوں میں فرق یہ ہے کہ جس شخص پر جمعہ فرض نہیں (مثلاً بیمار، مسافر، غلام، عورت) اگر وہ جمعہ ادا کر لے تو اس کا جمعہ صحیح ہوگا ، اور فرض وقت اس سے ساقط ہو جائے گا ، لیکن اگر جمعہ کے صحیح ہونے کی شرط نہ پائی جائے تو جمعہ ادا ہی نہیں ہوگا ۔ اور جس شخص نے جمعہ کے صحیح ہونے کی شرط کو ملحوظ نہ رکھا ہو اس کے ذمہ ظہر کی نماز فرض رہے گی ۔ گویا وہ بزعم خود جمعہ پڑھنے کے باوجود فرض وقت کا تارک ہوگا ۔ حجۃ اللہ کی عبارت سے معلوم ہوا کہ باجماع امت خاص نوعیت کی شہریت" وجوب جمعہ کے لئے بھی شرط ہے ۔ اور صحت جمعہ کے لئے بھی ۔ پس اہل بادیہ پر بالاتفاق جمعہ فرض بھی نہیں ۔ اور بادیہ میں جمعہ پڑھنا بالاتفاق صحیح بھی نہیں ، حضرت شاہ صاحب مسوّٰی شرح مؤطا میں لکھتے ہیں :

اتفقوا علی ان لا جمعۃ فی العوالی ۔ وانہ یشترط لھا الجماعۃ (ص ۱۵۵ ج ۱)

اس پر سب کا اتفاق ہے کہ عوالی میں جمعہ جائز نہیں ۔ اور یہ کہ اس کے لئے جماعت شرط ہے ۔

۴ ۔ حنفیہ کے نزدیک جمعہ یا تو شہر میں ہوتا ہے یا قریۂ کبیرہ میں ، جس کی حیثیت قصبہ کی ہو ، اور شہر اور قصبہ کے گرد و پیش کی وہ زمین جو اس کی ضروریات کے لئے ہو ، اُسے "فنائے مصر" کہا جاتا ہے ۔ چونکہ وہ بھی شہر اور قصبہ کے ساتھ ملحق ہے ۔ اس لئے اس میں بھی جمعہ جائز ہے ۔ شہروں اور قصبوں کے علاوہ چھوٹے دیہات میں جمعہ جائز نہیں ۔

حنفیہ کا یہ مسلک بھی (دیگر مسائل کی طرح) قرآن و سنت سے ثابت اور حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی سنت کے عین مطابق ہے۔

قرآن کریم: سورۂ جمعہ میں حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے:

یاایہا الذین آمنوا اذا	اے ایمان والو جب جمعہ کے روز نماز (جمعہ)
نودی للصلوٰۃ من یوم الجمعۃ	کے لئے اذان کہی جایا کرے تم اللہ کی
فاسعوا الی ذکر	یاد (یعنی نماز خطبہ) کی طرف فوراً چل
اللہ وذروا البیع	پڑا کرو اور خرید و فروخت (اور اسی طرح
ذالکم خیر لکم	دوسرے مشاغل جو چلنے سے مانع ہوں)
ان کنتم تعلمون۔	چھوڑ دیا کرو یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر
	ہے اگر تم کو کچھ سمجھ ہو (ترجمہ حضرت تھانویؒ)

جمعہ کی اذان سن کر تمام کاروبار چھوڑ دینا واجب ہے۔ مگر آیت کریمہ میں خرید و فروخت چھوڑنے کا حکم فرمایا ہے، اس میں اشارہ ہے کہ جمعہ ہر جگہ نہیں ہوتا۔ بلکہ وہاں ہوتا ہے جہاں کے لوگ عموماً تجارت و سوداگری اور خرید و فروخت میں مشغول رہتے ہیں۔ اور جہاں چھوٹی بڑی روزمرہ کی ضروریات خرید و فروخت کے لئے مہیا رہتی ہیں۔ شہروں اور دیہاتوں میں یہی فرق ہے کہ شہروں میں تجارت ہوتی ہے دیہات میں نہیں۔ پس جمعہ وہاں ہوگا جہاں تجارتی مراکز ہوں۔ اور وہ شہر ہیں نہ کہ دیہات ــــــ

سنت نبویؐ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مطہرہ سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ دور نبویؐ میں جمعہ صرف شہروں میں ہوتا تھا۔ دیہاتی آبادیوں میں نہیں۔ چنانچہ:

۱۔ جمعہ مکہ مکرمہ میں ہجرت سے قبل فرض ہو چکا تھا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے مدینہ طیبہ میں شروع بھی ہو چکا تھا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں جمعہ نہیں ادا فرما سکے جیسا کہ علامہ شوکانیؒ نے نیل الاوطار (ص ۱۳۱ ج ۳) میں ــــ حافظ ابن قیمؒ نے زاد المعاد (ص ۹۹ ج ۱) میں اور حافظ سیوطیؒ نے "الاتقان" (۱ ــ ۲۶ النوع الثانی عشر) میں اس کی تصریح کی ہے۔ مکہ مکرمہ سے ہجرت کرکے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قبا میں پیر کے دن (۱۲ ربیع الاوّل کو) تشریف لائے اور دس روز سے

زیادہ قیام فرمایا (فلبث بضع عشرۃ لیلۃ - صحیح بخاری ج ا صفحہ) صحیح بخاری کی ایک روایت میں چودہ دن
قیام کی تصریح ہے۔ (ج ا ص ۵۶۱) اور ایک نسخہ میں چوبیس دن کا ذکر ہے (ج ا ص ۶۱) اگر چودہ دن ہی لئے
جائیں تب بھی ظاہر ہے کہ کم از کم دو جمعے ضرور آئے ہوں گے۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں
جمعہ قائم نہیں فرمایا۔ نہ اہل قبا کو جمعہ پڑھنے کا حکم فرمایا۔ بلکہ مدینہ طیبہ پہنچ کر جمعہ کا آغاز فرمایا۔ اس سے
واضح ہے کہ چھوٹی بستی میں جمعہ نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ دو سالہ دور نبوی میں قبا میں جمعہ نہیں ہوا۔

۲۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حج اکبر بالاجماع جمعہ کو ہوا تھا۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
نے میدانِ عرفات میں جمعہ نہیں پڑھا۔ اور نہ اہل مکہ کو وہاں جمعہ پڑھنے کا حکم فرمایا۔ اس سے واضح
ہے کہ ہر جگہ جمعہ صحیح نہیں بلکہ اس کے لئے خاص قسم کی آبادی شرط ہے۔

۳۔ صحیح بخاری ج ا ص ۱۲۳ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

کان الناس ینتابون الجمعۃ من منازلھم والعوالی۔	لوگ اپنی اپنی جگہوں سے اور عوالی سے جمعہ کے لئے باری باری آتے تھے۔

اہل قبا کے جمعہ کے لئے باری باری مدینہ طیبہ آنے سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ اہل قبا
پر جمعہ فرض نہیں تھا۔ ورنہ وہ باری باری نہ آیا کرتے۔ بلکہ سب کے سب آتے۔ چنانچہ حافظ ابن حجرؒ
فتح الباری میں اس حدیث کے تحت لکھتے ہیں:

قرطبی نے کہا کہ اس حدیث میں رد ہے کوفیوں پر کہ وہ شہر سے باہر کے لوگوں پر جمعہ
فرض قرار نہیں دیتے ـــــــ لیکن قرطبی کی یہ بات محل نظر ہے کیونکہ اگر جمعہ اہل عوالی
پر فرض ہوتا تو وہ باری باری نہ آیا کرتے بلکہ سب کے سب آیا کرتے" (فتح الباری ج ۲ ص ۳۰)

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ عوالی میں جمعہ نہیں ہوتا ورنہ باقی حضرات وہاں جمعہ پڑھا کرتے۔

۴۔ صحیح بخاری ج ا ص ۱۲۲ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ مسجد نبوی کے بعد سب
سے پہلا خطبہ جو اثا میں عبدالقیس کی مسجد میں ہوا بحرین کے علاقہ میں۔

وفد عبدالقیس کی آمد ۶ھ یا ۸ھ میں ہوئی تھی۔ اس وقت اسلام مدینہ طیبہ سے دور
دراز علاقوں میں پھیل چکا تھا۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کہیں جمعہ قائم کرنے کا حکم نہیں فرمایا۔

اور جواثا قدیم سے تجارتی مرکز اور قلعہ تھا۔ جیسا کہ جاہلیت کے اشعار اور اہل بصیرت کی تصریحات سے ثابت ہے۔ اس لئے ابوداؤد کی روایت میں اس کو قریہ کہنا ایسا ہی ہے جیسا کہ قرآن کریم میں مکہ مکرمہ کو قریہ کہا گیا ہے۔

۵ _ نسائی ص۲۲۵ ج۱، ابوداؤد ص۱۵۳ ج۱، دارمی ص۳ ج۱ (طبع جدید) میں زید بن ارقمؓ سے، ابوداؤد ص۱۵۳ ج۱ وغیرہ میں ابوہریرہؓ سے ابن ماجہ ص۹۳ اور مجمع الزوائد ص۱۹۵ ج۲ میں ابن عمر سے اور مشکل الآثار طحاوی ص۵۶ ج۲ میں ذکوان سے (رضی اللہ عنہم) روایت ہے۔ سب کا مشترک مضمون یہ ہے کہ ایک بار جمعہ کو عید ہوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز عید کے بعد فرمایا کہ "ہم تو جمعہ پڑھیں گے۔ جو چاہے ہمارے ساتھ جمعہ پڑھے اور جو چاہے واپس اپنے گھر لوٹ جائے۔" مراد اس سے اہل عوالی کو اجازت دینا تھا۔ کیونکہ جمعہ ان پر فرض نہیں تھا۔ جیسا کہ امام طحاویؒ نے مشکل الآثار ص۵۸ ج۲ میں فرمایا ہے۔ اور مصنف عبدالرزاق ص۳ ج۳ میں مرسل ابن جریج سے اس کی تصریح آئی ہے:

فاذن للانصار فی الرجوع الی العوالی	پس آپ نے انصار کو عوالی لوٹ جانے
وترک الجمعۃ۔ فلم یزل الامر علی	اور جمعہ چھوڑ دینے کی اجازت مرحمت
ذالک بعد۔	فرمائی اور پھر ہمیشہ اسی پر تعامل رہا۔

ان تمام احادیث سے ثابت ہے کہ دورِ نبویؐ میں جمعہ صرف شہروں میں ہوتا تھا۔ دیہات میں کبھی جمعہ نہیں ہوا۔

سلف صالحین کا تعامل: ۱ _ صحیح بخاری ص۸۳۵ ج۲ موطا امام مالک ص۶۳ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے خطبہ عیدین میں فرمایا۔ "آج تمہارے دو عیدیں جمع ہوگئی ہیں سو اہل عوالی میں سے جو شخص جمعہ پڑھنا چاہتا ہے وہ جمعہ کا انتظار کرے۔ اور جو واپس جانا چاہتا ہے اس کو واپسی کی اجازت ہے"۔ امام محمد موطا ص۱۱۹ میں فرماتے ہیں: "حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اہل عوالی کو اس لئے اجازت دی کہ وہ شہر کے لوگ نہیں تھے"۔ اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے مُصفّٰی شرح فارسی موطا میں اس حدیث پر یہ باب باندھا ہے: "عوالی میں جمعہ جائز نہیں۔ اور اہل عوالی میں سے جو لوگ شہر میں آئیں انکو وقت جمعہ سے پہلے واپس جانے کی اجازت ہے"۔ اس حدیث کے ذیل میں لکھتے ہیں: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ارشاد

کا مأخذ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دائمی عمل ہے کہ آپ نے بادیہ نشینوں کو کبھی اقامت جمعہ کا مکلف نہیں بنایا۔" ص ۱۵۲ ج ۱ ، ص ۱۵۵)

۲ ــ مصنف عبدالرزاق ص ۱۶۸ ج ۳ اور مصنف ابن ابی شیبہ ص ۱۰۱ ج ۲ (واللفظ لہ) میں بسند صحیح حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد نقل کیا ہے:

لا جمعۃ ولا تشریق ولا صلوٰۃ فطر ولا اضحیٰ الا فی مصر جامع او مدینۃ عظیمۃ۔	جمعہ، تشریق، عید الفطر، عید الاضحیٰ شہر یا بڑے قصبہ کے بغیر نہیں ہو سکتی۔

۳ ــ مصنف عبدالرزاق ص ۱۶۸ ج ۳ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ وہ بصرہ، کوفہ، مدینہ، بحرین، شام، الجزیرہ جیسے شہروں کو شہر شمار کرتے تھے۔

۴ ـ مصنف ابن ابی شیبہ ص ۱۰۱ ج ۲ میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا ارشاد نقل کیا ہے:

لیس علی اہل القریٰ جمعۃ انما الجمع علی اہل الامصار مثل المدائن۔	بستی والوں پر جمعہ نہیں، جمعہ شہر والوں پر ہے۔ جیسے شہر مدائن۔

۵ ــ صحیح بخاری ص ۱۲۳ ج ۱ میں ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ بصرہ سے چھ میل زاویہ میں قیام پذیر تھے کبھی جمعہ کے لئے بصرہ تشریف لاتے کبھی نہیں۔

۶ ــ صحیح بخاری ص ۱۲۳ ج ۱ میں حضرت عطا کا قول نقل کیا ہے کہ جمعہ "قریۂ جامعہ" میں ہوتا ہے۔ اور مصنف عبدالرزاق ص ۱۶۸ ج ۳ میں ہے کہ قریۂ جامعہ وہ ہے جس میں امیر ہو، قاضی ہو، جیسے جدہ اور طائف۔

علاوہ ازیں اکابر صحابہؓ و تابعینؒ کے متعدد آثار مصنف ابن ابی شیبہ ص ۱۰۱ ج ۲ اور مصنف عبدالرزاق ص ۱۶۹ ج ۳ وما بعد میں دیکھے جا سکتے ہیں ـــــ مندرجہ ذیل تفصیل سے معلوم ہوا کہ فرضیت جمعہ سے بچے اور بہت سے لوگ مستثنیٰ ہیں، اسی طرح اہل دیہات بھی اس کے مکلف نہیں۔ حضرت اسعد بن زرارہؓ اور ان کے رفقاء نے جہاں جمعہ پڑھا تھا وہ دیہات نہیں تھا بلکہ مدینہ طیبہ سے ملحق جگہ تھی اور شہر میں جمعہ جائز ہے۔ مسلمانوں کی تعداد خواہ کتنی ہو مگر جمعہ تو شہر میں ہوا اور اس زمانہ میں مدینہ طیبہ میں بازار لگا ہوتا تو صحیح بخاری ص ۱۲۹ ج ۱ میں ہے۔ جمعہ بجائے گاؤں کے کہنا صحیح بخاری کی مخالفت ہے۔

والحمد للہ اولاً و آخراً سبحانک اللّٰھم وبحمدک استغفرک واتوب الیک۔

تغیّر کی دنیا میں
رُوح افزا کو دوام حاصل ہے

رُوح افزا جیسے سچے مشرُوب کی تخلیق میں طویل تجربہ،
فنی مہارت اور طبی علم و دانش کا بڑا ہاتھ ہے۔ اس کی کوالٹی بھی
اسی مہارت سے قائم و دائم رکھی جاتی ہے۔

بے شک ذائقہ، تاثیر اور رنگ میں کوئی مشروب
رُوح افزا کا ثانی نہیں۔

اخلاق عملاً مذہب ہے اور مذہب اصولاً اخلاق

Adarts HRA-2/81

داخلہ

تربیّت گاہ مدرسین تعلیم القرآن

اس تربیت گاہ میں ایسے اساتذہ تیار کئے جاتے ہیں جو مکاتب اور اسکولوں میں قرآن پاک کی تعلیم اجتماعی طور پر پڑھا سکیں، آئندہ سال کے لئے طلبا کو داخلے کی دعوت دی جاتی ہے۔ داخلے کی شرائط حسب ذیل ہیں۔

(۱) امیدوار حافظ قرآن اور کم از کم مڈل پاس ہوں یا درس نظامی کے درجہ وسطانی تک کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

(۲) جملہ طلبا اقامتی ہوں گے، انہیں رہائش، کھانے کی سہولت کے علاوہ سو روپے ماہانہ وظیفہ دیا جائے گا۔

(۳) کورس کی مدّت ایک سال ہوگی۔

(۴) کورس کے اختتام پر کامیاب طلبا کو جمعیت کے کسی مکتب یا اسکول میں پڑھانا ضروری ہوگا۔ اور انہیں پانچ سو روپے ماہوار تنخواہ دیجائیگی۔

درخواستیں بھیجنے کی آخری تاریخ ۱۵ شعبان ۱۴۰۲ھ ہے۔

<u>نصاب حسب ذیل ہے</u>

(۱) تجوید۔ مشق۔ دو پارہ حفظ۔ ترجمہ کلام مجید۔ چالیس احادیث حفظ۔ سیرت نبویؐ و سیرت صحابہ کرامؓ۔ عقائد و مسائل۔ بچوں کی نفسیات۔ عربی زبان۔ انگریزی زبان۔ مشق تدریس۔ بورڈ پر پڑھانے کی عملی تعلیم۔ معلومات عامہ۔ خطابت۔

مقام تعلیم۔ عالمگیر مسجد۔ عالمگیر روڈ۔ بہادر آباد۔ کراچی۔

درخواست بھیجنے کا پتہ:

دفتر جمعیت تعلیم القرآن۔ عالمگیر مسجد۔ عالمگیر روڈ بہادر آباد۔ کراچی ۵